Lutfi al Sayyid and His Contribution to modern Arabic Literature : A Critical Study

THESIS

SUBMITTED TO THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

ARABIC

BY

ANJUM ARA (FALAHI)

Under the Supervision of

DR. FAIZAN AHMAD

DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2000-2001

تلخیص

جدید عربی ادب میں

لطفی السید کی خدمات

﴿ایک تنقیدی مطالعہ﴾

مقالہ

برائے

پی ایچ ڈی

ترتیب

انجم آرا (فلاحی)

اشراف

ڈاکٹر فیضان احمد

شعبہ عربی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۰۱ - ۲۰۰۰

بسم الله الرحمن الرحيم

عالم اسلام عالم عرب اور مصر کی جدید فکری تعمیر وتشکیل میں استاذ محمد عبدہ (۱۸۴۹-۱۹۰۵) اوران کے شاگرد شیخ رشید رضا (۱۸۶۵-۱۹۳۵ء) کا کردار اس اعتبار سے بہت بلند ہے کہ انہوں نے مغربی استعمار کی ذہنی وفکری غلامی سے نکالنے کے لئے اور عربوں اور مسلمانوں کو اسلام کی صراط مستقیم پر گامزن کرنے کے لئے اس انداز سے بھرپور جدوجہد کی کہ جدید عقلی اور سائنسی ذہن اسلام کی حقانیت اور صداقت پر مطمئن ہو سکے اور اغیار کی علمی وفکری فتنہ سامانیوں سے محفوظ رہ سکے، اسلام کی جدید تعبیر وتشریح کا یہ ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس نے تہذیب مغرب کی چکاچوند سے مسحور نوجوانوں کو اسلامی غیرت وحمیت سے سرشار کر کے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے پر آمادہ اور کمربستہ کیا۔

جدید مصر میں فرانسیسی و برطانوی سامراجوں کے خلاف قومی تحریک آزادی برپا کرنے والوں میں استاذ مصطفیٰ کامل (۱۸۷۴-۱۹۰۸ء) کے اخبار اللواء کی خدمات ناقابل فراموش ہیں آپ کی شعلہ بار تحریروں نے استعمار کے خلاف نفرت و حقارت کی لہر دوڑائی اور نوجوانوں کے اندر تحریک آزادی کی راہ میں سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ پیدا کیا، مصطفیٰ کامل کے قلم نے صور اسرافیل کا کام کیا، ان کے قلم میں جذبہ کی تپش، غلامی کے خلاف نفرت اور آزادی کے لئے بے پناہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ ان کا اسلوب خطابی تھا۔ وہ جذبات کی رو میں بہا کر نوجوانوں کو میدان جنگ میں کود جانے پر آمادہ کر دیتے تھے۔

استاذ احمد لطفی السید (۱۸۷۲-۱۹۶۳ء) بھی قومی تحریک آزادی کی صف اول کے رہنماؤں میں سے ہیں، پوری زندگی استعمار کے خلاف جدوجہد میں گزری، نوجوانوں کو تحریک آزادی کے لئے تیار کیا مگر یہ تیاری جذبات کے ساتھ تعقل وتفکر اور تفلسف سے ہم رشتہ تھی اسی لئے ان کی تحریروں میں جذبہ کی گرمی بھی ہے، اور فکر وفلسفہ کی تدریجی کارفرمائی بھی، وہ رومانوی اسلوب نگارش سے کام لینے کے بجائے انسان کی عقل وفکر اور اس کے ذہن کے در پر دستک دیتے ہیں اور دلائل سے اسے مطمئن کر کے قومی جدوجہد کی شاہراہ پر گامزن کرتے ہیں، ان کے یہاں جذبات کا بہاؤ بھی ہے مگر خال خال، زیادہ تر فکری و عقلی قوتوں کو آواز دیتے ہیں، اسی طرح انقلاب اور تبدیلی کے لئے ہنگامہ آرائی، شوریدہ سری، اشتعال اور جذباتیت کی جگہ تدریج، مرحلہ وار پیش قدمی، فکری وذہنی تیاری اور دھیرے دھیرے مخالف کی حصار بندی کے قائل ہیں۔

استاد احمد لطفی السید قومی تحریک آزادی کے رہنماؤں میں اس اعتبار سے بھی ممتاز ہیں کہ انہوں نے نئی نسل کی زبردست فکری تربیت کی ہے اسی لئے بجا طور پر انہیں ''مربی الجیل'' کا خطاب دیا گیا، دنیا میں چلنے والی آزادی کی تحریکات اور اس کے رہنماؤں کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح نمایاں ہوگی کہ وہی تحریک زیادہ مؤثر، کارگر اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی جس نے استدلال اور تدریج کو اپنا شعار بنایا اور اشتعال اور جذباتیت سے کام لینے کے بجائے پختہ فکری سرمایہ اور تدریجی طریقۂ کار کو اپنی ترجیح میں شامل کیا، استاد احمد لطفی السید نے ۱۹۰۷ء میں ایک سیاسی جماعت حزب الامۃ کی تشکیل کی

جس کے پیش نظر مکمل آزادی کا حصول اور ایک دستوری حکومت کی تشکیل تھی۔ اس سیاسی جماعت میں ملک کے نامور سیاست داں اور دانشور شامل تھے، اس سے پہلے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ الحزب الوطنی قائم کر چکے تھے جس کی تشکیل و تنظیم میں مصطفیٰ کامل بھی شامل تھے مگر یہ جماعت زیادہ دنوں تک کام نہ کر سکی تھی، بعد میں حزب الامۃ کی جب تنظیم عمل میں آئی تو اس کے نصب العین میں تدریج اور کامل آزادی کے حصول کی جدوجہد کے الفاظ شامل کئے گئے اور بحیثیت مجموعی اعتدال، عقلیت اور دانشوری کو غالب طریقۂ کار کی حیثیت سے اختیار کیا گیا اور اسی لئے ملک کے تمام طبقے سیاسی جماعت سے بھرپور دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔

۱۹۱۶ء میں مجمع اللغۃ العربیۃ کا قیام اور احمد لطفی السید کی مدیر کی حیثیت سے تقرری، مصر میں عربی زبان وادب کے ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، آگے چل کر اس طرح کے خالص علمی ادارے اور تحقیقی مراکز عالم عرب میں قائم ہوئے اور تحقیق وتصنیف کی دنیا میں بے بہا کارنامے انجام دئے گئے، ان کی داغ بیل ایک طرح سے استاد احمد لطفی السید نے بہت پہلے ڈال دی تھی، اہل علم وادب میں جن نمایاں شخصیات سے آپ کے گہرے روابط تھے ان میں حسن عاصم، مصطفیٰ کامل، قاسم آمین (۱۸۶۳-۱۹۰۳ء) فتحی زغلول (۱۸۶۳-۱۹۱۴ء) اور عبدالعزیز فہمی (۱۸۷۰-۱۹۵۱ء) وہ اساطین ادب ہیں جن کے بارے میں آپ نے بڑے اچھے تأثرات کا اظہار کیا ہے اور جن سے قربت ومحبت اور جن کی خدمات اور ادبی وسیاسی مقام ومرتبہ کو کھل کر سراہا ہے، اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جدید مصر کی تعمیر وتشکیل میں نمایاں کردار ادا کرنے والے ادیبوں، سیاست دانوں اور صحافیوں کی کہکشاں میں احمد لطفی السید کو کیا مقام حاصل تھا۔

احمد لطفی السید نے اپنے قومی، سماجی وسیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے ۱۹۰۷ء میں مشہور اخبار الجریدہ شائع کیا، ۳۰ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو اس کا آخری شمارہ شائع ہوا، اس عرصہ میں اعتدال تدریج اور میانہ روی کے ساتھ تمام سیاسی وسماجی مسائل میں الجریدہ نے بھرپور رہنمائی کی، اس اخبار نے مصری مفادات کے تحفظ کے لئے اور تمام سیاسی مسائل کے مادی اور اخلاقی پہلوؤں کو واضح کرنے کے لئے راست بازی اور صداقت کو اپنا شعار بنایا، اس نے حکومت وقت کی محض مخالفت یا اس کے خلاف محاذ آرائی کا طریقہ اختیار نہیں کیا، نہ حکومت کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا محاسبہ کرنے کو اپنا فریضہ سمجھا، بلکہ اس نے حق کی حمایت اور مسائل وترجیحات پر تنقید وتبصرہ کرتے وقت قومی مفاد کو ہر حال میں مقدم رکھا اور حکومت وقت کی کاسہ لیسی اور جاوبے جا حمایت کے سلسلہ میں نہایت محتاط رویہ اختیار کیا، الجریدہ کو ملک کے ہر مکتبہ فکر کے ادیبوں اور قلم کاروں کا تعاون حاصل تھا، اس نے طہٰ حسین (۱۸۸۹-۱۹۷۳ء)، مصطفیٰ عبدالرازق (۱۸۸۵-۱۹۴۶ء)، محمد حسین ہیکل (۱۸۸۸-۱۹۵۶ء)، توفیق دیاب اور عباس محمود العقاد (۱۸۸۹-۱۹۶۴ء) کی تخلیقات نمایاں طور پر شائع ہوتی تھیں۔ اسی طرح عبدالحمید الزہراوی

(۱۸۵۵-۱۹۱۶ء)، سید رشید رضا، عبدالقادر حمزہ (۱۸۸۰-۱۹۴۱ء)، محمد السباعی (۱۸۸۱-۱۹۳۱ء)، عبدالحمید حمدی (متوفی ۱۹۵۰ء)، ابراہیم رمزی (۱۸۶۷-۱۹۲۴ء)، احمد زکی (۱۸۶۷-۱۹۳۴ء)، عبدالرحمٰن شکری اور عبدالسلام ذہنی (۱۸۸۵-۱۹۵۵ء) کے علمی وادبی مقالات سے بھی یہ اخبار مزین ہوتا تھا۔ صنف شاعری میں حافظ ابراہیم (۱۸۷۱-۱۹۳۲ء)، مصطفیٰ صادق الرافعی (۱۸۸۱-۱۹۳۷ء)، مراد فرج، اسماعیل صبری (۱۸۵۴-۱۹۲۳ء)، عبدالحلیم مصری (۱۸۸۷-۱۹۲۲ء)، نقولا الحداد (۱۸۷۲-۱۹۵۴ء)، رشید مصوبع (متوفی مابعد ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) اور نقولا رزق اللہ (۱۸۷۰-۱۹۱۵ء) کی ادبی کاوشیں مسلسل اس اخبار کے ذریعہ منظر عام پر آتی رہیں۔

اس اخبار کا خاص وصف قومی اور وطنی تحریک کی تائید میں مقالہ نگاری تھا، مگر ملکی وقومی مسائل کے جان داد تجزیئے بھی ہر شمارہ میں شامل ہوتے تھے۔ تعلیم وتربیت، اجتماعی ومعاشرتی مسائل، حکام ومحکوم کی اخلاقیات اور ان کے روابط، انفرادی و اجتماعی اخلاقیات، مصری خواتین کے حقوق اور ان کی شناخت، مصری سیاست کے تمام اہم اور نازک موضوعات، پارلیمانی حکومت، طریقۂ انتخاب، مجلس شوریٰ کی تجدید، وفاقی سیاست، وزارت کی ذمہ داری اور جواب دہی جیسے تمام مسائل میں الجریدہ نے اپنے اداریوں اور مقالات ومضامین کے ذریعہ تدریجی انقلاب لانے پر مصری قوم کو ابھارا۔ احمد لطفی السید ان تمام تحریروں کے ذریعہ مصریوں کے اندر وہ قومی انفرادی واجتماعی اوصاف پیدا کرنا چاہتے تھے جن سے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے وہ دنیا میں سر اٹھا کر جی سکے اور آزادی حاصل کرنے کے ساتھ سیاست ومعیشت اور تہذیب وتمدن کے تمام میدانوں میں وہ اپنی آزادی وخود مختاری کو برقرار رکھ سکے۔

احمد لطفی السید ایک باعمل سیاست داں، قومی تحریک آزادی کے نمایاں رہنما، ایک ممتاز مصنف صحافی اور انشاء پرداز ہونے کی ساتھ ساتھ ایک بڑے مفکر اور فلسفی بھی تھے۔ انہوں نے فکری مسائل میں قوم کی بھرپور رہنمائی کی ہے اور اس وقت کے سلگتے ہوئے نہایت پیچیدہ مسائل میں بڑی منفرد تحریریں اور ممتاز رائیں پیش کی ہیں جن میں ایک نہایت اہم تصور جامعہ مصریہ کا ہے۔ اس وقت مصر اور عالم اسلام میں دو مختلف اور متضاد رجحانات برسر پیکار تھے۔ سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸-۱۸۹۷ء) اور ان کے ہم خیال ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے جامعہ اسلامیہ کا علم بلند کر رکھا تھا، اور اتحاد عالم اسلامی کے حق میں قرآن وسنت اور اسلامی تاریخ سے دلائل دے رہے تھے، یہ طبقہ اسلامی شکوہ وسلطنت کے قیام اور عالمی خلافت کی تشکیل نو کا حامی تھا اور دنیائے اسلام کو متحد کر کے عہد جدید میں اسلام کی فیوض وبرکات سے دنیا کو روشناس کرانا چاہتا تھا اور دوسری طرف مغربی استعمار سے مادی وجسمانی آزادی حاصل کرنے کے ساتھ علمی، فکری وتہذیبی میدانوں میں بھی خود کفالت کا داعی تھا اور اسی لئے مغربی سیاست وصحافت نے اس طبقہ کو شکست دینے کے لئے اور اسے ناکام ونامراد بنانے کے لئے ہر طرح کے

ہتھکنڈے استعمال کئے۔

دوسرا طبقہ ان ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کا تھا جو مغربی سامراج سے آزادی تو حاصل کرنا چاہتے تھے اور علم وفکر کے میدان میں ہر طرح کی گلوخلاصی اس کا مقصد تھا، مگر اسلام کی سیاسی تعلیمات اور امت واحدہ کے تصور سے وہ بیزار تھے، چنانچہ اس نے جامعہ اسلامیہ کی جگہ جامعہ مصریہ کا تصور دیا، عرب اور مصری قومیت کے ان علم برداروں میں عرب عیسائی اور یہودی بھی شامل تھے جو ملت واحدہ کے قرآنی تصور کو حاوی دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے، انہیں عالم عرب میں رونما ہونے والی اسلامی بیداری پر تشویش تھی، وہ اس بات سے سخت مضطرب تھے کہ عالم اسلام خلافت عثمانیہ کی طرح مبادا کسی نئی عالمی خلافت کے پرچم تلے متحد ہو جائے اور احیائے عالم اسلام کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے، ان غیر مسلم طاقتوں نے اسلامی خلافت کی بڑھتی ہوئی لہر کو دبانے کے لئے عرب یا مصری قومیت کا ایک نیا بت تراشا تا کہ اس نئے ''مغربی خدا'' کے پرستار الہ واحد کے سامنے پورے اخلاص اور کامل وفاداری کے ساتھ جبین نیاز خم نہ کر سکیں۔ انہوں نے ایک عالمی فکری سازش کے تحت عرب قومیت کا نعرہ دیا اور عالم عرب کو چھوٹی چھوٹی سیاسی وجغرافیائی ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیا، اور اس طرح گویا عربوں کے اندر پیدا ہونے والی بیداری کو قومیت کے رنگ میں رنگ کر اسے غلط رخ کی طرف موڑ دیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴-۱۹۹۹ء) نے عالم اسلام میں برپا اس فکری کشمکش کی تصویر کشی اپنی مایہ ناز تصنیف ''اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش'' میں بڑے علمی انداز میں کی ہے۔ اپنے ایک اور رسالہ میں عرب قومیت کو اسلامی نقطۂ نظر سے آپ نے نہایت مہلک قرار دیا ہے، اپنی معرکہ آراء کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین؟'' (عالم اسلام پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر) میں بھی اس مسئلہ کی نزاکت پر بڑے بلیغ اسلوب میں گفتگو کی ہے، ہندوستان میں بھی ہندوستانی قومیت اور کلمۂ واحدہ کے درمیان ناگزیر تضاد پر بڑی بحثیں ہوئیں۔ مولانا حسین احمد مدنی (۱۸۷۹-۱۹۵۷ء) مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) اور ان کے ہمنواؤں نے قومیت کے مغربی تصور کو اسلام کے منافی نہیں سمجھا جبکہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹ء) نے مشہور زمانہ کتاب ''مسئلہ قومیت'' لکھ کر اسے اسلام کے تصورِ ملتِ واحدہ سے متصادم قرار دیا۔ علامہ محمد اقبال (۱۸۷۷-۱۹۳۸ء) نے تو علی الاعلان قومیت اور اسلام کے درمیان تضاد کو واضح کیا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

انہوں نے مولانا حسین احمد مدنی پر بھی نہایت سخت تنقید کی

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر زمقام محمد عربی ست
بمصطفی برساں خویش کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

تعجب ہے کہ احمد لطفی السید نے جامعہ اسلامیہ کی جگہ جامعہ مصریہ کے نظریہ کی بھرپور وکالت کی اور اسلام کے عالمی تصور اخوت پر ان کی نگاہ نہ گئی مگر یہاں فاضل مصنف اور دوسرے علم بردارانِ قومیت کے درمیان فرق کرنا پڑے گا کیوں کہ لطفی السید کی تحریروں کا زور خود کفالت اور خود انحصاری پر ہے وہ مصریوں کو دوسری اقوام کا دست نگر نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور قومی تحریک آزادی اور قومی تعمیر و تشکیل میں خود مصریوں کے اندر وہ اوصاف و خصوصیات پیدا کرنا چاہتے تھے جن سے وہ دوسروں کے محتاج نہ ہوں اور اپنی سیاسی و اجتماعی پالیسی خود وضع کریں، تاہم ایک طالب علم کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اگر انہوں نے عثمانی خلافت کی مخالفت نہ کی ہوتی اور مصریوں کے اندر خود انحصاری کو پروان چڑھانے پر ہی زور دیا ہوتا تو یہ طریقۂ کار زیادہ بہتر ہوتا۔ جامعہ اسلامیہ پر تنقید کرتے ہوئے ان کے قلم نے بہرحال لغزش کھائی ہے۔

احمد لطفی السید نے آزادی کے مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے اور اس کے فوائد اور انفرادی و اجتماعی قدر و قیمت کے حق میں مضبوط دلائل دیئے ہیں اور عرب حکومتوں کو مشورہ دیا ہے کہ اپنی رعایا کو آزادی کی اس نعمت سے محروم نہ کریں کیوں کہ اس سے فرد کا تشخص اس کا وقار اور اس کی اندرونی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور اجتماعی سطح پر آزادی کی نعمت سے مالا مال ہونے کے بعد ایک قوم ترقی کی معراج پر پہنچ جاتی ہے۔ فاضل مصنف حریت کو انسانی زندگی کا حاصل اور اس کا اصل نصب العین قرار دیتے ہیں جس کی خاطر افراد و اقوام نے تاریخ انسانی میں بڑی سے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ آزادی تمام قومی اور انفرادی اوصاف و فضائل کا اصل ستون ہے۔

عالم عرب اور عالم اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ان کا سب سے بڑا مسئلہ آزادی کا حصول اور اس کی برقراری ہے۔ ایک طویل مدت تک جان و مال کی ہر طرح کی قربانی دینے کے بعد عرب ممالک ایک ایک کر کے سیاسی طور پر آزاد ہوئے اور انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں جمہوریت، رائے عامہ کے احترام اور عوامی شراکت کے اصولوں کا اعلان کرتے ہوئے اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں اور بظاہر اپنے دساتیر اور قوانین و ضوابط کی تشکیل سے عوام کو ہر طرح کی آزادی دینے کا وعدہ

پورا کیا مگر آج اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے باوجود پورے عالم عرب میں آزادی نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ بعض ملکوں نے فوجی آمریت قائم کر رکھی ہے۔ بعض ممالک میں کسی ایک سیاسی جماعت اور کسی ایک سیاسی نظریہ کی بلا شرکت غیر حکمرانی ہے اور کہیں اسلامی جمہوریہ کا باقاعدہ اعلان کر کے سیاسی نظام تشکیل دیا گیا ہے مگر کوئی مسلمان ملک بھی عوام کو آزادی دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ نہ وہ عوامی رائے کا احترام کرنے کے قابل ہو سکا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جمہوریت کا علم بردار مغرب عالم اسلام میں اپنے تمام دعوؤں اعلانات اور افکار و نظریات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہا ہے۔ وہ کسی بھی مسلم ملک میں مسلم رائے عامہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے بلکہ ان تمام مسلمان ممالک میں عوامی رائے کو کچلنے کے لئے سیاسی مکر و فریب، اقتصادی ناکہ بندی، علمی تصنیف و تحقیق، ذرائع ابلاغ کی تکنیک اور فوجی و عسکری قوت کے تمام حربوں کو آخری حد تک استعمال کر رہا ہے، جن ملکوں میں الیکشن کے ذریعہ یا کسی اور طریقہ سے مسلمان عوام کی اسلامی شریعت کی بالادستی اور اسلامی حکومت کے قیام کی خواہش زور پکڑ رہی ہے اسے مغرب دہشت گردی، انتہا پسندی، مذہبی رجعیت اور بنیاد پرستی قرار دے کر اس کے خلاف عالمی سطح پر حصار بندی میں مصروف ہے۔ ان حالات میں عالم عرب اور عالم اسلام میں حریت کی قدر و قیمت مزید ابھر کر سامنے آتی ہے اور احمد لطفی السید کے افکار کی معنویت مزید واضح ہوتی ہے۔

عربی ادب کے میدان میں احمد لطفی السید کے اخبار الجریدہ نے سیاسی و سماجی مسائل پر مقالہ نگاری کی جس صحافت کی طرح ڈالی اس میں اعتدال، توازن، متانت اور استدلال کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ الجریدہ کے مضمون نگاروں میں مرد اور خواتین دونوں شامل تھے، اسی طرح شعری تخلیقات میں خواتین اور مردوں کے اشعار میں جذبہ کے آہنگ کے ساتھ توازن، تدریج تسلسل، استقلال اور سنجیدگی کے عناصر نمایاں ہیں۔ احمد لطفی السید نے ادیبوں اور شاعروں کی جو جماعت تیار کی تھی وہ بھی بڑی حد تک اسی مکتب فکر کی علم بردار اور پاسبان تھے، خود احمد لطفی السید کے قلم سے سماجی اور سیاسی مسائل پر جو تحریریں وجود میں آئی ہیں ان میں ادبیت، انشاء پردازی اور مضمون آفرینی کے ساتھ استقلال و استحکام اور متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا ہے، عام طور پر لوگ جن مسائل کو ادب کا موضوع نہیں بناتے ان پر فاضل مصنف نے قلم اٹھایا ہے اور نفس مضمون کے اطراف و جوانب کو روشن کرنے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا ادب بھی تخلیق کیا ہے ''ربیع الحیاۃ''، ''زہر الربیع''، الریف المصری''، ''جنی القطن''، ''الرجل السعید''، ''اول العام'' وغیرہ مضامین میں ادبیت اور انشاء پردازی کا کمال نمایاں ہے مگر ساتھ ہی روز مرہ کی زندگی کو بڑا خوب صورت پیراہن فاضل مصنف نے عطا کیا ہے اور عام انسان کے نازک احساسات و جذبات کی بڑی خوبصورت ترجمانی کی ہے۔

الجریدہ کے صفحات میں عربی ادب کی تاریخ اور تنقید نگاری کے موضوع پر مختلف اور متضاد مکاتب فکر کے علمی مباحث

شائع ہوتے رہے ہیں۔ مصطفیٰ صادق رافعی اور ڈاکٹر طہٰ حسین دونوں کی تحریریں اور ان کے ہم نواؤں کے افکار و خیالات اس اخبار کے ذریعے منظر عام پر آئے۔ احمد لطفی السید نے اس علمی معرکہ آرائی میں عرب ورثہ کے تحفظ کا حق ادا کیا اور مستشرقین کے منہاج تحقیق و تدریس پر تنقید کی، ان تمام تحریروں میں احمد لطفی السید کا اسلوب تعقل، تفکر، تدریج وجدت کاری کا علم بردار نظر آتا ہے۔ فاضل مصنف نے یونانی اور مغربی مفکرین کی تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا تھا، ارسطو، افلاطون اسپینسر، مون ٹیسکو، جان روسو، مکیاویلی، ٹالسٹائی کی تحریروں اور نظریات پر فاضل مصنف کو عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں پر مغربی و یونانی ثقافتوں اور نظریات کا اثر صاف محسوس ہوتا ہے اور اسی نمایاں خصوصیت کی وجہ سے ان کی تحریروں میں حقیقت پسندی منطقی استدلال، حسب ضرورت الفاظ کا استعمال اور عبارت آرائی سے گریز واضح ہے، ان کا اسلوب ادبی چاشنی اور بلیغ طرز ادا سے مالا مال ہے اور دانش و حکمت اور علم و فلسفہ سے پر بھی ہے۔ ادبیت اور تفلسف کا یہی وہ حسین امتزاج ہے جس نے ان کے اسلوب کو نہایت ممتاز اور منفرد بنا دیا ہے۔

جدید عربی ادب میں

لطفی السید کی خدمات

﴿ایک تنقیدی مطالعہ﴾

مقالہ

برائے

پی ایچ ڈی

ترتیب

انجم آرا (فلاحی)

اشراف

ڈاکٹر فیضان احمد

شعبہ عربی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۰۱ - ۲۰۰۰

T- 5767

T5767

قسم اللغة العربية و آدابها
جامعة عليكره الاسلامية، عليكره (الهند)

التاريخ .....

External : 709062
Uny. Ex. : 700920
Internal : 222
DEPARTMENT OF ARABIC
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH–202002 (U.P.), INDIA

Dated 3.12.07

TO WHOM IT MAY CONCERN

This is to certify that Miss Anjum Ara has done her Ph.D. work entitled **"Lutfi al-sayyid and His Contribution to Modern Arabic Literature: A critical Study"** under my supervision and has completed it successfully. This is an original contribution and entirely her own.

Dr. Faizan Ahmad

(Supervisor)
SUPERVISOR
Department of Arabic
A.M.U. Aligarh.

بسم الله الرحمن الرحيم

صفحہ

فہرست

مقدمہ	ا-و
باب اول علمی وسیاسی پس منظر	۱-۳۹
مصر میں محمد علی پاشا کا دور حکومت (قومی وتعلیمی بیداری کا آغاز)	۲
تحریک ترجمہ اور اس کے اثرات	۱۱
مصری صحافت اور اس کے مختلف رجحانات	۱۴
مصر کے اہم سیاسی مسائل	۱۶
عرابی انقلاب	۱۶
نہر سویز کا مسئلہ	۲۲
مصر جدید کی تعمیر کے نشیب وفراز	۲۳
باب دوم احمد لطفی السید (۱۸۷۲-۱۹۶۳)	۴۰-۷۸
حیات وخدمات	۴۱
الحزب الوطنی کی تشکیل	۴۶
حزب الامہ کی تنظیم	۴۸
مجمع اللغۃ العربیۃ کا قیام	۵۷
اہل علم وادب سے گہرے روابط	۶۱
باب سوم الجریدہ اور اس کی خدمات	۷۹-۱۱۵
الجریدہ اور اس کی تاسیس	۸۰

	مشمولات	۸۶
	تعلیم وتربیت کے میدان میں	۸۸
	معاشرتی میدان میں	۹۳
	سیاست کی وادی میں	۹۹
باب چہارم افکار ونظریات		۱۱۶-۱۴۵
	جامعہ مصریہ کا تصور	۱۱۷
	عالم عرب میں آزادی کا مسئلہ	۱۲۸
	نظریۂ عقلیت	۱۳۷
باب پنجم ادب اور اسلوب کلام		۱۴۶-۱۷۱
	ادبی موضوعات ومسائل	۱۴۷
	تاریخ وتنقید نگاری	۱۵۵
	اسلوب نگارش	۱۵۶
اختتامیہ		۱۷۲-۱۹۵
کتابیات		۱۹۶-۲۰۳

مقدمہ

عالم عرب کے ممتاز کالم نگار فتحی غانم نے مجلّہ روز الیوسف (عدد ۱۶۳۱، ج ۳۴، ۱۹۵۹ء ص ۲۶۔۲۷) میں بڑی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ میں جب بھی احمد لطفی السید کی تاریخ کی ورق گردانی کرتا ہوں تو ششدر رہ جاتا ہوں، اس بوڑھے مفکر نے اپنی عمر کی اسّی بہاریں دیکھیں، نئی نسل نے انہیں ''استاذ الجیل'' کا خطاب دیا، وہ کہتے ہیں کہ میں بار بار اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر اس شخص کی اہمیت کیا ہے؟ اس کے افکار کی قدر و قیمت کیا ہے؟ کیوں سارے لوگوں پر اس نام کے تعلق سے ہیبت طاری ہے؟ آخر تمام حلقے کیوں اس کا احترام کرتے ہیں؟ آخر کیوں طہٰ حسین، عقاد، توفیق الحکیم اور تمام مردان فکر اور مردان انقلاب ۲۳ر جولائی اس کی اتنی توقیر کرتے ہیں؟ اس شخص کی عظمت اور عبقریت پر تمام مکاتب فکر کا یہ اتفاق کیوں ہے؟ آخر حکومت نے آخری زمانہ میں اسے اعلیٰ ترین منصب سے کیوں ہمکنار کیا؟ پھر فتحی غانم اس کا جواب خود ہی فراہم کرتے ہیں کہ اس احترام و توقیر کی وجہ یہ ہے کہ اس دانائے راز نے وقت سے پہلے حقائق کا مطالعہ کرلیا تھا اور ان کی نشان دہی کردی تھی مثال کے طور پر احمد لطفی السید نے سیاسی آزادی کے ساتھ اقتصادی آزادی اور معاشی خودمختاری پر کافی زور دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج نئی نسل بھی ان کی اسی طرح پرستار ہے جس طرح پرانی نسل تھی۔

تعجب ہے کہ عالم عرب اور عالم اسلام کے بطل جلیل اور مفکر فلسفی اور انقلابی ادیب کی زندگی اور خدمات پر کوئی بہت وقیع کام نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ کی ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر کا چھٹا حصہ احمد لطفی السید کی زندگی اور خدمات کے لئے وقف ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب کا انتساب بھی انہی کے نام کیا ہے:

اس امت کے فلسفی کی خدمت میں

موجودہ نسل اور اس سے پہلے کے معلم کی بارگاہ میں

جامعہ مصریہ کے بانی کے حضور

یعنی عظیم استاد احمد لطفی السید کے نام

ایک مخلص فرزند اور وفادار شاگرد کی جانب سے

عقیدت بھرا سلام اور انتہائی توقیر و احترام!

اس کتاب میں فاضل مصنف نے الجریدہ کے مشمولات اور تحریروں پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے اور ان کی صحافیانہ خدمات کا ایک جامع تعارف پیش کیا ہے مگر فاضل ادیب اور دانشور کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے تعرض نہیں کیا ہے، نہ دوسرے مجلّات و جرائد میں ان کی تحریروں کا تجزیہ کیا ہے اسی طرح معاصرین اور دوسرے بعد کے ادیبوں کے تجزیاتی مباحث اور تنقیدی آراء کو پیش نظر نہیں رکھا ہے۔

عربی اور اردو زبانوں میں احمد لطفی السید کی زندگی اور خدمات پر جستہ جستہ بعض مقالات شائع ہوئے ہیں۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی نے اپنی کتاب ''مصر کی عربی صحافت ایک تنقیدی مطالعہ'' میں ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے، انور جندی نے اپنی مشہور تصنیف المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی المعاصر فی مأۃ عام میں الجریدہ پر ایک طویل مضمون رقم کیا ہے، ڈاکٹر محمد حسین نے الاتجاھات الوطنیۃ فی الادب المعاصر الجزء الاول میں جامعہ اسلامیہ کے تصور پر گفتگو کرتے ہوئے فاضل دانشور کے افکار و نظریات کو موضوع بحث بنایا ہے اسی طرح عباس محمود العقاد کے مختلف مضامین احمد لطفی السید کی زندگی اور فکر پر بڑے بیش قیمت ہیں مگر ان کی حیثیت تاثرات و خواطر کی ہے، البتہ ڈاکٹر نعمات احمد فؤاد نے المجلہ میں احمد لطفی السید کے نظریۂ لغت پر تحقیقی مواد فراہم کیا ہے، اسی طرح دوسرے ادیبوں اور نقادوں نے اس بطل جلیل کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

جدید مصر کی نئی نسل کے معمار فلسفی اور مفکر احمد لطفی السید کے کارناموں پر کسی علمی اور تحقیقی مواد کی عدم دستیابی ہی کی وجہ سے شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز نے پی ایچ ڈی مقالہ کے لئے درج ذیل عنوان منظور کیا:

Lutfi al-Sayyid and His Contribution to Modern Arabic Literature : A Critical Study

جس کے لئے میں انتہائی مشکور ہوں۔ محترم مشرف ڈاکٹر فیضان احمد صاحب نے موضوع کی علمی اور تحقیقی ضروریات کی تکمیل میں میری ہر طرح مدد کی۔ قدم قدم پر میری سرپرستی فرمائی بلکہ دوران تحقیق ان کے مشفقانہ رویہ اور تسلی آمیز سلوک نے میری ڈھارس بندھائی اور بالآخر یہ دشوار گزار مرحلہ تکمیل کو پہنچا۔ میں ان کی دنیوی و اخروی کامیابی کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعا گو ہوں۔

پروفیسر عبدالباری صدر شعبہ عربی نے وقتاً فوقتاً مجھے مشورہ دیا، پروفیسر کفیل احمد قاسمی نے گاہے گاہے مجھے حوصلہ بخشا۔

ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری نے علمی اور تحقیقی دست تعاون دراز کرنے کے ساتھ اخلاقی اور معنوی تائید وحمایت بھی کی۔ میں اپنے ان تمام اساتذہ اور شعبہ کے دوسرے مشفق استادوں اور دفتری معاونین کی شکر گزار ہوں کہ ان سب کے تعاون اور دعاؤں کے نتیجہ میں میں یہ مقالہ مکمل کرنے کے قابل ہوسکی۔

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب نے علی گڑھ میں میرے قیام سے ہی میری ہر طرح حوصلہ افزائی کی ہے۔ علمی میدان میں جو تھوڑی بہت پیش رفت میری ہوئی ہے اس میں ان کی تشجیع کا بڑا حصہ ہے۔ ڈاکٹر عبید اللہ فہد صاحب نے قدم قدم پر میری علمی اور عملی رہنمائی کی ہے۔ میں ان کے تئیں اظہار تشکر کر کے ان جذبات واحساسات کی ناقدری کرنا نہیں چاہتی جو میں اپنے دل میں ان کے لئے رکھتی ہوں۔ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی، توقیر احمد اعظمی اور اپنی تمام احباب اور ہم جماعتوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے ہمیشہ میرے لئے نیک خواہشات اور تمناؤں کا اظہار کیا ہے۔

طاہرہ باجی تو تمام شکریوں سے بالاتر ہیں انہوں نے ہمیشہ ایک ماں اور ایک بڑی بہن کا کردار ادا کیا اور میرے ہر دکھ سکھ میں وہ برابر شریک ہیں۔ ان کے وجود سے میں نے ہمیشہ اپنے لئے شفقت، محبت اور اپنائیت کے چشمے پھوٹتے دیکھے ہیں۔ میں ان کی صحت اور کامیابی کے لئے لمحہ لمحہ دست بدعا ہوں۔ والد گرامی شیخ تواب احمد مدظلہ العالی کا نام آتے ہی میرا قلم کانپنے لگتا ہے۔ جذبات میں تلاطم برپا ہوجاتا ہے اور آنکھیں ساون بھادوں ہوجاتی ہیں، والدہ مرحومہ کے انتقال کے بعد ان کی صحت برابر بگڑتی گئی اور ان کے تمام افکار، منصوبے بکھرتے گئے مگر انہوں نے ایک ماں کی طرح ہمیں پالا، ہماری ہر خواہش کی کسی نہ کسی طرح تکمیل کی۔ مجھے ڈاکٹریٹ کی سند دلانے کے لئے ہر قسم کی ذہنی، فکری اور عملی پریشانی برداشت کی اور مجھے کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میں ایک کمزور اور بیمار باپ کی بیٹی ہوں، میری پوری جدوجہد اور علمی تگ ودو انہی کے نام سے معنون ہے۔ میں ان کے اخلاص، ایثار اور قربانی کو سلام کرتی ہوں، اور اپنی چھوٹی بہن عذراء فلاحی کو اس موقع پر میں کیسے بھول سکتی ہوں جس نے مجھے علمی کاموں کے لئے شروع سے فارغ کر رکھا ہے، یہاں تک کہ ازدواجی زندگی میں داخل ہونے کے بعد بھی اس نے میری یکسوئی میں کوئی کمی نہ آنے دی اور گھریلو مسائل سے تنہا خوش اسلوبی سے نمٹتی رہی۔ اللہ تعالی اسے خوش وخرم رکھے اور اس کے خاندان میں خوشیوں اور کامیابیوں کا بسیرا رہے!

ادارہ معروضی مطالعات نئی دہلی نے علمی اور تحقیقی دنیا میں بڑا نام کمایا ہے۔ ریسرچ اسکالرز کو وظائف کی ایک معقول

رقم فراہم کی ہے تا کہ وہ بے فکری سے آزادانہ تحقیق کا عمل جاری رکھ سکیں۔ پچھلے چند سالوں سے ادارہ نے اپنی اسکالرشپ اسکیم کے تحت نہ صرف میری مادی امداد کی ہے بلکہ اپنے مذاکروں اور سیمیناروں میں مقالات کی لازمی پیش کش اور مباحثوں میں ناگزیر شرکت کے طریقۂ کار کے ذریعے میری بڑی تربیت کی ہے۔ میں اس ادارہ کے تمام کارکنوں کی اور بطور خاص علی گڑھ شاخ کے رابطہ کار جناب محمد مقیم الدین صاحب، ان کے معاون جناب سراج احمد خان ریسرچ فیلو ڈاکٹر جاوید احمد خان اور کارکن شمس الدین بھائی کی شکر گزار ہوں۔

لائبریری انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام کارکنوں کی بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے مقالہ کی تکمیل میں بنیادی کردار ادا کیا، خاص طور سے جناب کبیر احمد خان اسسٹنٹ لائبریرین کا جو ہر اسکالر کے لئے ہمیشہ سراپا تعاون بنے رہتے ہیں کبیر بھائی کی اس سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر موضوع پر متعلقہ مواد تلاش کرنے میں بھی بڑے کارگر ثابت ہوتے ہیں اور اپنے شبنمی مزاج اور مصالحانہ طبیعت کی وجہ سے علم و تحقیق کے تمام طلبہ اور اسکالرز میں بے حد مقبول ہیں، میں بطور خاص محمد عمران قاسمی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کمپیوٹر کتابت کے تمام مراحل بخیر و خوبی طے کئے، اگر ان کا تعاون شامل نہ ہوتا تو موجودہ مقالہ اتنی خوبصورت شکل میں سامنے نہ آتا۔

آخر میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں سجدۂ نیاز و عبودیت خم کرتی ہوں جس کی توفیق سے ہی یہ مشکل ترین وادی طے ہو سکی ورنہ ریسرچ کے ان چار سالوں میں نامعلوم کتنی بار میں نے صبر و ضبط کا دامن چھوڑا اور ہمت ہار بیٹھی مگر اسی کے سہارے تھوڑے وقفہ کے بعد پھر ریزہ ریزہ تنکوں کو جمع کرنے میں لگ گئی، اس دوران میرا یہ ایقان بہت مستحکم ہوا کہ اگر بندہ اپنی مدد کرنے پر کمر بستہ ہو جائے تو خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے، میرے رب، میری اس حقیر خدمت کو قبول فرما۔ مجھے حوصلہ دے کہ کشمکش حیات میں کامراں ہو سکوں اور اپنے بہی خواہوں اور احباب کی نیک دعاؤں کی مستحق بن سکوں، آمین یا رب العالمین!

انجم آرا فلاحی

باب اول

علمی و سیاسی پس منظر

مصر میں محمد علی پاشا کا دور حکومت (قومی و تعلیمی بیداری کا آغاز)

تحریک ترجمہ اور اس کے اثرات

مصری صحافت اور اس کے مختلف رجحانات

مصر کے اہم سیاسی مسائل

عرابی انقلاب

نہر سوئیز کا مسئلہ

مصر جدید کی تعمیر کے نشیب و فراز

مصر میں محمد علی پاشا کا دور حکومت

۱۷۹۸ء میں مصر پر جنرل بوناپارٹ (نپولین) کے حملہ کے ساتھ ہی اس ملک کی سیاسی، علمی اور تہذیبی تاریخ نے کروٹ لی، فرانس نے مصر پر حکومت ہی نہیں کی بلکہ فکر و نظر کے نئے تصورات سے ملک کو روشناس بھی کرایا، نپولین کے ساتھ علماء، انجنیئر، ڈاکٹر، سائنسداں اور مختلف میدان کے ماہرین سرزمین مصر پر وارد ہوئے اور انہوں نے اس دور میں پہلی بار آزادی، مساوات، بھائی چارگی نیشنلزم اور انسانی حقوق کے اصولوں سے عربوں کو آشنا کرایا، نپولین نے محکمۂ دیوان قائم کر کے مصری عوام کو اقتدار میں شرکت بھی عطا کی۔ عرب فرانسیسی سیاست اور تہذیب و ثقافت سے پوری طرح متأثر ہوئے اور ان کے برسوں کے جمے جمائے نظریات اور روایتی اداروں میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہوا۔ فرانسیسی تہذیب نے مصری عوام میں سیاسی اور سماجی شعور بیدار کیا اور انہیں اپنی ذات اور اپنی قوم کے بارے میں عوامی سطح پر سوچنے اور لائحۂ عمل بنانے کے مواقع ملے، مصری عوام میں زندگی کی جو نئی لہر دوڑی اور علوم و فنون کے مختلف میدانوں میں ترقی کا انہوں نے بچشم خود مشاہدہ کیا تو ان کے اندر ایک نئے قومی شعور نے جنم لیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۳ر مئی ۱۸۰۵ء کو عوام کی مرضی سے محمد علی پاشا (۱۷۶۹ء۔۱۸۴۹ء) کو مصر کا حاکم بنایا گیا۔ محمد علی نے مصر کی قومی جنگ آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا مگر حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد اس نے پورے ملک کو تعمیر و ترقی کی جدید شاہراہ پر گامزن کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے فرانسیسی سائنسدانوں، ماہرین فنون اور اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔

محمد علی نے برسر اقتدار آنے کے ساتھ انتظامی اور اقتصادی اصلاحات کے بڑے اقدامات کئے جن کی بدولت مصر کی معاشی حالت بحال ہونے لگی۔ ملک کے لئے ایک بحری بیڑا تیار کرنے کی کوشش اس نے ۱۸۱۵ء میں شروع کی۔ ابتدا میں فرانس، اٹلی اور بمبئی میں جہاز تعمیر کرایا لیکن جلد ہی اسکندریہ میں بھی ایسے کارخانے قائم ہو گئے۔ نوارینو میں مصر کے بحری بیڑے کی تباہی کے بعد جہاز سازی کا کام پھر شروع ہوا اور ۱۸۳۱ء کے بعد فرانسیسی اور اطالوی افسروں کی اچھی خاصی تعداد مصر کی بحری فوج میں بھرتی کر لی گئی مگر یہ بحری بیڑا اپنے بانی کی زندگی کے بعد زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔

محمد علی کا اصل کارنامہ جدید علوم و فنون کی اشاعت اور مصریوں میں قومی شعور کی تخم ریزی ہے اس نے ملک کی تاریخ میں پہلی بار نہ صرف یہ کہ عوام کے اندر قومیت کا جذبہ پیدا کیا بلکہ اتحاد عرب کی حکمت عملی بھی نافذ کی جس کا مقصد تمام عربی بولنے والے ممالک کو اپنی قیادت میں متحد و متفق کرنا تھا۔ مصر کے نظام تعلیم کی جدت کاری کے پس پردہ محمد علی کا مقصد محض کاروبار حکومت چلانے کیلئے مناسب ملازمین تیار کرنا ہی نہیں تھا بلکہ وہ پورے ملک کو ترقی و تعمیر

کی جدید شاہراہ پر گامزن دیکھنا چاہتا تھا اس نے محسوس کیا کہ مغربی اقوام خاص طور سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی عظمت اور علوم وفنون اور اقتصادی وسیاسی استحکام کے میدانوں میں گوناگوں سرگرمیوں کا راز ان کی حربی تنظیمات میں پوشیدہ ہے اسی لئے اس نے سب سے پہلے مصر کی حربی اور عسکری قوت میں خاطر خواہ اضافہ کیا اسی طرح صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کے میدانوں میں اس نے زبردست انقلابی اقدامات کئے اور ملک کو معاشی اعتبار سے بڑا مضبوط بنادیا مگر یہ تمام معاشی اور حربی ادارے ماہر، تعلیم یافتہ اور تجربہ کار ملازمین کے دست نگر تھے چنانچہ اس نے فرانس کے علماء انجنیئر ڈاکٹر اور دوسرے ماہرین تعلیم کیلئے ملک کے دروازے کھول دیئے تو دوسری طرف مغربی زبانوں میں طبع شدہ مختلف علوم وفنون کی امہات کتب کی عربی میں منتقلی کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اور جدید علوم سے متعلق عربی میں تراجم کا انبار لگادیا۔ تیسری طرف مصری طلبہ اور اساتذہ کے وفود کے وفود انگلینڈ اور فرانس بھیجے تاکہ وہ وہاں کی تعلیم وتہذیب سے مسلح ہو کر واپس آئیں اور ملک کی ترقی میں محمد علی کے خاکے میں رنگ بھریں۔ محمد علی کے مجددانہ اقدامات کے پس پردہ رفاعہ طہطاوی (۱) کی کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے، رفاعہ ازہر کے نظام تعلیم کا بڑا سخت ناقد تھا اور کہا کرتا تھا کہ ہمارے ملک کے احوال میں تبدیلی ناگزیر ہے اور نئے علوم ومعارف سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔

ان بلادنا لابد أن تتغير احوالها و يتجدد بها من المعارف ما ليس فيها (۲)

محمد علی اسی رائے کا علمبردار تھا اس نے پورے ملک میں جدید مدارس اور کالجوں کے قیام کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا مگر تمام جدید علوم کی تدریس کیلئے ذریعۂ تعلیم عربی زبان ہی کو قرار دیا اسی لئے رفاعہ طہطاوی نے اسے جدید علوم کی تدریس کا مجدد قرار دیا ہے اور اہل یوروپ میں اسلامی تمدن کو زندہ کرنے والا اور تقلید واوہام کیلئے سم قاتل کا خطاب دیا ہے۔(۳)

محمد علی نے ۱۸۱۱ء میں مذبحة القلعة کے حادثہ کے بعد مملوکوں کی اولاد اور ان کے غلاموں کیلئے قلعہ میں پہلا حربی مدرسہ قائم کیا جس میں فنون حرب کے ساتھ عربی ترکی اور اطالوی زبانوں کی تدریس بھی ہوتی تھی چنانچہ اطالوی زبان وہ سب سے پہلی یوروپی زبان تھی جو محمد علی کے دور میں اسکولوں کے نصاب میں داخل ہوئی اسی طرح جب محمد علی نے تعلیم کیلئے طلبہ واساتذہ کے وفود یوروپ بھیجنا شروع کیا تو ۱۸۰۹ء سے ۱۸۱۳ء کے عرصے میں اٹلی کے مختلف شہروں کو مختلف وفود بھیجے گئے تاکہ وہ طباعت کی جدید ٹکنالوجی اور جنگی فنون اور نظام حکومت سے متعلق تجربات حاصل کرسکیں۔ بعد میں اٹلی کی جگہ فرانس نے لے لی اور تعلیم وتہذیب کا پورا تبادلہ فرانس سے ہونے لگا۔

محمد علی کے زمانے میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کیلئے پورے ملک میں اسکولوں کا جال بچھایا گیا محققین کے مطابق

۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء سے پہلے ابتدائی اسکولوں کے قیام کے سلسلے میں کوئی دستاویز مصر کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ محمد علی کے زمانے میں ملک میں ابتدائی اسکولوں کے قیام کا سرکاری سرکلر اسی سال رمضان اور ذی قعدہ کے مہینوں میں جاری ہوا اور دو تین سال کے عرصے میں دھیرے دھیرے ملک کے مختلف شہروں میں مدارس و مکاتب قائم ہوتے چلے گئے۔ ایک تحقیق کے مطابق ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۶ء تک کی مدت میں کم سے کم ۶۷ مکاتب قائم ہوئے۔(۴)

فروری ۱۸۳۶ء / ذی قعدہ ۱۲۵۱ھ میں حکومت نے مدارس و مکاتب کی تنظیم کیلئے باقاعدہ شوری المدارس قائم کیا تاکہ تمام اسکولوں کے معاملات کی حکومتی سطح پر اور مرکزی پیمانے پر نگہداشت ہو سکے۔(۵)

محمد علی کے زمانے میں یوروپی ممالک کے مختلف شہروں کو جدید علوم و فنون کی تحصیل کیلئے وفود بھیجنے کی جو تحریک شروع ہوئی اس کی کچھ تفصیلات امیر عمر طوسون نے فراہم کی ہیں۔(۶)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اٹلی، فرانس، انگلینڈ، آسٹریلیا خاص طور سے وفود کی ترسیل کیلئے منتخب کئے گئے تھے سب سے پہلا وفد ۱۸۱۳ء میں نقولا مسابکی کی قیادت میں اٹلی کے مختلف شہروں میں بھیجا گیا تھا۔ ۱۸۱۵ء میں اسی شخص کی قیادت میں جو وفد میلان کو روانہ ہوا اس کے بارے میں یہ تفصیل ملتی ہے کہ اس کے رفقاء کے علاوہ اس وفد میں تین بچے بھی تھے۔ اس کا مقصد فن طباعت کی باریکیوں اور پیشہ ورانہ صلاحیت اور ٹکنیک کا مطالعہ کرنا تھا۔ وہاں تین سال کے مطالعے کے بعد جب یہ وفد مصر واپس آیا تو اس کے ساتھ اٹلی میں ڈھلے ہوئے حروف اور مشینیں بھی تھیں۔ اس وفد نے سب سے پہلے عثمان نورالدین کی معیت میں بولاق میں کام کیا پھر مسابکی نے بولاق ہی میں سرکاری پریس کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۳۰ء یا ۱۸۳۱ء کے اوائل میں اپنی وفات تک وہ اس پریس کا ڈائرکٹر رہا۔

دوسرا وفد ۱۸۱۸ء میں فرانس کو بھیجا گیا اس وفد میں سے عثمان نورالدین کے علاوہ بقیہ ارکان کے نام معلوم نہیں ہیں۔ یہ وفد ۱۸۲۰ء میں واپس آیا۔ ۱۸۲۸ء میں عثمان نورالدین مصری بحریہ کے چیرمین متعین ہوئے۔ اس شخص نے فنون حرب اور دوسری صنعتوں سے متعلق کتابوں کے ترجمہ کی نگرانی کی۔ بعد میں انجینئرنگ عربی ترکی اور اطالوی زبانوں کی تدریس بھی کی۔ ۱۸۲۶ء میں تیسرا وفد فرانس گیا جس کے ارکان چالیس تھے بعد میں اس وفد کے قائد رفاعہ طہطاوی بھی فرانس تشریف لے گئے۔ پیرس میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا، چار ارکان پبلک ایڈمنسٹریشن (شہری انتظامیہ) کے مطالعے کے لئے مخصوص ہوئے، اسی طرح چار افراد کو حربی مطالعات کے لئے متعین کیا گیا، تین افراد بحریہ کے مطالعے پر مامور ہوئے، دو ارکان علوم سیاسیہ کے مطالعے کیلئے فارغ کئے گئے۔ دو افراد واٹر پاور کے اختصاص کے لئے منتخب ہوئے ایک فرد میکینکل انجینئرنگ کے لئے، تین افراد ڈیفنس انجینئرنگ کے لئے، دو فرد ٹینک سازی کی

ٹیکنک کیلئے، دو افراد معدنیات کو ڈھالنے اور اسلحہ بنانے کے فن کیلئے، دو ارکان فن طباعت کی باریکیوں کا مطالعہ کرنے کیلئے، چار ارکان کیمسٹری کیلئے، دو افراد طب و جراحت کیلئے، دو افراد زراعت کیلئے، تین ارکان تاریخ فطرت و معدنیات کے مطالعے کیلئے اور ایک رکن کو فن ترجمہ کیلئے منتخب کیا گیا بقیہ دوسرے افراد کو متعین طور پر کوئی ذمہ داری تفویض نہیں کی گئی۔

۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۳ء تک دوسرے مختلف وفود فرانس روانہ کئے گئے ان وفود میں شامل افراد کی تعداد تقریبا ۷۰ ہے، ان میں سے چھ طلبہ اگست ۱۸۲۸ء میں بحری فنون کے مطالعے کے لئے گئے، سات طلبہ انجینئرنگ اور ریاضی کے لئے اور دو طلبہ شہری انتظامیہ کے علم کے مطالعے کے لئے بھیجے گئے بقیہ افراد مختلف صنعتوں سے متعلق مختلف کاموں میں مہارت حاصل کرنے کے لئے مامور ہوئے۔

۱۸۲۹ء میں آسٹریلیا، فرانس اور انگلینڈ کو مختلف وفود بھیجے گئے جن کی مجموعی تعداد ۵۸ بنتی ہے جن میں سے ۳۴ وفود فرانس گئے ان کا مقصد فن سرجری اور اس کے آلات، گھڑی سازی، پلاسٹک انڈسٹری، پارچہ بافی اور اسلحہ سازی کے مختلف فنون کی تعلیم حاصل کرنا تھا، چار وفود آسٹریلیا گئے تاکہ گرم کپڑوں کی بنائی کا فن سیکھ سکیں، بیس وفود انگلینڈ روانہ کئے گئے تاکہ مختلف مشینوں کی مرمت کا کام سیکھ سکیں، اسی سال اسکندریہ کے مدرسہ بحریہ کے چار طلبہ انگلینڈ گئے وہاں سے واپس ہونے کے بعد انہوں نے مصری اسطول میں کام کیا انہوں نے انگریزی میں بنے ہوئے بحری تختیوں کا اردو میں ترجمہ کیا تاکہ انہیں مصری بحریہ میں استعمال کیا جاسکے۔

۱۸۳۲ء میں سات حبشیوں کا ایک وفد فرانس بھیجا گیا، نومبر ۱۸۳۲ء میں ایک طبّی وفد فرانس گیا جس میں بارہ ارکان شامل تھے، طب کے پیشے سے منسلک ہونے سے پہلے یہ سب جامعہ ازہر کے طالب علم تھے، ۱۸۴۴ء کو فرانس پھر ایک وفد بھیجا گیا جس میں ۷۰ طالب علم شریک تھے، جن کا انتخاب سلیمان پاشا فرانسیسی نے کیا تھا، ۱۸۴۵ء میں آسٹریلیا اور فرانس کو مختلف طبّی وفود بھیجے گئے تاکہ وہ وہاں کے طبّی علوم کا مطالعہ کر سکیں، پھر ۱۸۴۷ء میں فرانس ایک اور طبّی وفد روانہ کیا گیا، یہ وفد دو ڈاکٹروں محب یونس آفندی اور عبد الرحمٰن البراوی آفندی پر مشتمل تھا، اسی سال وکیلوں کا ایک وفد فرانس بھیجا گیا تاکہ وہ فن وکالت کی باریکیوں اور اس کی تفصیلات کا مطالعہ کر سکیں، ۱۸۴۷ء ہی میں دو وفود میکنیک کے فن اور علوم سیاسیہ کے مطالعہ کے لئے انگلینڈ بھیجے گئے، ان وفود میں مدرسہ مہندس خانہ اور مکتب عالی کے طلبہ شامل تھے، مہندس خانہ کے طلبہ میکنیک کی تعلیم کے لئے اور مکتب عالی کے طلبہ علوم سیاسیہ کے مطالعے کے لئے بھیجے گئے تھے، ۱۸۴۸ء میں ایک اور طبّی وفد فرانس بھیجا گیا، یہ ابراہیم پاشا کی حکومت کا دور تھا اس میں دو ڈاکٹر حسن

لئے بھیجے گئے تھے، ۱۸۴۸ء میں ایک اور طبی وفد فرانس بھیجا گیا، یہ ابراہیم پاشا کی حکومت کا دور تھا اس میں دو ڈاکٹر حسن عبد الرحمٰن آفندی، یوزباشی اور محمود ابراہیم آفندی شامل تھے، ۱۸۴۸ء کے اوائل ہی میں انگلینڈ ایک اور وفد بھیجا گیا جس میں اکیس بڑھئی شامل تھے، یہ کاریگر انگلینڈ پہنچ کر اسٹیمر کی مشینوں کو باہم جوڑنے کا فن سیکھ کر چند ماہ بعد ہی مصر واپس آئے اس وفد کو کسی علمی وفد کا نام دینا درست نہ ہوگا یہ تو انگلینڈ اس لئے گئے تھے کہ برطانوی بحریہ کا مشاہدہ کریں اور دیکھیں کہ بھاپ سے چلنے والی کشتیاں کس طرح بنائی جاتی ہیں۔

ان چند وفود کی تفصیلات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں علم و فن کے ہر دائرے میں نئے نئے تجربے کئے گئے اور یوروپی ممالک کے تجربات سے بھرپور استفادہ کیا گیا۔

محمد علی کے زمانے میں مختلف علوم و فنون پر مشتمل کتابوں کا دوسری زبانوں سے ترجمہ کا جو عظیم الشان کام انجام پایا اس میں مدرسة الألسن اور علم الترجمة کا بڑا کردار ہے۔ حکومت نے ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۵ء میں مدرسة الادارة الملكية قائم کیا تھا جس میں تیس طلبہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ یہ طلبہ فرانسیسی زبان ریاضی انجینئرنگ اور جغرافیہ کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ فن الادارة الملكية سے متعلق کتابوں کے تراجم کی مشق بھی کرتے تھے۔ سیاسی و سماجی علوم سے متعلق دوسری زبانوں سے ترجمے کے میدان میں اس مدرسہ کا اہم کردار ہے۔ مگر ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۶ء میں یہ مدرسہ بند ہوگیا تقریباً ۱۲۵۰ھ ہی میں ایک اور ادارہ مدرسة التاريخ والجغرافية بھی قائم ہوا جو مدرسة المدفعية سے ملحق ہوگیا اس کے تنہا نگراں رفاعہ طہطاوی تھے اس کا مقصد عسکری مدارس میں جغرافیہ کی تعلیم دینے والے اساتذہ پیدا کرنا تھا، بعد میں یہ دونوں مدارس ایک نو تشکیل ادارہ مدرسة الترجمة جو ۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء میں قائم ہوا، میں ضم ہوگیا بعد میں اس ادارے کا نام تبدیل ہوکر مدرسة الالسن ہوگیا اور اس نے دفتر دار بحری الازبكية میں کام کرنا شروع کیا۔ ابتداء میں کل اسی طلبہ اس مدرسہ میں داخل کئے گئے جن میں مدرسة الادارة الملكية کے سقوط کے بعد اس کے طلبہ بھی شامل کر لئے گئے اور اس طرح یہ تعداد بڑھ کر ۱۵۰ تک پہنچ گئی، مدت تعلیم ۵ سے ۶ سال تک تھی۔ اس مدرسے میں عربی، ترکی اور فرانسیسی زبانیں پڑھائی جاتی تھیں اور حساب اور جغرافیہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی، اس کے بعد مطالعہ تاریخ بھی نصاب میں شامل کر دیا گیا، اس مدرسہ نے یوروپ سے ادب، ناول اور تاریخ کے موضوعات پر فرانسیسی کتابیں منگائیں۔ ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء میں طلبہ کا ایک گروپ فارغ التحصیل ہوا اور اس نے تاریخ اور ادب کی کتابوں کا ترجمہ کرنا شروع کیا جن کی اصلاح رفاعہ طہطاوی کر دیا کرتے تھے۔ بعد میں اس مدرسہ کے نصاب میں انگریزی زبان بھی داخل کر دی گئی اور اس زبان کی تدریس کے لئے انگریزی زبان کا استاد بھی رکھا

گیا۔ استاذ صالح مجدی نے اپنی کتاب حلیۃ الزمن میں تحریر کیا ہے کہ رفاعہ کے طلبہ میں سے سب سے پہلے جس شخص نے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی وہ محمد آفندی سلیمان تھے جنہوں نے انگریزی سے عربی میں متعدد کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔

مدرسۃ الألسن کے قیام و انتظام کے پیچھے اصل شخصیت رفاعہ طہطاوی کی تھی جو فنی اور انتظامی پہلوؤں سے مدرسہ کی نگرانی کرنے کے ساتھ ساتھ طلبہ کو ادب اسلامی شریعت اور مغربی قوانین کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ ان کے ذمے ان کتابوں کا انتخاب بھی تھا جن کا ترجمہ کرنا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ وہ مدرسہ کے طلبہ اور قلم الترجمۃ سے متعلق ماہرین کے درمیان ان کتابوں کی تقسیم بھی کرتے تھے اور جب کسی کتاب کا ترجمہ مکمل ہو جاتا تھا تو اس کی تصحیح تنقیح اور نظر ثانی بھی کرتے تھے۔ (۷)

عربی زبان و ادب کی تدریس کے لئے درجۂ ذیل اساتذہ مامور تھے :

۱۔ الشیخ الدمنہوری

۲۔ الشیخ علی الفرغلی الأنصاری (ابن خال رفاعۃ)

۳۔ الشیخ حسنین حریز الغمراوی

۴۔ الشیخ محمد قطۃ العدوی

۵۔ الشیخ احمد عبد الرحیم الطہطاوی

۶۔ الشیخ عبد المنعم الجرجاوی

۷۔ حسن آفندی

فرانسیسی زبان کی تعلیم کے لئے مندرجہ ذیل اساتذہ متعین تھے :

۱۔ موسیو کوت، اس کی وفات کے بعد اسکندر دودہ کا تقرر عمل میں آیا،

۲۔ موسیو بتیر،

۳۔ موسیو دیزون،

۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۱ء میں جب قلم الترجمۃ شعبہ کا قیام عمل میں آیا تو مدرسۃ الألسن کے تمام فارغ التحصیل طلبہ اس ادارے میں ملازم رکھ لئے گئے، محمد علی پاشا نے مدرسۃ الألسن کی افادیت کے پیش نظر اس ادارے کی ترقی اور استحکام کے لئے متعدد اقدامات کئے۔

۱۔ ۱۸۴۱ء میں ابو زعبل کے ثانوی مدرسہ کو اسی ادارے سے ملحق کر دیا گیا۔

۲۔ ۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۵ء میں اس ادارہ میں سیاسی و سماجی علوم اور انتظام عامہ کے مطالعہ کے لئے ایک شعبہ قائم کیا گیا۔

۳۔ ۱۲۶۲ھ میں زراعت کے متخصصانہ مطالعہ کے لئے ایک انسٹی ٹیوٹ کا اضافہ کیا گیا۔

۴۔ ۱۲۶۳ھ کے اواخر میں فقہی علوم کے مطالعے کے لئے ایک الگ شعبہ قائم ہوا جس میں ۴۰ طلبہ کو داخلہ دیا گیا یہ سارے طلبہ مذہب حنفی کی تعلیم حاصل کرتے، تعلیم کی تکمیل کے بعد انہیں ملک کے مختلف حصوں میں قاضی مقرر کیا گیا۔

مدرسۃ الألسن کا سب سے اہم شعبہ قلم الترجمۃ تھا جو ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۱ء کے اوائل میں قائم کیا گیا تھا، ۱۸۴۱ء کے لجنۃ تنظیم التعلیم نے یہ قرار داد منظور کی تھی کہ چونکہ ترجمہ شدہ کتابوں کی تعداد بہت کم ہے اور ان کی صحت اور استنادی حیثیت بہت زیادہ معتبر نہیں ہے اس لئے یہ وقت کا ناگزیر تقاضہ ہے کہ تمام ترجمے منضبط ہوں غلطیوں سے محفوظ ہوں اور مقصد کے حصول میں پوری طرح معاون ہوں چونکہ علوم وفنون کی کتابوں کا ترجمہ کرنا محض زبان دانی پر منحصر نہیں ہے بلکہ ان علوم وفنون سے گہری واقفیت بھی درکار ہے اس لئے لجنۃ نے مترجمین کے ساتھ مخصوص فن ترجمہ کا ایک شعبہ قائم کرنے کی سفارش کی۔

ترجمے کا یہ شعبہ چار قسم کے قلموں پر مشتمل تھا۔

۱۔ مختلف علوم اور ریاضت سے متعلق کتابوں کے ترجمے کا قلم، اس کے صدر بجباشی محمد ہیومی آفندی تھے ان کی نگرانی میں مدرسۃ الألسن کا ایک فارغ التحصیل اور اس مدرسہ کے پہلے گروپ کے پانچ طلبہ کام کرتے تھے۔

۲۔ طبّی اور طبیعی علوم کی کتابوں کے ترجمے کا قلم، اس کے صدر یوزباشی مصطفیٰ واطی آفندی تھے، ان کی نگرانی میں مدرسۃ الألسن کے ایک ملازم اور اس کے تین شاگرد کام کرتے تھے۔

۳۔ اجتماعی و معاشرتی لوازمہ یا ادبیات کے ترجمے کا قلم جیسے تاریخ، جغرافیہ، منطق، ادب، قصہ نگاری، قانون اور فلسفہ وغیرہ، اس کے صدر خلیفہ محمود آفندی تھے جو مدرسۃ الألسن کے ایک فارغ التحصیل اور اسی کے مدرس بھی تھے۔ ان کے ساتھ ایک دوسرا ملازم اور مدرسہ کے تین طلبہ بھی کام کرتے تھے۔

۴۔ ترکی ترجمہ کا قلم، اس کے نگراں میناس آفندی تھے ان کی نگرانی میں مدرسۃ الألسن کے چار طلبہ ترکی کتابوں کے ترجمے پر مامور تھے۔

چاروں قلموں میں مسودہ کی تسوید و تبییض کے لئے مختلف افراد مامور تھے جو کتاب کے ترجمہ کے بعد اسے صاف کر کے دیوان المدارس کو بھیج دیتے تھے۔

مدرسة الألسن پندرہ سالوں تک بڑا فعال رہا اور اس نے مصر کی عام تہذیبی و تعلیمی زندگی پر اپنے زبردست اثرات مرتب کئے، اور اسلامی تاریخ میں مختلف زبانوں کی مختلف علوم و فنون کی کتابوں کو عربی زبان میں ترجمے کا وہ بیش بہا کارنامہ انجام دیا جس کی مثال ہمیں عباسی دور کے بیت الحکمة میں ملتی ہے مگر جب عباس اول (۸) جانشین ہوا تو اس نے اس مدرسہ کو بند کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ پہلے مرحلے میں مدرسہ کے شعبۂ فقہہ کو معطل کیا اور ۱۲۶۵ھ کے آخری مہینہ (اکتوبر ۱۸۴۹) میں اس نے یہ حکم جاری کیا کہ مدرسة الألسن کو مرکزی عمارت سے ہٹا کر کے ناصریہ کے مدرسة المبتديان میں منتقل کر دیا جائے، اس سے مدرسہ اپنے مرکزی عمارت سے محروم ہو گیا اور نئی عمارت اس کے لئے تنگ ہو گئی یہاں تک کہ مجبور ہو کر پھر بولاق کے المهندس خانة میں دوبارہ منتقل کیا گیا پھر چند ہی دنوں کے بعد محرم ۱۲۶۶ھ / نومبر ۱۸۴۹ء میں مدرسۃ الألسن کو بالکل بند کر دیا گیا اور اس کے طلبہ تجہیز یہ میں ضم کر دیئے گئے چونکہ عباس اول کے رفاعہ طہطاوی سے بڑے اختلافات تھے اس لئے ۱۲۶۶ھ کے اواخر میں رفاعہ نے خرطوم کی راہ لی اور وہاں مدرسہ ابتدائیہ کے مدرس اور نگراں مقرر ہو گئے۔

قلم الترجمه چند ہی مہینوں میں جبکہ ابراہیم پاشا اس کے نگراں مقرر ہوئے ایک نئے تجربہ کا شکار ہوا اور از سر نو اس کے دو ڈسک بنے۔

۱۔ ترکی ترجمہ کا قلم جس کے نگراں کانی بک تھے۔

۲۔ عربی ترجمے کا قلم جس کے نگراں رفاعہ بک تھے، مگر ڈاکٹر عزت عبدالکریم کا یہ تبصرہ اپنی جگہ پر درست ہے کہ نومبر ۱۹۴۹ء میں مدرسۃ الألسن کی معطلی نے قلم الترجمة اور اس کے افراد پر برے اثرات چھوڑے، اب اسے حکومت کی وہ سرپرستی حاصل نہیں رہی جو اسے پہلے حاصل تھی۔ اسی طرح رفاعہ بک اس کا وہ مقام اور اس کی وہ حیثیت باقی نہ رکھ سکے جو پہلے مسلم چلی آرہی تھے اور جب رفاعہ طہطاوی خرطوم چلے گئے تو یہ ادارہ دھیرے دھیرے غیر مؤثر ہو گیا اور اس کے افراد منتشر ہو گئے۔ (۹)

محمد علی کے زمانے میں عربی و ترکی زبانوں میں مختلف علوم و فنون پر مشتمل کتابوں کے ترجمے کی جو تحریک چلی اس میں زیادہ تر کتابیں فرانسیسی زبان میں اور فرانسیسی مصنفین کی تحریر کردہ تھیں۔ یہ کتابیں یا تو مصری اسکولوں میں کارفرما غیر ملکی تدریسی انجمنوں میں سے کسی کی تیار کردہ ہوتی تھیں یا سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں یورپ کے

کار فرما غیر ملکی تدریسی انجمنوں میں سے کسی کی تیار کردہ ہوتی تھیں یا سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں یوروپ کے کسی بڑے اہم مصنف کی مرتب کردہ ہوتی تھیں، یہاں بطور مثال ان چند کتابوں کی تفصیل دی جارہی ہے جو اس زریں دور میں ترجمہ ہو کر مصر سے شائع ہوئیں :

۱۔ قواعد الأصول الطبية ، مصنف فاخر انشکو فافا، استاد پیز ایونیورسٹی، بولاق سے ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶۔۷ ۱۸۲ء میں طبع ہوئی۔

۲۔ منتهى الأغراض فى علم شفاء الأمراض ، مصنف بروسیہ اور سانسون (اسوقت کے فرانس کے بڑے طبیب) عربی ترجمہ یوحنا عنحوری ، بولاق سے ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء۔ ۱۸۳۵ء میں یہ کتاب شائع ہوئی۔

۳۔ ضياء النيرين فى مداواة العينين ، مصنف مشہور انگریز ڈاکٹر لورانس، عربی مترجم احمد حسن الرشیدی یہ کتاب بھی بولاق پریس سے ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۱ء میں شائع ہوئی۔

۴۔ أصول الهندسة ، مصنف لوجاندر، ترکی مترجم محمد عصمت آفندی ، بولاق سے ۱۲۵۵ھ / ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ قترينة تاريخى ، مصنف کاسترا، ترکی مترجم جاکو فاکی ارجیر اور بولو، یہ کتاب ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء میں بولاق سے شائع ہوئی۔

۶۔ تاريخ نابليون ، یہ نپولین کی وہ خود نوشت ہے جو اس نے سانت ہیلانہ میں جلاوطنی کی حالت میں لکھی تھی یہ کتاب فرانسیسی سے ترکی میں ترجمہ ہو کر بولاق سے ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۲ء میں شائع ہوئی۔

۷۔ تاريخ نابليون بونا برته ، مصنف دوق دی روفیجو ، ترکی میں اس کا ترجمہ حسن آفندی نے کیا، یہ کتاب ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء میں مطبع سراى الاسكندرية سے طبع ہوئی۔

۸۔ تاريخ دولة ايطاليا ، مصنف بوتا، اس کا فرانسیسی سے ترکی میں ترجمہ عبد الله آفندی نے کیا ، یہ کتاب مطبع سراى الاسكندرية سے ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء میں طبع ہوئی۔

۹۔ مطلع شموس السير فى وقائع كرلوس الثانى عشر ، مصنف والٹیر، فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ مدرسۃ الألسن کے ایک فارغ التحصیل محمد آفندی مصطفى البياع نے کیا، یہ کتاب بولاق پریس سے ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۲ء میں شائع ہوئی۔

الطہطاوی نے کیا، یہ کتاب بولاق پریس سے ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں طبع ہوئی۔

۱۱۔ أتحاف الملوک الالبابتقد الجمعیات فی أوربا ، مصنف انگریز مؤرخ رابرٹ سن ، فرانسیسی سے عربی مین ترجمہ خلیفہ آفندی محمود (مدرسة الألسن کے ایک فارغ التحصیل) نے کیا یہ کتاب بولاق سے ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں طبع ہوئی۔

۱۲۔ أتحاف ملوک الزمان بتاریخ الامبرا طور شار لکان ، مصنف ولیم رابرٹ سن ، فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ خلیفہ محمود نے کیا۔ یہ کتاب بولاق سے ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰ء میں طبع ہوئی۔

۱۳۔ الدراسة الأولیة فی الجغرافیة الطبیعیة ، مصنف مسیو فلیکس لامروس ، فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ احمد حسن الرشیدی نے کیا۔ یہ کتاب بولاق سے ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۹ء میں طبع ہوئی۔

۱۴۔ الجغرافیة العمومیة ، مصنف مطبرون ، فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ رفاعہ رافع الطہطاوی نے کیا۔ یہ کتاب بولاق سے تقریباً ۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۵ء اور ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء میں طبع ہوئی۔

۱۵۔ تنویرالمشرق بعلم المنطق ، مصنف دی مرسیة ، فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ خلیفہ محمود نے کیا۔ یہ کتاب بولاق پریس سے ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۹ء میں طبع ہوئی۔(۱۰)

درج بالا کتابوں کی فہرست کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں جن کتابوں کے ترجمے ہوئے ان کا تعلق طب، انجینئرنگ، سائنس، تاریخ عالم وغیرہ مختلف اور متنوع میدانوں سے تھا۔

تحریک ترجمہ اور اس کے اثرات

مصر میں عربی زبان وادب کی جدید تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اس بیداری اور نشأۃ میں محمد علی کی تحریک ترجمہ کا بڑا زبردست کردار رہا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ مصر میں عثمانی دور کے اواخر میں عربی زبان وادب کے بڑے علماء اور افاضل گزرے جنہوں نے بیش قیمت خدمات انجام دیں اسی دور میں سید مرتضیٰ الزبیدی (۱۱) کی مشہور زمانہ قاموس تاج العروس منظر عام پر آئی۔ اسی دور میں بعض علمائے ازہر نے بھی نثر اور شعر کے دونوں میدانوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے جیسے شیخ الشبراوی (۱۲) اور شیخ اسماعیل الخشاب (۱۳)۔ شیخ عطار (۱۴) کا کارنامہ بھی اہم ہے اسی طرح مؤرخ الجبرتی (۱۵) کی خدمات کسی طرح فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ مگر یہ سب انفرادی کوششیں تھیں اور عربی زبان وادب کے احیاء میں ان کے وہ اثرات مرتب نہ ہو سکتے تھے، جو محمد علی کی تحریک ترجمہ کے پڑے۔ ترجمہ کی اس تحریک نے مختلف مشرقی

اور مغربی زبانوں میں معجم اور قاموس کے انبار لگا دیئے۔ اطالوی، فرانسیسی، فارسی اور ترکی زبانوں کی معروف اور بیش قیمت ڈکشنریاں عربی زبان میں منتقل ہوئیں اور جدید یوروپی علوم اور ان کے الفاظ و اصطلاحات نے عربی زبان کو بڑا مالدار اور گراں قدر بنادیا۔ پھر یہیں سے عربی زبان کی قدیم ڈکشنریوں اور معاجم و قوامیس کی تحقیق و تنقیح اور نظر ثانی اور طباعت کی تحریک بھی شروع ہوئی مثال کے طور پر القاموس المحیط پر بطور خاص کام کیا گیا۔ یہ قاموس پہلے کلکتہ اور قاہرہ سے طبع ہو چکی تھی، انگریزی زبان میں مسٹر لین نے اس کا ترجمہ کیا مگر اس کے ترجمہ کی صحت اور استنادی حیثیت کو پرکھنے کے لئے متعدد قدیم عربی ڈکشنریوں کی طرف رجوع کیا گیا جیسے ابن درید (۱۶) کی الجمہرۃ، محمد الازہری (۱۷) کی التہذیب، الجوہری (۱۸) کی الصحاح، ابن سیدہ (۱۹) کی المحکم، زمخشری (۲۰) کی کتاب الأساس، ابن منظور (۲۱) کی لسان العرب، التنوخی (۲۲) کی تہذیب التہذیب، اور الفیومی (۲۳) کی المصباح وغیرہ۔

محمد علی کی تحریک ترجمہ کے جو اثرات مصری معاشرہ پر مرتب ہوئے انہیں علمائے ازہر نے محدود تر کرنے کی پوری کوشش کی۔ ازہر کے طلبہ اور علماء عام طور سے شرعی علوم کے علمبردار تھے اور نہ صرف یہ کہ انہیں جدید علوم اور اس کی کتابوں کے ترجمہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی بلکہ اس پوری تحریک کے ناقد اور مخالف تھے، انہوں نے جدت کاری کی اس مہم کی عام طور پر مخالفت کی یوروپ میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ اور اساتذہ کے تئیں ان کا رویہ عام طور پر مخالفانہ تھا اور وہ ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ طلبہ اور محققین اس پرندے کی طرح تھے جو پرواز سے تو ناواقف ہے مگر رہ رہ کر اپنی رفتار پر اترا رہا ہے،۔ علمائے ازہر کی اس مخالفت کے پیچھے دین اسلامی سے عقیدت اور حمیت کا جذبہ کم کار فرما تھا صحیح بات یہ ہے کہ جامد فکر اور قدیم سوچ کی تنگ نائیوں میں وہ محصور تھے انہیں قدیم کی حفاظت کی زیادہ فکر تھی اور جدید کی طرف سے بالکل بے پرواہ اور شک وشبہہ میں مبتلا تھے۔ مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن نے اپنے دوست جولمول کو مصر میں محمد علی کی کوششوں کے تعلق سے جو تحریریں لکھی ہیں ان سے علمائے ازہر کے رویہ پر ٹھیک ٹھیک روشنی پڑتی ہے وہ کہتا ہے:

> "میرے دوست تم سمجھتے ہو گے کہ ازہر کے علماء اور شیوخ ہماری ترجمہ شدہ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوں گے، نہیں ہرگز نہیں یہ تو اس سے بہت دور رہتے ہیں۔ یہ بڑا آسان ہے کہ انسان کچھ سننے سے پہلے ہی الزام لگادے۔ ہم نے یہ کتابیں ان کی نگاہ میں اسی جذبے سے لکھی ہیں جو تورات وانجیل میں کار فرما ہیں مگر یہ شیوخ ہمیشہ ان کتابوں پر گفتگو کرتے ہیں مگر ان میں کوئی ایسا

تورات وانجیل میں کار فرما ہیں مگر یہ شیوخ ہمیشہ ان کتابوں پر گفتگو کرتے ہیں مگر ان میں کوئی ایسا نہیں ہے جس نے ان کی ایک سطر بھی پڑھی ہو"۔

ڈاکٹر براؤن بیان کرتا ہے کہ ایک بار وہ شیخ جوہری کے یہاں دعوت میں شریک تھا اس صحبت میں ان کے دوست اور استاد شیخ محمد عمر تونسی بھی تھے دستر خوان پر علمائے ازہر کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اس محفل میں ڈاکٹر براؤن اور شیوخ ازہر کے درمیان جدید علوم کی ترجمہ شدہ کتابوں پر جملے بازیاں ہوئیں جنہیں اس نے دلچسپ انداز میں نقل کیا ہے۔ وہ کہتا ہے :

"عشائیہ کے بعد قہوے کا دور چلا ہم نے اسکولوں مدارس اور ان کی تعلیم پر گفتگو شروع کی شیخ تونسی نے ان کتابوں کے سلسلے میں اپنی بعض آراء کا اظہار کیا جنہیں وہ میڈیکل کالج میں دیکھتے رہے ہیں۔ مجھ سے وہاں موجود ایک شیخ نے یوروپ میں کیمیا کے بارے میں موجود تصرف اور اس کی ماہیت سے آگاہی حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی کیونکہ وہ کیمیا سے بس یہی سمجھتے ہیں کہ یہ معدنیات سے سونے میں تبدیلی کرنے کا ایک فن ہے میں نے انہیں کیمیا کے بارے میں مختصر طور پر کچھ باتیں بتائیں۔ وہاں موجود ایک عالم نے یکایک اچک کر کہا : تقوی اور طہارت کے لئے آخر ان دنیوی علوم کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ خوف خدا پیدا کرنے کے لئے ان کا کیا فائدہ ہے، انسان پر بس اتنا ہی واجب ہے۔ گویا یہ شیخ ان جملوں کے ذریعے اپنی دین داری کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور اپنی پاکباز اور خداترس شخصیت کو نمایاں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ چیز پسند نہ آئی چنانچہ میں نے اس سے پوچھا آپ ان باتوں سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے آپ محفل میں موجود ان علماء کی توہین کیوں کرتے ہیں۔ آپ ان تمام علماء کی خدمات پر پانی پھیرنا چاہتے ہیں جن پر ہمیشہ سے اسلام کو ناز رہا ہے ؟ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ دین کے علاوہ دوسرے علوم کو پڑھنا بے سود اور بے فائدہ کام ہے ؟ تب تو قدیم عرب شعراء اور جاہلیت کے اخبار و حالات کا مطالعہ بھی بے فائدہ بلکہ خطرناک ہوگا۔ میں آپ کی تعریف و توصیف ہی کر سکتا ہوں کیونکہ آپ پہلے آدمی ہیں جو جہالت کی مدح سرائی کر رہے ہیں بلکہ آپ بھی جاہلیت ہی کے ایک طالب علم معلوم ہوتے ہیں ؟ کیا آپ کو پتہ ہے کہ اللہ کیا ہے ؟ کیا اللہ کا علم تمام تر معرفت پر مبنی نہیں ہے کیا آپ براہ کرم یہ بتا سکتے ہیں کہ روحانی لذتوں سے کون زیادہ قریب تر ہوگا جاہل یا عالم ؟ اس پر شیخ نے جواب دیا : "مگر انسانی و عمرانیاتی علوم

خالق کی خلقت کے اقرار واعتراف پر مجبور کرتا ہے وہ عقل انسانی اور عجائبات عالم کی عظمت سے واقف ہوتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ علمائے اسلام نے تفسیر قرآن میں مدد حاصل کرنے کے لئے جاہلی شعراء کے مطالعے میں کمال حاصل کر کے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے ؟ اگر ہمارے ان علماء نے آپ کا رویہ اپنایا ہوتا اور آپ کی سوچ پر عمل کیا ہوتا تو آج آپ میں سے کون فہم قرآن پر قادر ہوتا، وہ نامور عالم جو ہمارے محترم میزبان کا نام رکھتے تھے اور جنہوں نے کم سے کم دس سال صحرائی عرب قبائل کے درمیان صرف اس لئے گزارے کہ عربی زبان کے مفرد الفاظ جمع کر سکیں اور معروف عالم قاموس الصحاح کی تکمیل کر سکیں یعنی علامہ الجوہری، تو کیا وہ پاگل تھے ؟ یا وہ غیر مسلم تھے ؟ یا ان کا ایمان پختہ نہ تھا ؟ پھر براؤن نے وہاں موجود تمام علماء کو خطاب کرتے ہوئے کہا :

"میرے محترم علماء میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اس عالم دین کے خوف خدا اور خشیت الٰہی کی پیروی کرو پھر تم اسلام کے زوال کی رفتار کو کافی تیز کر سکو گے۔ جہالت کی تعریف معاشرتی پسماندگی کی خطرناک نشانی ہے"۔ (۲۴)

ہو سکتا ہے ڈاکٹر براؤن نے علمائے ازہر کے جامد رویہ کی تصویر کشی میں مبالغے سے کام لیا ہو مگر اس سے علماء کی مجموعی صورت حال کا کچھ نہ کچھ ضرور اندازہ ہو جاتا ہے مگر اس حقیقت کا انکار کرنا مشکل ہے کہ اس معاندانہ رویہ کے باوجود مصر میں جدید علوم کی تحصیل کی لہر چل پڑی اور آگے چل کر خود ازہری طلبہ اور علماء نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

مصری صحافت اور اس کے مختلف رجحانات

محمد علی پاشا کی تحریک تعلیم و ترجمہ کے نتیجے میں مصر میں عربی صحافت کی جدید تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سے پہلے نپولین نے اپنے دور تسلط میں دو اخبار فرانسیسی زبان میں ۱۷۹۸ء میں نکالے تھے اس نے التنبیہ کے نام سے ایک عربی جریدہ بھی نکالنے کا ارادہ کیا تھا مگر یہ جریدہ مختلف اسباب کیوجہ سے منظر عام پر نہ آسکا۔ محمد علی نے ملکی حالات سے باخبر رہنے کے لئے دیوان الجورنال کے نام سے ایک دفتر قائم کیا اور اس دفتر سے ۱۸۲۷ء میں پہلی بار یہ دیوان الجورنال ترکی اور عربی دو زبانوں میں اخبار کی طرح شائع ہوا۔ اس جرنل کو عوامی بنانے کے لئے اس نے عربی زبان میں ایک اخبار شائع کرنے کا ارادہ کیا جس کا نام اس نے الوقائع المصریة رکھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۳ر دسمبر ۱۸۲۸ء (۱۵ر رجب ۱۲۴۴ھ) کو شائع ہوا۔ یہ عربی زبان کا پہلا باقاعدہ صحیفہ تھا۔ ۱۸۴۱ء میں جب اس کی ادارت رفاعہ رافع الطہطاوی کے ہاتھوں میں منتقل ہوئی تو یہ اخبار اپنی طفولیت کے دور سے نکل کر شباب کے دور میں داخل ہو گیا اور ایک گزٹ یا خبر

کے ہاتھوں میں منتقل ہوئی تو یہ اخبار اپنی طفولیت کے دور سے نکل کر شباب کے دور میں داخل ہو گیا اور ایک گزٹ یا خبر نامہ کی سطح سے اوپر اٹھ کر یہ اخبار بین الاقوامی حالات اور مضامین اور ادبی شہہ پاروں پر مشتمل ایک نہایت قابل قدر اخبار کی حیثیت اختیار کر گیا۔ محمد علی کے بعد ملک میں متعدد اخبار نکلنا شروع ہوئے مثال کے طور پر عباس پاشا نے اپنے زمانے میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے السلطنۃ کے نام سے اسکندر شہلوب کی ادارت میں نکالا۔ اسی طرح سعید پاشا نے ۱۸۶۵ء میں محمد علی الحکیم (۲۵) اور ابراہیم الدسوقی (۲۶) کی ادارت میں ایک طبّی رسالہ یعسوب الطب کے نام سے جاری کیا۔ ۱۸۶۶ء میں شیخ حسن الطّویل (۲۷) کی ادارت میں اسماعیل پاشا نے ایک فوجی اخبار ارکان الجیش المصری کے نام سے نکالا۔ اسی زمانے میں ۱۸۷۰ء میں ایک پندرہ روزہ مجلّہ روضۃ المدارس بھی نکلنا شروع ہوا اور اس کے بعد مصر میں اخبارات و جرائد مختلف ادبی، ثقافتی اور سیاسی رجحانات کی علمبرداری کرتے ہوئے بڑی تعداد میں نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے مصر کی قومی زندگی کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے لگے۔

ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ نے مصر کی قومی صحافت کو تین مراحل میں تقسیم کیا ہے اور ہر مرحلہ کو ایک مخصوص رجحان کا نام دیا ہے۔ ان کے مطابق صحافت کے اولین مکتب فکر کے علمبردار رفاعہ رافع الطہطاوی، عبداللہ ابوالسعود (۲۸) اور میخائیل عبدالسید وغیرہ صحافی تھے۔ دوسرے رجحان کے علمبرداروں میں انہوں نے ادیب اسحاق (۲۹)، محمد عبدہ (۳۰)، عبداللہ الندیم (۳۱)، ابراہیم المویلحی (۳۲) اور بشارۃ تقلا (۳۳) صاحب الاہرام کو شامل کیا ہے۔ تیسرے صحافتی رجحان کے حاملین میں انہوں نے علی یوسف (۳۴)، مصطفیٰ کامل (۳۵)، احمد لطفی السید اور عبدالعزیز جاویش (۳۶) کو گنایا ہے۔

پہلا رجحان دراصل ادبی و ثقافتی رجحان ہے جس میں مسجع و مقفع عبارتوں کا استعمال ہے اور عربی نثر عبارت آرائی سے مزین ہے جب کہ دوسرے رجحان میں ہمیں موروثی اسلوب اور نثری ادب کی بندشوں سے کسی قدر آزادی نظر آتی ہے صحافیوں کا یہ طبقہ اخباری اسلوب اور طرز ادا کی تشکیل پر کسی قدر قادر دکھائی دیتا ہے مگر اس طبقے کی تحریروں میں بھی ادب اور اخبار کے تقاضوں کے درمیان موجود واضح فرق کو بہت زیادہ قائم نہیں رکھا جا سکا ہے۔ اس طبقے کی نمایاں نمائندگی ابراہیم المویلحی نے کی ہے۔ تیسرا رجحان اخباری و صحافتی رجحان ہے اس رجحان کے علمبردار اشعار و امثال، الفاظ کے حسن انتخاب اور عبارت کی فصاحت و بلاغت وغیرہ لفظی تقاضوں سے اپنی توجہ ہٹا کر صحافیانہ رنگ و آہنگ کے حامل بن گئے اسی رجحان نے بیرونی استعمار کے خلاف پورے ملک میں شدید ترین مزاحمت پیدا کی، حب الوطن، حمیت قومی اور جذبہ آزادی سے بے قرار اور سرشار ہو کر یہ صحافی قومی جنگ آزادی کا ہراول دستہ بن گئے۔ یہ

طبقہ سیاست کے پر شور اسلوب کا علمبردار بن کر برطانوی استعمار کے خلاف قلمی جہاد کا نعرہ لے کر میدان میں کودا اور صحافت اور مقالہ نگاری کے نئے طرز و اسلوب، متنوع مضامین و مباحث اور جدید افکار و نظریات سے عوام کو روشناس کرایا۔ اس طبقہ کی تحریروں میں تنقید و محاسبہ کی گھن گرج بھی ہے، ظلم و استحصال کے خلاف اشتعال انگیزی بھی ہے اور قومی و سیاسی بیداری کے تقاضے بھی اس کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔

مصر کے اہم سیاسی مسائل

محمد علی پاشا کے دور میں مصر میں جو سیاسی تعلیمی اور قومی بیداری رونما ہوئی وہ اس کے انتقال کے بعد اس وقت شعلۂ جوالہ بن گئی جب ملک میں انگریزی احتلال کے خلاف عوامی بے چینی کی قیادت احمد عرابی پاشا کے ہاتھ میں آئی۔ اس نوجوان نے ملک میں انگریزی استعمار کے خلاف جو شورش برپا کی اس نے ملک کی سیاسی بیداری میں اہم کردار ادا کیا اور آگے چل کر قومی تحریک آزادی کے لئے اہم ترین بنیاد ثابت ہوا۔

عرابی انقلاب

احمد عرابی ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء میں زیرین علاقۂ مصر (ریف) میں مقامی کاشتکاروں کے ایک گھرانے میں پیدا ہوا، سعید پاشا خدیو مصر کے عہد میں فوجی خدمات انجام دیں تو درجہ بدرجہ ترقی کرتے ہوئے ۱۸۶۲ء میں فوج کا ایک افسر بن گیا۔ ۱۸۷۵ء میں اسماعیل پاشا نے حبش پر حملے کا آغاز کیا۔ اس مہم میں احمد عرابی کو شعبۂ نقل و حرکت کا انتظام تفویض ہوا، لیکن بد دیانتی کے شبہے میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس موقع پر وہ ایک خفیہ انجمن میں جس کا قائد و منتظم علی روبی تھا، شامل ہو گیا۔ اس انجمن کا مقصد ترکی اور سرکیشیا کے بڑے بڑے عہدے داروں کی مخالفت کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس نے جامعۂ ازہر میں تحصیل علم کا سلسلہ جاری رکھا۔ جس سے اس کی فطری صلاحیتوں اور پیدائشی قوت خطابت کو بہت تقویت پہنچی اور وہ ایک زبردست اور نامور خطیب کی حیثیت سے مشہور ہوا اس کی خطابت سے لوگ متأثر ہونے لگے۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ قومیت کے جذبات جو خدیو محمد علی کے عہد میں متوسط طبقے کے مقامی لوگوں میں پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے، بھڑک اٹھے۔ وجہ یہ تھی کہ لوگ خدیو اسماعیل کے عائد کردہ بھاری محصولوں سے عاجز آ چکے تھے، غرباء کو تو انہوں نے پیس کر رکھ دیا تھا، دوسری طرف ملک کے امور مالیہ کا انصرام انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا، چنانچہ ۱۸۷۷ء میں پہلی مرتبہ ملک کے محب وطن اخبارات نے "مصر مصریوں کے لئے" کا نعرہ

بلند کیااور حکومت اور حکومت کے افعال پر کڑی نکتہ چینی شروع کر دی۔ احمد عرابی کو المصری کا خطاب اسی زمانے میں دیا گیا۔ وہ تمام فوجی افسر جن کے مشاہرے اقتصادی تدبیر کے ماتحت نصف کر دیئے گئے تھے، "جمعیت ضابطان" میں شامل ہو گئے اور یہی جمعیت قومی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے پہلا قدم بن گئی، وزراء کی کونسل نے (جس میں انگریز Riverowilsen (مالیات) اور فرانسیسی De Bligneres (رفاہ عامہ) شامل تھے اور جس کا صدر نوبار پاشا تھا، خارجی ممالک کے دباؤ میں آکر فیصلہ کر دیا کہ جن مظاہروں کا فروری ۱۸۷۹ء میں قلع قمع کیا گیا تھا، ان سب کا سرغنہ احمد عرابی تھا مگر بعد میں یہ حقیقت بے نقاب ہو گئی کہ ان تمام حوادث میں عرابی پاشا کو اسماعیل پاشا نے جو مغربی اقتدار سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا، اپنا آلۂ کار بنایا تھا، دراصل واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ مظاہروں کی کامیابی پر اسے قصر خدیوی کی طرف سے ایک غلام عطا ہوا تھا، نیز ترقی دے کر اسے ایک رجمنٹ کا کمانڈر بنا دیا گیا تھا۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں نے جب بالتصریح اسماعیل پاشا کی علیحدگی پر اصرار کیا تو (سلطان ترکی) عبدالحمید ثانی نے اس کے بیٹے توفیق پاشا کی جگہ اس کے چچا محمد علی کے سب سے چھوٹے فرزند حلیم پاشا کو خدیو مصر مقرر کر دیا۔ عبد الحمید کا مقصد یہ تھا کہ اسماعیل پاشا نے جو حد سے زیادہ رعایتیں سلطان عبدالحمید سے حاصل کر لیں تھیں، انہیں واپس لے لے۔ جب وزراء کی کونسل نے اس مسئلے پر غور کیا تو ان کی اپنی مجلس منعقدہ ۶/رجب ۱۲۹۶ھ کے منضبط وقائع میں لکھا گیا کہ "اگرچہ ۱۲۵۷ھ کے فرمان کے مطابق حلیم پاشا نرینہ اولاد میں عمر کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے، تاہم ریاستوں اور خود مصریوں کا رجحان توفیق پاشا کی طرف ہے اور ہمارا اصل مقصد قانون سلطنت کا تحفظ ہے"..... چنانچہ اسی دن توفیق پاشا کو وزیر اعظم سے خدیو بنا دیا گیا، اور خدیو سابق کو اس تقرر کی اطلاع دینے کے لئے دو تار بھیج دیئے گئے (۲۶/جون ۱۸۶۹ء) لیکن عبدالحمید ثانی نے حلیم پاشا کے منصب خدیوی پر تقرر سے متعلق اپنے ارادے میں کوئی تبدیلی نہ کی اور ان تمام مجالس میں جو اس کے بہت بعد منعقد ہوئیں، اس نے عرابی کو اس کام کے لئے استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا۔

جب سلطان کے اخراجات گھٹانے کی مزید ضرورت محسوس ہوئی تو افسروں کے ایک اور گروہ کو معطل کر دیا گیا جس سے فوج کی بے چینی میں مزید اضافہ ہوا، اور رجمنٹ نمبر ۴ کے افسر عرابی، رجمنٹ نمبر اول کے افسر علی اور ایک اور کرنل نے وزراء کی کونسل میں افسران فوج کی ترقیوں کے بارے میں اس مسودۂ قانون کے خلاف جسے وزیر جنگ (عثمان رفقی پاشا جو سرکیشیا کا رہنے والا تھا) ایک احتجاجی عرضداشت پیش کی۔ ان کا یہ فعل فوجی قانون کے خلاف قرار دیا گیا اور انہیں ریاض پاشا نے کورٹ مارشل کرنے کے لئے فوراً زیر حراست کر لیا۔ لیکن وہ اپنی رجمنٹوں کی مداخلت کی

وجہ سے بچ گئے۔ عرابی نے فوراً باغی دستوں کی کمان سنبھال لی۔ قصر عابدین پر ہلّہ بول دیا اور وزیر جنگ کی معزولی کا مطالبہ کیا۔ توفیق پاشا مجبور ہو گیا کہ محمود سمیع پاشا البارودی کو جو پس پردہ قوم پرستوں کی تحریک چلانے والوں میں سے تھا وزارت حربیہ پر مامور کرے۔ لیکن چند ہی ماہ بعد اس نے وزیر اعظم ترکی ریاض پاشا کے ساتھ مل کر اپنا وار کیا، یعنی محمود سمیع پاشا کو بر طرف کر کے اس کی جگہ اپنے ایک رشتہ دار داؤد فتحی پاشا کو وزیر حرب مقرر کر دیا اور ساتھ ہی چند رجمنٹوں کو قاہرہ سے بھیج دینے کی کوشش کی۔ اس پر محبّ وطن گروہ نے (۹ر ستمبر ۱۸۸۱ء کو) قصر عابدین کے سامنے ایک عظیم مظاہرہ کیا۔

خدیو کو اس کی اطلاع قبل از وقت مل چکی تھی اور اگرچہ وہ انگریز اور فرانسیسی قونصلوں کے ایما پر "باب عالی" میں ایک عرضداشت بذریعۂ تار اس مضمون کی نقل بھیج چکا تھا کہ مظاہرے کے دن بیس بٹالین فوج بھیج دی جائے، تاہم اس نے باغیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے، شریف پاشا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا تاکہ وہ نوّاب (Deputies) کی اسمبلی قائم کرے اور آئینی حکومت بنانے کی طرح ڈالے؛ اسی دن اس نے باب عالی کو تار بھیجا کہ اب فوج بھیجنے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور ساتھ ہی اپنے چچا حلیم پاشا کی سازشوں کی شکایت بھی کر دی۔

اس معاہدے کے پیش نظر عرابی اور اس کے دوستوں نے اپنی اپنی رجمنٹوں کے ساتھ قاہرہ کو چھوڑ دیا، لیکن قاہرہ کو چھوڑتے وقت عرابی نے ایک زبردست شعلہ بار تقریر کی۔ اصل اقتدار ہنوز عہدے داروں کی مجلس کے ہاتھ میں تھا۔ لہٰذا ۱۸۸۲ء کے آغاز میں مجلس وزراء نے اس امید پر کہ اپنے اقتدار کو کس طرح بحال رکھے، عرابی کو وزارت جنگ کا رکن مقرر کر دیا۔ اس سے دس روز قبل (۲۶ر دسمبر ۱۸۸۱ء) "دار النوّاب" کا افتتاح عمل میں آچکا تھا، لیکن بیرونی مقتدرین اس یقین دہانی کے باوجود کی ان کی مالی داد و ستد میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی جائے گی۔ اسمبلی کو بحث پر بحث کی اجازت دینے پر رضامند نہ ہوئے۔ اس سے وطن پرستوں میں بڑا غیظ و غضب پیدا ہوا۔ اور شریف حسین کی کابینہ ختم ہو گئی اور اس کی جگہ محمود سمیع پاشا کی کابینہ قائم ہو گئی۔ ۴ر فروری ۱۸۸۲ء کو بریگیڈیئر (صاحب اللواء) کا مرتبہ حاصل کر کے (عرابی) وزیر حرب ہو گیا۔ خدیو نے مصری وکیل متعینہ باب عالی کے توسط سے ایک بار پھر (باب عالی) سے درخواست کی کہ "حالات کی شدت اس نقطے سے گزر چکی ہے جہاں فقط پند و نصائح سے کام نکل سکتا ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اس فتنے کو زبردست قوت سے دبا دیا جائے" چنانچہ اس نے فوج بھیجنے کی ایک بار پھر درخواست کی؛ لیکن سلطان کے دل میں ایسا قدم اٹھانے کے بارے میں کچھ خدشات و وساوس تھے اور اس بات میں وزراء کی کونسل نے بھی اس سے اتفاق کیا اور اعلان کیا کہ حالات افواج کو بھیجنے کے لئے سازگار نہیں" اس اثنا میں سمیع

اور عرابی فوج کو از سر نو مرتب و منظم کر چکے تھے اور تقویت دے چکے تھے اور انہوں نے اپنے طرف داروں میں سے ۶۰۰ افسروں کو ترقی بھی دے چکے تھے جن میں ۵ بریگیڈیئر، ۲۹ کرنل اور قائم مقام تھے۔ انہوں نے ترکی اور چرکسی افسروں کو سوڈان کی مہم پر مہدی سوڈان کے استیصال کے لئے بھیجنا چاہا، جس نے اس وقت مصری حکومت کو ستانا شروع کر دیا تھا۔ اس کے تھوڑے دن بعد ان افسروں میں سے ۴۰ افسروں کے ایک جتھے کو جن میں سابق وزیر عثمان رفقی بھی شامل تھا زیر حراست کر لیا گیا۔ اور اس غدر لنگ پر ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا کہ انہوں نے عرابی پاشا کو قتل کرنے کی سازش کی ہے (۱۱ر اپریل)۔

ایک خفیہ اجلاس میں فوجی عدالت نے انہیں مجرم ٹھہرایا اور جرم کی پاداش میں ان سے ان کے منصب اور تمغے سلب کر لئے اور حکم دیا کہ وہ سوڈان کی طرف جلاوطن کر دیئے جائیں۔ ملزموں کی درخواست پر "باب عالی" نے اس معاملے میں مداخلت کی جس کی وجہ سے خدیو نے فوجی عدالت کے فیصلے میں یہ ترمیم کر دی کہ ان کے منصب اور تمغے بحال رکھے جائیں لیکن انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔ اس پر وزراء کی کونسل نے خدیو سے قطع تعلق کر لیا۔ اسمبلی کے نواب کا اجلاس طلب کیا اور توفیق پاشا کو تخت سے معزول کرنے کی کوشش کی۔ قونصلوں نے اراکین حکومت سے اپنے تعلقات منقطع کر لئے تو استانبول نے موقع کو غنیمت جان کر محمود سمیع کی کابینہ سے براہ راست تعلقات قائم کرنا مناسب سمجھا۔ اس وقت محمود سمیع اور عرابی نے چاہا کہ توفیق پاشا کو خدیو کے منصب سے معزول کر کے اس کی جگہ حلیم پاشا کو مسند خدیوی پر بٹھا دیا جائے، لیکن وزراء کی کونسل نے اس بہانے کی آڑ میں کہ "محبان وطن" اپنی اغراض کے لئے حلیم پاشا کو آلۂ کار بنائیں گے، توفیق پاشا ہی کو مسند حکومت پر بحال رکھنے کا فیصلہ کیا (۱۴ر رجب ۱۲۹۹ھ / ۲۰ر مئی ۱۸۹۸ء)۔ اس پر وزیر اعظم (ترکی) نے بذریعہ تار وزیر اعلیٰ مصر کو حکم دیا کہ خدیو اطاعت کرے اور اس نے از سر نو توفیق پاشا سے روابط استوار کر لئے۔ اس موقع پر انگلستان اور فرانس نے خدیو کی حیثیت مضبوط کرنے کی غرض سے ۲۰ر مئی کو اسکندریہ میں بحری جہازوں کا ایک بیڑا بھیج دیا اور قونصلوں کے توسط سے مطالبہ کیا کہ عرابی پاشا، فہمی پاشا اور اسی قسم کے دوسرے محب وطن رہنماؤں کو قاہرہ سے جلاوطن کیا جائے اور شریف پاشا کی زیر سرکردگی وزرا کی جدید کونسل مرتب کی جائے۔ اس پر سمیع پاشا مستعفی ہو گئے۔ لیکن اسکندریہ اور قاہرہ کے افسروں کی دھمکیوں اور علماء اور اکابر کے اس مطالبے سے دب کر کہ عرابی پاشا کو بحال کیا جائے خدیو شریف پاشا کی کابینہ کو نامزد نہ کر سکا اور اس نے استانبول سے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے کا مطالبہ کیا۔ ابھی کمیشن کی آمد کا انتظار ہی تھا کہ اس نے ۲۹ر مئی کو عرابی کو وزارت جنگ پر بحال کر دیا جو بظاہر اس وقت حکومت کا واحد نمائندہ تھا۔ عرابی نے فی الفور دول خارجہ کی مداخلت کا امکان دیکھ کر

اسکندریہ کے دفاع کے لئے توپیں نصب کردیں۔ یہ عذر کرکے کہ بندرگاہ میں متعین بحری بیڑے کو خطرہ ہے، انگریزی امیر البحر سر بوشامپ سیمور (Sir Beauchamp Seymore) نے صدائے احتجاج بلند کی اور آناً فاناً میں ملک اشتعال واضطراب کا اکھاڑا بن گیا۔ ۱۱ر جون کو اسکندریہ میں ایک ڈانڈی چلانے والے اور مالٹا کے ایک باشندے کے درمیان جھگڑا ہوگیا، جو دیکھتے ہی دیکھتے عربوں اور مالٹا کے یونانیوں کے مابین ایک عام لڑائی کی صورت اختیار کرگیا۔ اس میں ۵۷ یونانی اور ۱۴۰ عرب مارے گئے، لیکن بالآخر اسے مخلوط سپاہیوں کے ایک دستے نے ختم کردیا اور بحری بیڑے کو اس میں مداخلت کی ضرورت نہیں پڑی۔ جنرل درویش پاشا کے زیر قیادت تحقیقاتی کمیٹی کے فیصلے پر رجب پاشا کی (جو محمد علی کے عہد کی یادگار تھا)، زیر نگرانی ایک کابینہ کی تاسیس اس غرض سے عمل میں آئی کہ حکومت کے تمام اختیارات عرابی پاشا ہی کے ہاتھ میں نہ رہنے پائیں، تاہم عرابی پاشا وزیر حرب ہی رہا اور سلطان نے اسے مجیدی تمغہ (درجۂ اول) عطا کیا۔

استنبول سے مرسلہ احکام کی بنا پر اسکندریہ کی فصیلوں پر توپوں کا چڑھانا تو روکا جاچکا تھا، تاہم جولائی میں انگریزی امیر البحر نے یہ احتجاج کیا کہ استحکامات کا سلسلہ جاری ہے، اس جولائی میں اس نے باقاعدہ "الٹی میٹم" دے دیا کہ (فوج کے) بعض حصے اس کی تحویل میں دے دیئے جائیں تاکہ وہ ان سے ہتھیار رکھوالے۔ کابینہ (جس میں درویش پاشا موجود تھا) کا جلسہ ہوا اور اس نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کردیا۔ اس پر انگریزی بیڑے نے شہر کے استحکامات پر گولہ باری شروع کردی (فرانسیسی اس عمل میں شریک نہیں ہوئے، وہ ایک دن پیشتر ہی اسکندریہ کو چھوڑ چکے تھے)، ۱۳ر جولائی کو استحکامات پر سفید جھنڈا لہرا دیا گیا۔

پہلے تو عرابی پاشا نے خدیو کے محل کو جو اس وقت موسم گرما کی وجہ سے اسکندریہ میں تھا محصور کرلینے کی ٹھانی، مگر بعد میں اس خیال کو ترک کردیا اور اپنے سپاہیوں کو شہر سے واپس بلالیا۔

عرابی کے ایک معاون سلیمان سمیع نے شہر اسکندریہ کو آگ لگادینے کی کوشش کی (جیسے روسیوں نے ماسکو کو اس وقت جلادیا تھا جب نپولین شہر کی دیواروں کے نیچے پہنچ چکا تھا) اس پر زبردست لوٹ گھسوٹ اور جرائم کا بازار گرم ہوا۔ ۱۵ر جولائی کو انگریزوں نے اپنی فوجیں ساحل پر اتاردیں اور شہر پر قبضہ کرلیا۔

۱۴ر جولائی کو وزراء کی کونسل باب عالی میں جمع ہوئی اور اس کے ارکان نے مسئلہ زیر بحث پر سلطان کی بارگاہ میں احتجاج کرتے ہوئے طے کیا کہ مسئلہ مذکور کو پرامن طریقے سے حل کیا جاسکتا ہے، لیکن ان کا عام رجحان یہ تھا کہ مصر میں فوجیں بھیج دی جائیں۔ ۱۵ر جولائی کو سفرا متعینہ باب عالی نے بھی بالکل اسی قسم کے نوٹ بھیج کر مصر میں افواج

بھیجنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن عبدالحمید ثانی نے اس میں تامل کیا اور انگریزی سفیر کی ان شرائط کو تسلیم کرنے پر رضامند نہ ہوا جن کی رو سے عرابی پاشا کو باغی قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بالآخر ۵ ستمبر کو باب عالی اور انگریزی سفیر متعینہ باب عالی میں مصر میں افواج بھیجنے کی بابت معاہدہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور اگلے ہی دن عرابی پاشا باغی قرار دے دیا گیا، لیکن سلطان نے اس معاہدے کی توثیق کبھی نہیں کی۔

اس پر مصر میں مقیم انگریزوں نے خدیو کی افواج پر دباؤ ڈال کر عرابی پاشا کو وزارت حرب سے معزول کرا دیا اور ۹ راگست کو اسے باغی قرار دے دیا گیا۔ مزید براں نہری علاقے میں اپنی افواج کے اتار لینے کی اجازت مل جانے پر، عرابی پاشا ۲ راگست کو اپنے آپ کو سلطان کا نمائندہ ہونے کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی فوجوں کو تل الکبیر میں جمع کیا، لیکن چند ہی گھنٹوں کے اندر ان انگریزی افواج نے جو نہر کی راہ سے مصر پر چڑھائی کر رہی تھیں، اس کی فوجوں کا قلع قمع کر دیا اور اس کے دو دن بعد جب انگریزی افواج شہر میں داخل ہو گئیں تو عرابی پاشا نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

عرابی اور اس کے رفقاء کے لئے فوجی عدالت نے موت کی سزا کا حکم صادر کیا، لیکن عین اس وقت انگریزی سفیر لارڈ ڈفرن استانبول سے قاہرہ پہنچ گیا اور اس کے توسط سے خدیو نے ان لوگوں کی سزاؤں کو جلاوطن میں بدل دیا۔ اس پر وزیر اعظم ریاض پاشا نے بطور احتجاج استعفا دے دیا۔ بعض ایسے لوگوں کی رائے کے مطابق جو حالات کو غور سے دیکھتے رہے تھے عرابی پاشا نے بالکل مایوس ہو کر انگریزوں سے خفیہ روابط قائم کر لئے تھے اور تل الکبیر میں ورود ایک مقرر سازش کی بنا پر تھا۔ اس وجہ سے انگریزوں نے اس کی سزا کو جلاوطنی میں تبدیل کرا دینے کا انتظام کر دیا اور عرابی کو جزیرۂ لنکا میں سکونت کے لئے بھیج دیا۔ ۱۹۰۱ء میں خدیو عباس حلمی نے عرابی کو معافی دے دی اور وہ مصر واپس چلا گیا۔ اس نے ۱۹۱۱ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔ (۳۷)

عرابی انقلاب کے اسباب اور مسائل فوج اور امور حرب تک محدود نہ تھے بلکہ اس کا ہدف اصلاح احوال اور حریت، مواخات اور مساوات کے اصولوں پر عدل کا قیام بھی تھا اور اس کی تکمیل اسی صورت میں ہو سکتی تھی جبکہ مجلس نواب قائم کی جاتی اور اسے مؤثر بنایا جاتا یہ وہ نعرہ تھا جس کا اعلان عرابی پاشا نے اپریل ۱۸۸۱ء میں ایک محفل میں کیا تھا۔ یہ نعرہ ملک میں ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا، اس قومی انقلاب کی جو بنیادیں اور اس کے جو اصول تھے بعینہ وہی فرانسیسی انقلاب کے بھی تھے۔ مصری پارلیمنٹ میں قوم کی نمائندگی اور حریت، مساوات اور عدل کے قیام کا مطالبہ ہی زور پکڑتا گیا اور بالآخر مصر میں قومی جمہوری حکومت قائم ہو سکی۔ (۳۸)

انیسویں صدی میں مصر میں جو سیاسی مسائل قومی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں مرکز توجہ بنے ان میں نہر سوئیز (۳۹) کے ٹھیکے کا مسئلہ بہت اہم ہے۔

نہر سوئیز کا مسئلہ

۱۸۵۴ء میں خدیو سعید نے نہر بنانے کا ٹھیکہ دیا اور ۱۸۵۸ء میں نہر سوئیز کی کمپنی قائم ہوئی اور اگلے سال کھدائی کا کام شروع ہو گیا۔ البتہ برطانوی وزیر اعظم نے اس کی سخت مخالفت کی کیونکہ یہ ایک فرانسیسی منصوبہ تھا اور اس سے ہندوستان کے لئے خطرہ پیدا ہو سکتا تھا۔ ۱۷ر نومبر ۱۸۶۹ء کو نہر کا رسمی افتتاح ہوا تو اس تقریب میں یوروپ کی کئی ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی۔ یہ نہر ۱۰۱ میل لمبی اور ۱۹۶ فٹ چوڑی ہے جس پر چار کروڑ فرانک سے زیادہ رقم صرف ہوئی ہے۔ ۱۸۷۵ء خدیو اسماعیل نے مصر کی مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے نہر سوئیز کے ۴۴ فیصد حصے جو اس کی ملکیت تھے برطانوی کے ہاتھ فروخت کر دیئے اس طرح برطانوی حکومت سوئیز کمپنی کی سب سے بڑی حصے دار بن گئی۔ ۱۸۸۲ء میں عرابی پاشا کی بغاوت ہوئی تو انگریزی بیڑے نے اسکندریہ پر گولہ باری کی اور نہر سوئیز کی حفاظت کی آڑ لے کر اپنی فوج مصر میں اتار دی۔ ۱۸۸۵ء میں نہر سوئیز کے لئے ایک مستقل دستور العمل تیار کرنے کے لئے پیرس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی مگر کوئی دستور پاس نہ ہو سکا۔ ۱۸۸۸ء میں برطانیہ، جرمنی، فرانس، روس، ہالینڈ، ہسپانیہ، آسٹریلیا، اٹلی اور ترکیہ نے معاہدۂ قسطنطنیہ پر دستخط کئے، اس کی بعض شرائط یہ تھیں:

- نہر سوئیز جنگ اور امن دونوں حالتوں میں تمام قوموں کے تجارتی اور جنگی جہازوں کے گزرنے کے لئے آزاد رہے گی۔
- نہر کی کبھی ناکہ بندی نہیں ہوگی اور اس کی حدود میں جنگ کی کارروائی نہ ہونے دی جائے گی۔
- البتہ سلطان ترکیہ اور خدیو مصر کو پورا حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی فوجوں کے ذریعے ایسی تدابیر اختیار کر سکیں جو مصر کی حفاظت اور امن عامہ کے قیام کے لئے ضروری ہوں۔
- حکومت برطانیہ نے یہ حق بھی محفوظ رکھا کہ برطانوی افواج کے تصرف مصر کے دوران میں اس کی حکومت کی آزادی پر کوئی پابندی نہ ہو۔

حقیقتاً یہ معاہدہ عمل میں نہ آسکا۔ فرانس اور برطانیہ کے اتحاد (۸ر اپریل ۱۹۰۴ء) کے بعد فرانس نے مصر میں برطانوی مزاحمت کی پالیسی ترک کر دی اور برطانیہ نے نہر سوئیز کے معاہدے کو عملاً مسلم مان لیا۔ ۱۹۰۶ء میں

حکومت ترکیہ جزیرہ نمائے سینا سے دست بردار ہو گئی اور یہ مصری علاقہ بن گیا۔ فروری ۱۹۱۵ء میں ترکی فوج نے سینا کو

عبور کر کے نہر سوئیز پر حملہ کیا۔ ۱۹/ جولائی ۱۹۱۶ء کو اس سے بھی شدید یورش کی مگر یہ ناکام رہی۔ ۶/ اگست ۱۹۲۹ء کو مصر اور برطانیہ کے درمیان معاہدے کی رو سے مصر میں برطانیہ کا فوجی تصرف ختم ہو گیا۔ البتہ یہ طے پایا کہ برطانوی فوجیں صرف نہر سوئیز کے مصری علاقے میں موجود رہیں گی۔ ۲۶/ اگست کو ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی بعض شرائط یہ تھیں کہ برطانیہ تمام فوجیں نکال لے گا اور صرف دس ہزار آدمی نہر سوئیز کے علاقے میں رہ جائیں گے۔ جن کی تعداد زمانۂ جنگ میں بڑھائی جا سکے گی۔ ۸/ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو مصطفیٰ نحاس پاشا نے یہ معاہدہ منسوخ کر دیا۔ برطانیہ نے اسے یک طرفہ فیصلہ قرار دے کر اپنی فوج نکالنے سے انکار کر دیا۔ اسی زمانے میں برطانیہ اور امریکہ نے مل کر شرق اوسط میں مختلف ممالک کا حفاظتی منصوبہ بنایا اور مصر کو شرکت کی دعوت دیتے ہوئے تجویز پیش کی کہ نہر کی حفاظت کے انتظامات بین الاقوامی بنا دیئے جائیں لیکن مصر نے یہ تجویزیں ٹھکرا دیں اور نہر سوئیز کے علاقے میں برطانیہ کے خلاف مظاہرے شروع کر دیئے۔ اس علاقے کے ترپن ہزار مصری ملازمین نے ملازمت چھوڑ دی اور حکومت مصر نے اپنے یہاں کے تمام انگریز ملازموں کو برطرف کر دیا۔ انگریز سپاہیوں اور مصریوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں اور علاقۂ نہر کے انگریز جنرل نے مصر کی فوجی پولیس پر گولی چلا کر چالیس مصریوں کو شہید کر دیا۔ اس پر پورے مصر میں برطانیہ بلکہ تمام یوروپیوں کے خلاف فساد کی آگ بھڑک اٹھی۔ جس میں ان کی کروڑوں روپئے کی جائداد تباہ ہو گئی۔ نحاس پاشا کی وزارت برطرف کر دینے کے بعد یکے بعد دیگرے متعدد وزارتیں بنیں مگر صورت حال سازگار نہ ہو سکی اور بالآخر ۲۳/ جولائی ۱۹۵۲ء کو فوجی انقلاب آ گیا۔ (۴۰)

مصر جدید کے تعمیر کے نشیب و فراز

محمد علی پاشا کے جانشین عباس اول اور سعید دوراندیشی، صلاحیت اور تدبر سے محروم تھے۔ وہ کبھی تو فرانسیسیوں کی طرف جھکتے تھے اور کبھی انگریزوں کی طرف جھکتے تھے۔ سعید کے عہد حکومت کا قابل ذکر کارنامہ نہر سوئیز کی تعمیر ہے۔ جس کا ٹھیکہ اس نے اپنے دوست Ferdinand de lesseps کو دیا تھا۔ اسماعیل پاشا (۱۸۶۳ء۔ ۱۸۷۹ء) میں اگرچہ اپنے دادا محمد علی پاشا کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔ مگر وہ فضول خرچ بھی تھا۔ نہر سوئیز کی تعمیر کے معاہدے میں اسماعیل نے بہت سی ترامیم منظور کرا لی تھیں، جن کی وجہ سے ان کو خواہ مخواہ زیر بار ہونا پڑا تھا۔ نومبر ۱۸۶۹ء میں نہر سوئیز کا افتتاح ہوا، جس سے مصر میں یوروپی اثر و رسوخ کا دروازہ کھل گیا۔ اسماعیل پاشا بھی خود مختاری کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ لیکن باب عالی نے اسے خدیو کا خطاب دے کر راضی کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی مصر سے خراج کی رقم میں اضافہ کر دیا گیا، جس سے مصر کی مالی مشکلات روز بروز بڑھنے لگیں۔ خدیو اور اس کے خاندان کے بیشتر افراد

مصر کی ساری اراضی پر قابض تھے، لیکن بتدریج فلاحین (کاشتکاروں) کو بھی اہمیت حاصل ہونے لگی۔ جب اسماعیل نے عوامی نمائندوں پر مشتمل ایک مشاورتی کونسل قائم کی (نومبر ۱۸۶۹ء) تو اس میں فلاحین کے نمبرداروں کی اکثریت تھی۔ ملک کے نظم و نسق پر ترک اور چرکسی چھائے ہوئے تھے۔ فوج میں بھی ان لوگوں کا عمل دخل تھا، اس سبب سے ان کے خلاف مصریوں میں نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے، مصر کی مالی حالت روز بروز پتلی ہو رہی تھی اور ملک قرضوں کے بوجھ تلے دب گیا تھا۔ انگریزوں کے پاس نہر سوئیز کے حصص کی فروخت بھی روز بروز گرتی ہوئی مالی حالت کو سنبھالا نہ دے سکی۔ اس پر فرانس اور برطانیہ نے مصر کی آمد اور خرچ کی نگرانی ایک کمیشن کے سپرد کر دی، استانبول میں اسماعیل کی بے اعتدالیوں اور شاہ خرچیوں کو تشویش سے دیکھا جا رہا تھا، چنانچہ انگلستان اور فرانس کے ایماء پر باب عالی نے اسماعیل کو معزول کر کے اس کے بیٹے توفیق کو خدیو مصر مقرر کر دیا (۱۸۷۹ء)۔

برطانوی مداخلت (۱۸۷۹ء۔ ۱۸۸۲ء): توفیق کے زمانے میں یوروپی اثر و رسوخ ملک روز بروز بڑھنے لگا۔ اس اثنا میں مشاورتی کونسل توڑی جا چکی تھی، جس کی وجہ سے ملک میں عدم اطمینان اور غیر ملکیوں کے خلاف نفرت کے جذبات پرورش پانے لگے۔ ان حالات میں قوم کی قیادت سابق وزیر اعظم شریف پاشا اور ایک فوجی افسر عرابی پاشا نے سنبھالی۔ اور ایک قومی جماعت بنالی جس کا نام الحزب الوطنی تھا۔ ستمبر ۱۸۸۱ء میں توفیق پاشا نے شریف پاشا کو وزیر اعظم مقرر کر دیا، بعد ازاں شریف پاشا کے مستعفی ہونے پر بارودی پاشا وزیر اعظم اور عرابی پاشا وزیر جنگ مقرر ہوا۔ برطانیہ اور فرانس نے قومی حکومت سے خائف ہو کر اسکندریہ میں بحری فوجیں اتار دیں۔ برطانوی افواج نے تل الکبیر کے مقام پر عرابی پاشا کو شکست دی (۱۳ر ستمبر ۱۸۸۲ء) اور اس سے اگلے روز قاہرہ پر قبضہ کر لیا۔

برطانوی انتداب (۱۸۸۲ء۔ ۱۹۵۲ء): برطانوی حکومت کے اصرار پر عرابی پاشا اور ان کے رفقاء پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور انہیں عمر قید کی سزا دی گئی۔ اب ملک کے سیاہ و سفید کا مالک لارڈ کرومر تھا اور توفیق پاشا برائے نام حکمراں تھا۔ مصری وزراء کے ساتھ برطانوی مشیر بھی کام کرتے تھے جن کے اختیارات وزراء سے زیادہ تھے۔

عباس حلمی دوم (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۱۴ء): توفیق پاشا کے بعد اس کا سترہ سالہ بیٹا عباس حلمی ثانی کے نام سے مصر کا خدیو بنا، اس کی لارڈ کرومر سے ان بن رہتی تھی لیکن وہ دم نہ مار سکتا تھا۔ اس زمانے میں مصری قوم کا ترجمان ایک وکیل مصطفیٰ کامل تھا۔ (۱۸۷۴ء۔ ۱۹۰۸ء) جس نے فرانس میں تعلیم پائی تھی۔ وہ نڈر صحافی اور ایک بے باک مقرر تھا۔ اس کے اخبار اللواء نے مصریوں میں حب الوطنی کی روح پھونک دی۔ مصطفیٰ کامل اتحاد اسلامی کا بھی علمبردار تھا، اس لئے بعض اعتدال پسند مصریوں اور عیسائیوں کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ خدیو کا منظور نظر شیخ علی یوسف مدیر المؤید تھا جو کہ

دستوری اصلاحات کا حامی تھا۔ ۱۹۰۷ء میں لارڈ کرومر کو دنشوای کے واقعے کے نتیجے میں مستعفی ہونا پڑا۔ سر ایلڈن گورسٹ (Sir Eldon Gorst(۴۱ کے انتقال کے بعد لارڈ کچنر مصر میں برطانوی حکومت کا نمائندہ بن کر آیا۔ اس نے خدیو کے لامحدود اختیارات کم کر دیئے۔ ایک نمائندہ مجلس قائم کی اور مصری کسانوں کی اراضی کا تحفظ کیا۔

جنگ عظیم اول اور مصر کی آزادی: نومبر ۱۹۱۴ء میں حکومت برطانیہ نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، مصر کو زیر حفاظت ملک قرار دیا اور عباس حلمی پاشا کو معزول کر کے حسین کامل کو سلطان مصر بنا دیا اور کچنر کے بجائے سر ہنری ہیکو ہن کو برطانوی ہائی کمشنر بنا کر بھیج دیا۔ جنگ کے زمانے میں مصریوں کو بہت سے مصائب برداشت کرنے پڑے، ان کو جبراً فوج میں بھرتی کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء میں سلطان حسین کامل کے انتقال پر شہزادہ احمد فؤاد پاشا خدیو مصر مقرر ہوا۔

جنگ عظیم کے اختتام پر مصری قائد سعد زغلول نے مصر کی آزادی کا مطالبہ کیا اور انگلستان میں ایک وفد لے جانے کی اجازت مانگی۔ حکومت برطانیہ نے نہ صرف وفد کی پزیرائی سے انکار کر دیا بلکہ سعد زغلول کو گرفتار کر لیا۔ اس گرفتاری نے مصر میں آگ سی لگا دی اور سارے شہروں میں بلوے ہونے لگے۔ بالآخر حکومت برطانیہ نے مجبور ہو کر طویل گفت و شنید کے بعد مصر کی آزادی کا اعلان کر دیا (۲۸/ فروری ۱۹۲۲ء)۔ لیکن ملک کے ذرائع آمد و رفت، اقلیتوں کے مسائل اور سوڈان کا مستقبل جیسے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں ملک میں پہلے انتخابات ہوئے تو سعد زغلول کی وفد پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ اس کے بعد بھی کئی دفعہ وفد پارٹی نے وزارت بنائی۔ شاہ فؤاد کا ۱۹۳۶ء میں انتقال ہوا تو اس کا بیٹا فاروق تخت نشین ہوا، لیکن اس کی وفد پارٹی کے قائد نحاس پاشا سے نہ بن سکی اور اس نے دسمبر ۱۹۳۷ء میں نحاس پاشا کی وزارت کو برخاست کر دیا۔ اب خود وفد پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی اور اسے ۱۹۳۸ء کے انتخابات میں ناکامی ہوئی۔

جنگ عظیم دوم (۱۹۳۹ء۔ ۱۹۴۵ء) اور مابعد کے واقعات: ستمبر ۱۹۳۹ء میں محوری طاقتوں نے اعلان جنگ کیا تو مصر نے اتحادیوں کے لئے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی، اور ان سے مکمل تعاون کیا۔ ۱۹۴۲ء میں جنرل رومیل کی سرکردگی میں جرمن افواج اسکندریہ کی جانب بڑھنے لگی تھیں۔ اس پر برطانوی حکومت کے ایماء پر نحاس پاشا کو پھر وزیر اعظم مقرر کیا گیا، لیکن اکتوبر ۱۹۴۴ء میں اسے وزارت چھوڑنی پڑی۔ ملک میں وفد پارٹی کی مقبولیت کم ہونے پر اب میدان سیاست دوسری پارٹیوں کے ہاتھ میں تھا، جنہوں نے مصر سے انگریزوں کے کامل انخلاء اور سوڈان کی آزادی کو اپنا منشور بنا لیا تھا۔

اس زمانے میں الاخوان المسلمون کی جماعت ایک نئی طاقت بن کر ابھر رہی تھی۔ حوادث فلسطین نے اس کی مقبولیت میں اور اضافہ کردیا، لیکن فروری ۱۹۴۹ء میں نامعلوم قاتلوں نے اخوان کے مرشد شیخ حسن البناء کو قتل کردیا۔ اسرائیل کے قیام کے خلاف عربوں کا متحدہ اقدام ناکام ثابت ہوا (۱۹۴۸۔۱۹۴۹ء) اور شاہ فاروق کو اس ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس نے فلسطین کے محاذ پر مصری فوجیوں کو ناکارہ اسلحہ بھجوایا تھا۔ ملک میں شاہی خاندان کی بدعنوانیوں اور شاہ خرچیوں کا چرچا تھا، وزارتیں بنتی تھیں اور بگڑتی تھیں اور ملک میں بے چینی، بے اعتمادی اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

مصر کو تباہی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر نوجوان افسروں نے بغاوت کر کے شاہ فاروق کو تخت سلطنت سے معزول کردیا (۲۲ر جولائی ۱۹۵۲ء) اور جمہوریہ کے قیام کا اعلان کردیا۔ جنرل محمد نجیب نئی جمہوریہ کا صدر اور وزیر اعظم ہوا اور جمال عبدالناصر وزیر داخلہ قرار پایا۔ نئی جمہوریہ نے پہلا کام یہ کیا کہ شاہی خاندان کے افراد سے جاگیریں چھین کر فلاحین میں تقسیم کردیں، بڑے بڑے جاگیرداروں کی اراضی جو مقررہ حد سے زیادہ تھی، معمولی معاوضے پر کسانوں کو دے دی گئی۔ نئی حکومت اخوان کی مقبولیت سے خائف تھی، چنانچہ جمال عبدالناصر پر حملے کے الزام میں الاخوان المسلمون کو خلاف قانون قرار دیا گیا، اس کا سرمایہ ضبط کرلیا گیا، اس کے ہمدرد جیلوں میں ڈال دیئے گئے اور جنرل محمد نجیب کو اخوان کا حامی اور طرف دار قرار دے کر صدارت سے معزول اور گھر میں نظر بند کردیا گیا۔ اب جمال عبدالناصر نے سارے اختیارات سنبھال لئے اور جنوری ۱۹۵۶ء میں نیا دستور نافذ کر کے خود مصری جمہوریہ کا صدر بن گیا۔

جمهورية العربية المتحدة (۱۹۵۵ء۔۱۹۷۷ء): مصر کی آبادی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، موجودہ اراضی مصریوں کی غذائی ضروریات کی کفالت کے لئے ناکافی تھی۔ صحرائی زمینوں کو زیر کاشت لانے کے لئے اسوان کے بند (Aswan Dam) کی تعمیر کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لئے امریکہ اور برطانیہ نے سرمایہ مہیا کرنے کا وعدہ کیا، لیکن مصر کے اشتراکی ممالک سے بڑھتے ہوئے روابط کے پیش نظر وہ اپنے وعدے پر قائم نہ تھے۔ ناصر نے برافروختہ ہو کر نہر سوئیز کو قومی تحویل میں لے لیا (۲۶ر جولائی ۱۹۵۶ء)، اس پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے مل کر مصر پر حملہ کردیا (۲۹ر اکتوبر ۱۹۵۶ء) اور مصری شہروں پر بمباری کر کے ہر طرف تباہی مچادی، بالآخر روس اور امریکہ کی مداخلت سے جنگ بند ہوئی اور حملہ آور فوجوں کو مصر سے نکلنا پڑا۔

برطانوی فرانسیسی اور اسرائیلی مہم کی ناکامی نے جمال عبدالناصر کو دنیائے عرب کا ہر دلعزیز قائد اور نوجوان

عربوں کی امنگوں کا ترجمان بنادیا۔ فروری ۱۹۵۸ء میں شام اور مصر نے مل کر ایک نئی انتظامی وحدت قائم کی جو الجمهورية العربية المتحدة کہلاتی تھی، لیکن مصریوں کی بالادستی اور نخوت کی وجہ سے یہ اتحاد دیرپا ثابت نہ ہو سکا اور ستمبر ۱۹۶۱ء میں ٹوٹ گیا۔ ۱۹۶۰ء میں ملک کی معاشی ترقی کے لئے پانچ سالہ منصوبہ بنایا گیا اور اسی سال اسوان بند کی تعمیر کا آغاز ہوا، ملک کی صنعتی ترقی کے لئے بہت سے اقدامات کئے گئے۔ حلوان میں فولاد کا ایک بڑا کارخانہ قائم کیا گیا۔ نئی یونیورسٹیاں اور نئے مدارس قائم کئے گئے۔

اس اثنا میں مصر میں روس کا اثر ورسوخ غیر معمولی طور پر بڑھنے لگا۔ اسوان بند کی تعمیر کے لئے روس ہی نے امداد دی اور مصر کی دفاعی ضروریات کے لئے اسلحہ بھی فراہم کیا۔ مصر اب قومیت اور اشتراکیت کی زد میں تھا، کیونکہ مغربی ممالک اس سے منہ موڑ چکے تھے۔ اس زمانے میں ملک میں ہر شعبۂ زندگی کو اشتراکی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی گئی، فرعونی عہد کی تحقیق و مطالعہ کی طرف خاص توجہ دی گئی اور ملک کے ذرائع ابلاغ نئے نظام حیات کی تبلیغ واشاعت کے لئے وقف کر دیئے گئے۔ ۶۱۔ ۱۹۶۲ء میں تمام بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا، ایک ہزار کے قریب صنعت کاروں کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور ۱۹۶۳ء میں روئی کی تجارت سے وابستہ اداروں اور ادویہ ساز کارخانوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا۔

اس زمانے میں ناصر کا ستارۂ اقبال پورے عروج پر تھا۔ وہ اب روشن خیالی، تجدد پسندی اور استعمار دشمنی کی علامت بن گیا تھا۔ وہ ہر عرب ملک کے اندرونی معاملات میں دخل دینا اپنا جائز حق سمجھتا تھا۔ صرف سعودی عرب اور مراکش اس کے حلقۂ اثر سے باہر تھے۔ اس دور میں مسلم ممالک کو چھوڑ کر غیر مسلم ممالک یوگوسلاویہ، بھارت اور یونان سے خصوصی تعلقات قائم کئے گئے اور افریقی ممالک کی تنظیم بھی قائم کی گئی۔

۱۹۶۶ء میں اسرائیل کی اشتعال انگیزیاں حد سے بڑھ گئیں، ناصر نے بھی اسرائیل کے خلاف تیز و تند تقریریں شروع کر دیں اور ۱۹۶۷ء کے اوائل میں عرب، اسرائیل جنگ کا خطرہ صاف نظر آنے لگا۔ جون ۱۹۶۷ء میں جب مصر اور اسرائیل کی سرحد سے اقوام متحدہ کے مبصر ہٹائے گئے تو اسرائیل نے اچانک حملہ کر کے مصری فضائیہ کو تہس نہس کر دیا، جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کر لیا اور اربوں پونڈ کا روسی اسلحہ مصری سپاہیوں سے چھین لیا، اس کے علاوہ اردن کے مغربی کنارے اور سارے بیت المقدس پر بھی اپنا تسلط جما لیا اور عالم عرب بے بسی اور بے کسی کی تصویر بن کر رہ گیا۔ جنگ کے ایام میں نہر سویز کو بند کر دیا گیا تھا، اس لئے اس کی بندش سے مصر کی اقتصادیات کو سخت نقصان پہنچا اور ملک کی معیشت تباہ ہو گئی۔ اشیائے صرف کی کمیابی نے خوفناک مہنگائی کی صورت پیدا کر دی۔ سعودی

عرب، کویت اور لیبیا نے مصر کو گراں قدر امداد دے کر اس کی مالی حالت کو سنبھالا دینے کی کوشش کی، آخر ناصر نے شکستہ دلی کے عالم میں ۲۸ر ستمبر ۱۹۷۰ء کو انتقال کیا۔(۴۲)

ناصر کی وفات کے بعد ملک کی زمام کار انور السادات کے ہاتھ میں آئی۔ وہ معتدل مزاج مدبر سیاست داں تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے مصر سے روسی مشیروں کو رخصت کیا جو حکومت کے روزمرہ کے کاروبار میں مداخلت کے عادی بن چکے تھے۔ اس کے بعد سعودی حکومت سے مخلصانہ تعلقات قائم کئے، اخوان کے ہزاروں قیدیوں کو جو جیلوں میں محض شبہہ کے بنا پر بند تھے، رہا کر دیا اور ملک میں تقریر و تحریر کی آزادی بحال کر دی۔ اس کے بعد وہ اسرائیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں مصری فوجوں نے نہر سوئیز پار کر کے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ شاہ فیصل مرحوم نے پٹرول کی بہم رسائی روک کر دنیا کو عربوں کے جائز حقوق کی حق رسی کی طرف متوجہ کیا۔ لیکن امریکہ نے اسرائیل کو بے پایاں امداد دے کر مصری پیش قدمی روک دی، جنگ بندی کے بعد امریکی وزیر خارجہ کیسنجر کی وساطت سے مصالحت کی گفت و شنید شروع ہوئی کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کی رو سے اسرائیل نے مصر کے مقبوضہ علاقے خالی کر دیئے ہیں، اب نہر سوئیز کھل گئی ہے۔ مصر کی مالی حالت سنبھلنے لگی ہے اور ملک اشتراکیت کے سحر سے نجات پا کر آہستہ آہستہ اسلامیت کی طرف بازگشت کر رہا ہے۔ سادات کے قتل (اکتوبر ۱۹۸۱ء) کے بعد اب حسنی مبارک مصر کے صدر قرار پائے ہیں۔

جن لوگوں کی مصر کی جدید تاریخ پر نگاہ ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس ملک کی سیاسی، علمی اور تہذیبی بیداری پیدا کرنے میں جن قد آور شخصیات نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں ان میں احمد لطفی السید کا نام سرفہرست ہے وہ ایک کہنہ مشق صحافی ایک مدبر سیاست داں اور قومی جنگ آزادی کے ممتاز رہنما تھے۔ ان کی زندگی شخصیت اور افکار و خدمات سے صرف نظر کر کے جدید مصر کی جو تاریخ بھی لکھی جائے گی وہ نامکمل اور ناقص رہے گی۔ اس ملک کی سیاست سماج اور تہذیب کا مطالعہ کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ احمد لطفی السید کی حیات و آثار کے تمام گوشوں پر سیر حاصل بحث کی جائے اور اس مرد مجاہد کی شخصیت کے تابناک پہلوؤں سے نئی نسل کو متعارف کرایا جائے۔

حواشی و تعلیقات

(۱) رفاعہ رافع الطہطاوی (۱۲۱۶۔۱۲۹۰ھ / ۱۸۰۱۔۱۸۷۳ء) مصر میں جدید علمی بیداری کے نقیب اور علم بردار کی جائے پیدائش طہطا ہے۔ ۱۲۲۳ھ میں قاہرہ گئے۔ جامعہ ازہر میں تعلیم پائی۔ جدید علوم کی تحصیل کی غرض سے یوروپ گئے۔ تاریخ و جغرافیہ اور فرانسیسی زبان میں آپ کو مہارت حاصل تھی۔ فرانسیسی سے عربی میں متعدد کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ آپ کی تصانیف میں تاریخ قدماء المصریین ، بدایة القدماء ، جغرافیة بلاد شام ، جغرافیة سلطبرون ، انوار توفیق الجلیل ، تعریب القانون المدنی الفرنساوی اور التعریفات الشافیة لمرید الجغرافیة وغیرہ تاریخ پر، "نہایة الایجاز" ، سیرت نبوی پر کافی مشہور و معروف ہیں، آپ کی زندگی اور خدمات پر احمد احمد بدوی نے "رفاعہ طہطاوی بک" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ الزرکلی : الأعلام ۳ / ۲۹۔

(۲) علی مبارک : الخطط التوفیقیة ، ج ۴، ص ۳۸

(۳) رفاعہ رافع الطہطاوی : مناہج الألباب، ص ۳۷۲، ج ، س

(۴) احمد عزت عبدالکریم : تاریخ التعلیم فی عصر محمد علی، مکتبہ النہضة المصریة ، ۱۹۳۸ء، ص ۱۵۶۔۱۵۹

(۵) نفس مصدر ، ص ۱۶۷

(۶) تفصیل کے لئے دیکھئے امیر عمر طوسون : البعثات العلمیة فی عہد محمد علی و عباس و سعید ، الاسکندریة ، ۱۹۳۴ء

(۷) علی مبارک پاشا : الخطط التوفیقیة ، ج ۱۳، ص ۵۴

(۸) عباس اول، خدیو مصر ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوا۔ وہ احمد طوسون (۱۷۹۳۔۱۸۱۶ء) کا بیٹا اور محمد علی کا پوتا تھا۔ وہ اپنے چچا ابراہیم کی وفات (۱۰ر نومبر ۱۸۴۸ء) کے بعد تخت نشین ہوا۔ آغاز حکومت ہی سے اس نے غیر ملکیوں کے ساتھ سخت برتاؤ کیا۔ اپنے پیش روؤں کے زمانے میں نافذ ہونے والی ان اصلاحات کو خطرناک اور ناجائز بدعات قرار دے کر ترک کروادیا۔ بہت سے مدارس کے علاوہ جو محمد علی نے کھولے تھے، کئی کارخانے، دکانیں اور حفظان صحت سے متعلق ادارے بند کروادیئے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس نے ڈیلٹا کے بند کی تعمیرات کو بھی رکوادیا، فرانسیسی حکام کو معزول کر کے ان کے اقتدار کو اس نے چیلنج کیا، اور اس طرح برطانیہ کے قریب تر ہو گیا، ۱۸ر جولائی ۱۸۵۱ء کو اسکندریہ اور قاہرہ کے درمیان ریل بنانے کا ٹھیکہ بھی اس نے برطانیہ کو دیا۔ عوام میں اپنی تلون مزاجی کی وجہ سے وہ زیادہ مقبول نہ

ہو سکا مگر مغربی اصلاحات سے اس کی بیزاری کی وجہ سے بھاری اخراجات میں کمی آئی اور غریب طبقہ کا بوجھ کافی ہلکا ہوا۔ آخری دور میں اس نے عزلت گزینی کی زندگی گزاری۔ بنہا کے محل میں بڑے پراسرار طریقہ سے اس کے دو ملازموں نے اس کا گلا گھونٹ دیا، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، طبع اول ۱۹۷۳ء، ج ۱۲، ص ۷۴۰

(۹) ڈاکٹر عزت عبدالکریم: تاریخ التعلیم فی عصر عباس و سعید، ج۱، ص ۵۸۔۶۱

(۱۰) الدکتور جمال الدین الشیال: تاریخ الترجمة والحركة الثقافية فی عصر محمد علی، دار الفكر العربی ۱۹۵۱ء، ص ۴۸۔۵۰

(۱۱) محمد بن محمد مرتضیٰ الزبیدی (۱۱۴۵۔۱۲۰۵ھ / ۱۷۳۲ء۔۱۷۹۰ء) علوم لغت و حدیث اسماء الرجال اور علم الانساب کے ماہر تھے۔ ہندوستان کے مشہور قصبہ بلگرام میں پیدا ہوئے، یمن کے خطہ زبید میں پرورش پائی۔ حجاز کا سفر کیا اور مصر میں سکونت اختیار کی۔ ایک عظیم مصنف اور عالم دین تھے۔ عالم اسلام کے حکمرانوں نے آپ سے رابطہ رکھنے میں فخر محسوس کیا اور ہدایا و تحائف کی آپ پر خوب بارش ہوئی۔ آپ کی دین داری اور توجہ و عنایت الی اللہ کے سلسلہ میں عوام میں بڑے چرچے تھے۔ مصر میں طاعون کی وباء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی عظیم الشان تصانیف میں "تارج العروس فی شرح القاموس" (دس جلدوں میں) اور امام غزالی کی احیاء العلوم کی شرح "اتحاف السادة المتقين" (دس جلدوں میں) مصر سے شائع ہوئیں۔ "عقود الجواهر المنيفة فی ادلة مذهب الامام ابی حنيفة" (دو جلدوں میں) اور "كشف اللثام عن آداب الايمان و الاسلام" اور "رافع الشكوة و ترويح القلوب فی ذكر ملوك بنی ايوب" اور دوسری متعدد کتابیں آپ کی علمی جلالت اور ادبی و تحقیقی رجحان کا پتہ دیتی ہیں۔ الزرکلی: الاعلام ۷/۷۰

(۱۲) عبد الله بن محمد الشبراوی (۱۰۹۱۔۱۱۷۱ھ / ۱۶۸۰۔۱۷۵۸ء) مصر کے معروف فقیہہ شیخ الازہر کے عہدہ پر فائز ہوئے، آپ کی کتابوں میں "شرح الصدر فی غزوة بدر"، "ديوان الشعر"، "عنوان البيان"، "الاتحاف بحب الأشراف" وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔ الزرکلی: الأعلام ۴/۱۳۰۔

(۱۳) اسماعیل بن سعد الخشاب مصری (المتوفی ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۵ء) بہت بڑے ادیب تھے مصر میں فرانسیسی استعمار کے دور میں روزمرہ واقعات کی ترتیب کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ مولد و مدفن قاہرہ ہے۔ ایک اچھے شاعر تھے آپ کے اشعار "دیوان الخشاب" میں جمع کر دیئے گئے۔ آپ کی ایک کتاب "تاريخ حوادث وقعت بمصر من سنة ۱۱۲۰ھ إلى دخول الفرنسيين" ابھی تک طبع نہیں ہو سکی ہے۔ الزرکلی: الأعلام ۱/۳۱۴

(۱۴) حسن بن محمد بن محمود العطار (۱۱۹۰۔ ۱۲۵۰ھ / ۱۷۷۶۔ ۱۸۳۵ء) کا مولد و مدفن قاہرہ ہے آپ کا شمار علمائے مصر میں ہوتا ہے۔ ایک مدت تک دمشق میں مقیم رہے اور اشکودرہ (البانیة) میں بھی قیام کیا، مصر واپس ہوئے اور جریدہ "الوقائع المصریة" کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ پھر ۱۲۴۶ھ سے وفات تک شیخ الازہر رہے اور دھوپ گھڑی کی مرمت اور صفائی کا کام کرنے میں ماہر تھے۔ آپ کا ایک رسالہ "کیفیة العمل بالاسطرلاب والربعین المقنطر و المجیب والبسائط" شائع ہو چکا ہے۔ ایک دوسری تصنیف "الانشاء والمراسلات" بھی طبع ہو چکی ہے۔ ایک شعری دیوان بھی موجود ہے۔ الزرکلی: الأعلام ۲/ ۲۲۰۔

(۱۵) عبدالرحمٰن بن حسن الجبرتی (۱۱۶۷۔ ۱۲۳۷ھ / ۱۷۵۴۔ ۱۸۲۲ء) حبشہ کے ایک خطہ جبرت سے منسوب ہیں اپنے زمانہ میں مصر کے ممتاز مؤرخ اور وقائع و سیر کے مرتب و محقق قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ ازہر میں تعلیم حاصل کی۔ نپولین نے قبضۂ مصر کے دوران انہیں اپنے یہاں ملازمت دی، محمد علی کے دور میں فقہ حنفی کے مفتی مقرر ہوئے۔ ان کے ایک صاحب زادہ کو قتل کر دیا گیا۔ اس غم میں وہ اتنا روئے کہ ان کی بینائی جاتی رہی۔ چار حصوں میں "عجائب الآثار فی التراجم والاخبار" جو تاریخ الجبرتی کے نام سے معروف ہے، ۱۱۰۰ھ سے ۱۲۳۶ھ تک کے واقعات پر مشتمل ان کی معروف تصنیف ہے۔ اس کتاب کا فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ ہوا، دو حصوں میں ان کی ایک اور تصنیف "مظهر التقدیس بذهاب دولة الفرنسیس" کا بھی فرانسیسی میں ترجمہ ہوا۔ ان کی زندگی اور خدمات پر خلیل شیبوب نے ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ الزرکلی: الأعلام ۳/ ۳۰۴

(۱۶) محمد بن الحسن بن درید (۲۲۳۔ ۳۲۱ھ / ۸۳۸۔ ۹۳۳ء) امام ادب و لغت اور مشہور شاعر تھے۔ بصرہ میں پیدا ہوئے پھر عمان منتقل ہو گئے اور بارہ سال تک وہاں مقیم رہے، اس کے بعد بصرہ لوٹ آئے، فارس کے مضافاتی علاقوں میں گھومتے رہے پھر بغداد پہنچے اور عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے اور وہیں وفات پائی۔ مشہور تصانیف میں الاشتقاق، المقصور و الممدود، تین جلدوں میں الجمهرة، جس کی چوتھی جلد کا مشہور مستشرق کرنکو نے بطور فہرست اضافہ کیا، صفة السرج و اللجام، ادب الکاتب وغیرہ ہیں۔ الزرکلی: الأعلام ۶/ ۸۰

(۱۷) محمد بن احمد الازہری (۲۸۲۔ ۳۷۰ھ / ۸۹۵۔ ۹۸۱ء) عربی ادب اور لغت کے بڑے امام تھے۔ خراسان کا شہر ہرات آپ کا مولد و مدفن ہے۔ ابتداء میں فقہ کے میدان میں شہرت حاصل کی پھر عربی زبان و ادب پر عبور حاصل کیا اور مختلف قبیلوں کی معاشرت اور زبان میں مہارت پیدا کرنے کے لئے مدتوں ان کے درمیان گھومتے رہے۔ قرامطہ کی قید میں بھی رہے۔ آپ کی تصانیف میں "تهذیب اللغة" غریب الالفاظ التی استعملها الفقهاء"؛

"تفسیر القرآن" وغیرہ قابل ذکر ہیں الزرکلی :الأعلام ۵ /۳۱۱۔

(۱۸) ابو نصر اسماعیل بن حماد الجوہری (المتوفی ۳۹۳ھ / ۱۰۰۳ء) مشہور ماہر لغت ہیں۔ ان کی مشہور ترین کتاب دو جلدوں میں "الصحاح" ہے۔ علم عروض پر ایک کتاب۔ علم نحو پر آپ کا مقدمہ بڑا معروف ہے۔ بچپن میں عراق میں داخل ہوئے۔ حجاز کا سفر کیا اور دیہاتوں میں گھومتے رہے پھر خراسان گئے اور نیشاپور میں قیام کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے لکڑی کے دو بازو ہاتھوں میں باندھ کر گھر کی چھت کے اوپر سے اڑنے کی کوشش کی۔ نیشاپور کے عوام تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے۔ اڑنے کی کوشش میں چھت سے گرے اور مر گئے۔ الزرکلی :الأعلام ۱/ ۳۱۳

(۱۹) علی بن اسماعیل بن سیدۃ (۳۹۸۔ ۴۵۸ھ / ۱۰۰۷۔ ۱۰۶۶ء) مشہور امام لغت اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ امیر ابو الجیش مجاہد العامری کے ساتھ مدتوں وابستہ رہے اور لغت اور مفردات میں مہارت پیدا کی اور سترہ حصوں میں مشہور زمانہ کتاب "المخصص" تحریر کی جو عربی زبان و ادب پر نہایت قیمتی سرمایہ تسلیم کی جاتی ہے۔ دوسری تصانیف میں "المحکم و المحیط الاعظم" (چار جلدوں میں) اور "الأنیق" فی شرح حماسة ابی تمام چھ جلدوں میں معروف ہیں۔ الزرکلی :الأعلام ۴ / ۲۶۳۔ ۲۶۴۔

(۲۰) جار اللہ محمود بن عمر زمخشری (۴۶۷۔ ۵۳۸ھ / ۱۰۷۵۔ ۱۱۴۴ء) دینیات، تفسیر اور علم لغت کے امام شمار کئے جاتے ہیں۔ خوارزم کے ایک گاؤں زمخشر میں پیدا ہوئے۔ مکہ کا سفر کیا اور وہاں ایک طویل مدت تک قیام کیا اسی لئے جار اللہ کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ مختلف ملکوں میں گھومتے رہے آخر میں خوارزم کے خطہ جرجانیہ آگئے اور وہیں وفات پائی۔ آپ کی سب سے مشہور کتاب تفسیر قرآن پر "الکشاف" ہے اس کے علاوہ اساس البلاغة ، المفصل ، المقامات ، الجبال و الأمکنة والمیاہ وغیرہ معروف ہیں۔ مسلک اعتزال کے علم بردار تھے۔ اپنی تفسیر میں جگہ جگہ معتزلی فکر کی تائید کی ہے۔ تصوف اور صوفیاء پر سخت تنقید کی ہے۔ الزرکلی :الأعلام ۷ / ۱۷۸۔

(۲۱) جمال الدین بن منظور الافریقی صاحب لسان العرب (۶۳۰۔ ۷۱۱ھ / ۱۲۳۲۔ ۱۳۱۱ء) مشہور ماہر لغت مصر میں (اور ایک روایت کے مطابق مغربی طرابلس میں) پیدا ہوئے۔ قاہرہ میں دیوان الانشاء میں ملازمت کی اس کے بعد طرابلس میں قاضی مقرر ہوئے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام مصر میں گزارے۔ آخر میں بینائی زائل ہو گئی تھی اور اس کے باوجود پانچ سو جلدیں خود اپنی تحریر سے تیار کی ہوئی چھوڑیں۔ آپ کی سب سے مشہور کتاب بیس جلدوں میں لسان العرب ہے جس میں لغت کی تمام اہم کتابوں کا خلاصہ جمع کر دیا ہے اور قاری کو ان سب سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ بارہ حصوں میں " مختار الاغانی " ، "نثار الازھار فی اللیل والنہار " دو حصوں میں "اخبار ابی

نواس " وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ منتخبات اور مرتبہ تصانیف کی ایک بڑی تعداد ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہے۔ الزرکلی : الأعلام ۷ / ۱۰۸

(۲۲) محمد بن عبداللہ ابو القاسم التنوخی (۳۴۹۔ ۴۱۷ھ / ۹۶۰۔ ۱۰۲۶ء) ماہر لغت وادب اور قاضی تھے۔ ابن تغری بردی کہتے ہیں کہ وہ علم کا منبع تھے ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ آخر عمر میں دمشق سے گزر رہے تھے کہ راستہ میں انتقال ہو گیا۔ ان کی لاش مدینہ منورہ لائی گئی اور جنة البقیع میں تدفین ہوئی۔ الزرکلی : الأعلام ۵ / ۲۸۷۔ ۲۸۸۔

(۲۳) احمد بن محمد الفیومی (المتوفی ۷۷۰ھ تقریباً / ۱۳۶۸ء) معروف ماہر لغت ہیں۔ اپنی کتاب "المصباح المنیر" کی وجہ سے شہرت پائی۔ فیوم (مصر) میں پیدا ہوئے اور وہیں آپ کی پرورش ہوئی۔ آپ کی بعض دوسری تصانیف بھی ہیں جو ابھی تک مخطوطوں کی شکل میں ہیں۔ الزرکلی : الأعلام ۱ / ۲۲۴

(۲۴) الشیال، نفس مصدر، ص ۲۲۵۔ ۲۲۶

(۲۵) محمد بن علی الحکیم (م ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء) دمشق آپ کا مولد و مدفن ہے، تعلیم وتربیت سے متعلق مشہور فاضل ہیں۔ مدرسہ ریحانیہ دمشق کی بنیاد رکھی اور اہل علم کی ایک بڑی تعداد آپ کے ہاتھوں فارغ ہوئی۔ آپ کی بعض تصانیف ابھی تک مخطوطے کی شکل میں ہیں۔ الزرکلی : الأعلام ۶ / ۳۰۷

(۲۶) ابراہیم عبدالغفار الدسوقی (۱۲۲۶۔ ۱۳۰۰ھ / ۱۸۱۱۔ ۱۸۸۳ء) محمد علی اور عباس کے دور حکومت میں مصر کے مشہور مترجم تھے، ازہر میں تعلیم حاصل کی۔ مدرسۃ الطب اور اس کے بعد مدرسة المهندس خانة میں تصحیح کی خدمت پر مامور ہوئے، اس کے بعد بولاق پریس میں تصحیح کی خدمت انجام دی۔ مصر میں انگریزی سے عربی میں ترجمے کا جو عظیم الشان کام انجام دیا گیا اس میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ مجلّہ " الوقائع المصرية "، طبّی مجلّہ "اليعسوب" کی ادارتوں میں بھی مختلف اوقات میں شریک رہے۔ الزرکلی : الأعلام ۱ / ۴۷

(۲۷) شیخ حسن الطّویل (۱۲۵۰۔ ۱۳۱۷ھ / ۱۸۳۴۔ ۱۸۹۹ء) مصر کے نامور عالم اور فقہ مالکی کے مشہور محقق نے طنطا میں تعلیم حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ازہر کا رخ کیا۔ کچھ دنوں تک تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہے پھر وزارۃ المعارف میں انسپکٹر مقرر ہوئے۔ سوڈان میں جب مہدی سوڈانی نے علم جہاد بلند کیا اور انہیں فتوحات حاصل ہوئیں تو حسن الطّویل نے علی الاعلان ان کی حمایت کی۔ انگریز خفا ہو گئے اور انہیں مختلف طرح کی اذیتیں دیں۔ وہ بدعت و خرافات کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ تفسیر قرآن میں ان کی تصنیف "عنوان البیان" معروف ہے۔ الزرکلی : الاعلام ۲ / ۱۸۳

(۲۸)عبداللہ ابو السعود آفندی (۱۲۳۶۔۱۲۹۵ھ / ۱۸۲۰۔۱۸۷۸ء)جدید مصر کی سیاست وصحافت کے نامور فرزند ہیں۔ فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ مختلف حکومتی مناصب پر فائز ہونے کے بعد دار العلوم قاہرہ میں ادب عربی کی تاریخ بھی پڑھائی۔ ۱۲۸۴ھ میں اخبار "وادی النیل" اور اس کے بعد " روضة الأخبار" کو جاری کیا۔ قاہرہ ہی میں وفات ہوئی۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور فرانسیسی سے عربی میں مختلف کتابوں کے مترجم بھی ہیں۔الزرکلی : الاعلام ۴/۱۰۰

(۲۹)ادیب اسحاق(۱۲۷۲۔۱۳۰۲ھ / ۱۸۵۶۔۱۸۸۵ء)دمشق کے عیسائی ادیب اور صحافی نے میدان صحافت میں قدم رکھا تو "ثمرات الفنون " اور جریدہ"التقدم " میں مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ قاہرہ میں قیام کیا تو ۱۸۷۷ء میں ہفت روزہ "مصر" جاری کیا۔ اس کے بعد اسکندریہ واپس آئے اور سلیم النقاش کے ساتھ مل کر روزنامہ "التجارة" جاری کیا۔ ۱۸۸۰ء میں پیرس گئے تو وہاں سے "مصر القاهرة" نکالا۔ کچھ مدت کے بعد بیروت واپس آئے اور پھر قاہرہ میں دیوان المعارف میں ملازم ہوگئے۔ عرابی انقلاب کے بعد بیروت واپس آگئے۔ زندگی کی آخری سانسیں لبنان کے ایک قریہ الحدث میں لیں۔ آپ کی کتابوں میں"نزهة الاحداق فی مصارع العشاق " اور "تراجم مصر فی هذا العصر " معروف ہیں۔ متعدد ناولوں کا فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔الزرکلی : الاعلام ۱/۲۸۵

(۳۰) شیخ محمد عبدہ(۱۸۴۹ء۔۱۹۰۵ء)مصر کے معروف اصلاحی مفکر اور اتحاد اسلامی کے علم بردار کی زندگی کا سب سے اہم موڑ وہ ہے جب سید جمال الدین افغانی(۱۸۳۸۔۱۸۹۷ء)سے ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے زندگی بھر ان کے مشن اور فکر کی ترویج واشاعت کا بیڑہ اٹھالیا۔ آپ"الوقائع المصرية " اور"اصلاح اللغة العربية " کے مدیر بھی رہے۔ ۱۸۸۸ء کے آخر میں مقامی عدالت میں قاضی کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ۱۸۹۹ء میں محكمة الاستئناف کے مشیر مقرر ہوئے۔ مختلف جدید مسائل پر آپ نے اجتہادات کئے۔ آپ کا ایک اہم کارنامہ جامع ازہر کے نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح ہے۔ آپ کی تصانیف میں تفسیر قرآن الحکیم ، رسالة التوحيد اور الاسلام و النصرانية مع العلوم و المدنية نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔

(۳۱)عبداللہ الندیم(۱۲۶۱۔۱۳۱۴ھ / ۱۸۴۵۔۱۸۹۶ء)مصر کے ادیب وشاعر اور صحافی تھے الجمعية الخيرية الاسلامية کی بنیاد رکھی۔ اخبار "المحروسة" اور العصر الجديد میں مضمون نگاری کی ابتدا کی۔ پھر جریدہ "التنكيت والتبكيت " نکالا۔ بعد میں اپنے اخبار "الطائف" کے ذریعہ قومی جہاد کا اعلان کیا۔ عرابی انقلاب کے

مشہور خطیب تھے۔ چنانچہ اس کی سزا کے طور پر گرفتاری اور جلاوطنی کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ جب قاہرہ واپس آئے تو ۱۳۱۰ھ میں مجلۃ "الاستاذ" نکالا۔ انگریزوں نے پھر آپ کو جلاوطن کردیا چنانچہ زندگی کے آخری ایام استنبول میں گزرے۔ آپ کے دو شعری مجموعے دو ناولیں اور متعدد تصانیف شائع ہو چکی ہیں جن میں "الساق علی الساق فی مکابدۃ المشاق" کافی مشہور ہے۔ الزرکلی: الاعلام ۴/ ۱۳۷۔۱۳۸۔

(۳۲) ابراہیم المویلحی (۱۲۶۲۔ ۱۳۲۳ھ / ۱۸۴۶۔ ۱۹۰۶ء) مصر کے نامور مصنف نقاد اور ادیب تھے۔ قاہرہ میں پیدائش اور وفات ہوئی۔ اپنا ایک پریس قائم کیا اور صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ یوروپ سے "الاتحاد" اور "الانباء" دو اخبارات نکالے۔ ۱۳۰۳ھ میں مجلس المتعارف استنبول کے رکن مقرر ہوئے۔ دس سال تک مقیم رہنے کے بعد مصر واپس آئے اور اپنی کتاب "ماھنا لک" لکھی۔ پھر ایک ہفت روزہ "مصباح الشرق" نکالا۔ الزرکلی: الاعلام ۱/ ۴۵

(۳۳) بشارۃ تقلا (۱۲۶۸۔ ۱۳۱۹ھ / ۱۸۵۲۔ ۱۹۰۱ء) جریدہ الاھرام کے بانیوں میں سے تھے۔ لبنان میں پیدا ہوئے بیروت میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۵ء میں اسکندریہ سے اپنے بھائی سلیم تقلا کے ساتھ پہلے ہفتہ وار اور پھر روزنامہ "الاہرام" نکالا۔ عرابی انقلاب کا ساتھ نہ دیا تو ان کا پریس جلادیا گیا۔ مگر اخبار نکالتے رہے۔ ۱۸۹۸ء میں قاہرہ میں وفات ہوئی۔ الزرکلی: الاعلام ۲/ ۵۲

(۳۴) علی یوسف (۱۸۶۳۔ ۱۹۱۳ء / ۱۲۸۰۔ ۱۳۳۱ھ) مصر کے نامور صحافی تھے۔ یتیمی کا داغ لئے تعلیم و تربیت کے ابتدائی مراحل طے کئے۔ ۱۲۹۹ھ میں مضافات سے قاہرہ شہر منتقل ہوگئے، تعلیم کی تکمیل الازہر میں کی۔ تین سالوں تک ہفت روزہ مجلّہ "الآداب" نکالا، پھر ۱۳۰۷ھ میں روزنامہ المؤید شائع کیا۔ جس نے مصر عالم شرق اور عالم اسلام کی سیاست میں دھوم مچادی، سجادہ نشینی کے منصب پر فائز رہے اور پھر علیحدگی اختیار کرلی۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ بعض مصنفوں نے آپ کو اپنے دور کی اسلامی صحافت کا شیخ (شیخ الصحافۃ الاسلامیۃ) قرار دیا ہے۔

(۳۵) مصطفیٰ کامل (۱۲۹۱۔ ۱۳۲۶ھ / ۱۸۷۴۔ ۱۹۰۸ء) اپنے دور میں مصر کے ہر دل عزیز لیڈر قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ خدیویہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے طولوس گئے۔ اور ۱۸۹۴ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ اخبار کے مدیروں اور نامہ نگاروں کو قومی تحریک آزادی میں شامل کیا، برلن، لندن، ویانا، بوڈاپسٹ، جینوا اور قسطنطنیہ کی سیاحت کی۔ ۱۸۹۹ء میں "اللواء" جاری کیا۔ جو ان کی وفات تک نکلتا رہا۔ بعد میں اس کے انگریزی اور فرانسیسی ایڈیشن بھی شائع ہونے لگے۔ وہ ایک شعلہ بیان خطیب تھے۔ ان کی تحریروں میں آتش بیانی کا رنگ

غالب ہے۔

(۳۶)عبدالعزیز جاویش(۱۲۹۳۔۱۳۴۷ھ / ۱۸۷۶۔۱۹۲۹ء)مشہور خطیب، مصنف مصر کی قومی تحریک آزادی کے رہبر اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ مصطفیٰ کامل کی صحبت اختیار کی۔ ۱۹۰۸ء میں اللواء کے ایڈیٹر ہوئے۔ انگریزی استعمار کے خلاف شمشیر برہنہ تھے۔ حادثۂ دنشوای پر مضمون لکھنے کے جرم میں چھ ماہ جیل میں بھی رہے۔ استنبول گئے اور جریدہ "الہلال" اور پھر مجلّہ "الہدایۃ" اور مجلّہ " العالم الاسلامی" یکے بعد دیگرے نکالا۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ الزرکلی :الاعلام ۴ / ۱۷

(۳۷)اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۳، ص ۲۱۔۲۷

(۳۸)ڈاکٹر محمد مصطفیٰ صفوت :الاحتلال الانجلیزی لمصر و موقف الدول الکبری ازاءہ، دار الفکر العربی مصر، ۱۹۵۲ء، ص ۱۷۔۲۷،.....مصر المعاصرہ و قیام الجمہوریۃ المتحدۃ ، مکتبۃ النہضۃ المصریۃ ، قاہرہ، ۱۹۵۹ء، ص ۷۔۳۴

(۳۹)الجمہوریۃ المتحدۃ العربیۃ (مصر)کا ایک انتظامی حلقہ اور اس کا صدر مقام، بحیرۂ قلزم کی ایک خلیج ایک نہر، جو بحیرۂ روم کو خلیج سویز سے ملاتی ہے۔ سویز کا علاقہ ایک بے برگ و گیاہ صحرا میں خلیج کے سرے پر واقع ہے۔ جس کے مغرب میں عتافہ کے سیاہ پہاڑ ہیں، اپنے طبیعی حالات کے باعث یہ علاقہ "الحجر" کہلاتا ہے۔(دیکھئے De-scriptionde la Egypt, vol,1:185) سویز کا رقبہ ۱۱۹ مربع میل اور آبادی ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۰۳۶۱۰ ہے۔ خلیج سویز کے کنارے نہر سویز کے جنوبی دہانے پر بور توفیق (پورٹ توفیق) واقع ہے۔ جو ایک پشتے کے ذریعے شہر سویز سے ملی ہوئی ہے۔

شہر سویز ۲۹ درجے ۵۸ دقیقے ۵۹ ثانیے طول بلد شمالی اور ۳۲ درجے ۳۵ دقیقے عرض بلد شرقی پر، قاہرہ سے اسّی میل مشرق میں (اس قدیم شاہراہ کے آخری سرے پر واقع ہے جو قاہرہ سے بحیرہ قلزم کی طرف جاتی تھی) ۔ موجودہ سویز متعدد قدیم شہروں کے محل وقوع پر آباد ہے۔ یہاں کئی پرانے مصری آثار پائے جاتے ہیں۔ نزدیک ہی ایک بلند مقام (کوم القلزم) پر بطلمیوسی عہد کے قلعہ عرب جغرافیہ دانوں کا قلزم کے کھنڈر ہیں۔ اس سے بھی قبل بطلمیوس فیلادلفوس نے اس کے انواح میں ایک قصبہ ارسنوی آباد کیا تھا جسے بعد میں کلیوپاتریس کا نام دیا گیا۔ اوائل عہد عیسوی میں یہاں مقامی لوگوں کی ایک بستی تھی جن کا شغل ماہی گیری اور چوری چھپے درآمد برآمد کرنا تھا۔ اسلامی عہد میں صرف مملوک سلاطین کا دور ایسا ہے جب اس کی ترقی رک گئی تھی۔ ورنہ یہ قصبہ بڑا خوش حال رہا۔ اس امید (Cape of

(Good hope) کے راستے کی دریافت سے اس کی خوش حالی میں کمی واقع ہو گئی۔ سلیم اول کے عہد (۱۵۱۷ء) میں بحری فوج کے ایک مستقر کے طور پر اسے ایک بار پھر عروج حاصل ہوا۔ اس زمانے میں بئر سویس سے جو قاہرہ جانے والی سڑک پر سوافرسخ کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایک نہر کے ذریعے قصبے میں آب رسانی کی گئی۔ اس نہر کے آثار تاحال موجود ہیں۔ بقول علی بے یہ پانی کھاری تھا۔ عیون موسیٰ (یعنی موسیٰ کے کنووں) سے بھی جو آٹھ میل کے فاصلے پر ہیں اور جن کا ذکر افسانوں میں آتا ہے۔ (ابن الوردی)۔ علی بے لکھتا ہے کہ "ان کنووں سے جو پانی نکلا وہ بد مزہ اور متعفن قسم کا تھا"۔ موجودہ زمانے میں تازہ پانی کی بہم رسانی دریائے نیل کی ایک نہر (الترعة الاسماعيلية) سے ہوتی ہے جو ۱۸۶۳ء میں قاہرہ اور سویز کے درمیان کھودی گئی۔

انیسویں صدی کے شروع ہونے تک یہ قصبہ ایک بار پھر زوال و گمنامی سے دوچار ہوا (علی بے، ۲ : ۲۹)، لیکن ۱۸۳۷ء میں جب انگلستان اور ہندوستان کے درمیان خشکی کے راستے ڈاک کی ترسیل شروع ہوئی تو اسے ایک نئی زندگی مل گئی۔ ۱۸۵۷ء میں اسی سڑک کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن بچھادی گئی۔ ۱۸۶۸ء میں اسے ایک اور ریلوے لائن کے ذریعے قاہرہ سے براہ اسماعيلية ملادیا گیا۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کے افتتاح کے بعد یہ شہر بڑی تیزی سے پھلنے پھولنے لگا۔ آج کل اس کا شمار مصر کے چار بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ یہاں تیل صاف کرنے کے دو بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ سمندر کے راستے سے جدہ جانے والے حجاج سویز ہی سے روانہ ہوتے ہیں اور واپسی پر قرنطینے کے لئے الشط میں قیام کرتے ہیں جو پورٹ توفیق کے بالمقابل واقع ہے۔

(۴۰) انقلابی حکومت نے نہر سویز سے برطانوی فوج کے انخلاء کے بارے میں بات چیت شروع کی اور طے پایا کہ حلقۂ نہر میں فوج کا سالار مصری ہوگا، اس کا نائب انگریز ہوگا جس کی حیثیت فنی مشیر کی ہوگی اور جب تک مصری نہر کے تمام دفاعی انتظامات سنبھالنے کے لئے تیار نہ ہو جائیں صرف چار ہزار برطانوی ماہرین فن نہر کے علاقے میں مقیم رہیں گے۔ ۲۱ر مارچ ۱۹۵۶ء کو یہاں سے آخری برطانوی لشکر (جیش) اور ۱۴ر اپریل کو آخری فضائی دستہ بھی روانہ ہو گیا اور ۱۳ر جون کو ۷۴ سال کے بعد برطانیہ نے نہر سویز کی حفاظت باضابطہ طور پر مصر کے سپرد کر دی۔

اسی زمانے میں مصر نے اپنے دفاعی انتظامات کو مستحکم کرنے کے لئے چیکوسلواکیا سے اسلحہ خریدا تو برطانیہ اور امریکہ نے اسوان بند کی تعمیر میں امداد دینے سے انکار کر دیا اور عالمی بنک نے بھی روپیہ دینے کا وعدہ واپس لے لیا۔ اس پر ۲۶ر جولائی ۱۹۵۶ء کو صدر جمال عبدالناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ اس سے کم و بیش دس کروڑ ڈالر سالانہ کی جو آمدنی ہوتی ہے وہ اسوان بند کی تعمیر پر صرف کی جائے گی۔ تیرہ سال بعد (۱۹۶۹ء

میں) نہر خود بخود مصر کی ملکیت بننے والی تھی۔ تاہم برطانیہ اور اس کے حلیف اس پر بہت برہم ہوئے، بالآخر اسرائیل، برطانیہ اور فرانس کی باہمی سازباز سے ۲۹/اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسرائیل نے مصر پر حملہ کردیا ۳۰/اکتوبر کو برطانیہ اور فرانس نے الٹی میٹم دیا کہ دونوں ملکوں کی فوجیں نہر سویز سے دس دس میل دور رہیں اور مصر سے مطالبہ کیا کہ فرانسیسی اور برطانوی فوجوں کو نہر سویز کی حفاظت کرنے کے لئے پورٹ سعید، اسماعیلیہ اور سویز میں قیام کی اجازت دی جائے۔ مقصد یہ تھا کہ اسرائیل جزیرہ نمائے سینا پر قبضہ کرلے۔ مصر نے الٹی میٹم ٹھکرادیا۔ ۳۱/اکتوبر کو برطانیہ اور فرانس نے مصر پر ہوائی جہازوں سے بمباری شروع کردی جس سے بے انتہا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ بہر حال امریکہ اور روس کی متحدہ کوشش سے جنگ بند ہوگئی اور برطانوی، فرانسیسی اور اسرائیلی فوجوں کو واپسی پر مجبور کردیا گیا۔ اسے صاف کیا گیا اور حالات معمول پر آگئے۔

۳۰/مارچ ۱۹۵۷ء کو صدر ناصر نے اعلان کیا کہ کسی اسرائیلی جہاز کو اس وقت نہر سویز سے گزرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جب تک فلسطین کے عرب مہاجرین کا مسئلہ حل نہ ہوجائے۔ ۱۹۶۶ء میں یہاں سے تقریباً چوبیس کروڑ میٹرک ٹن سامان تجارت لے کر ۲۱۲۵۰ جہاز گزرے اور اس سے جمہوریۂ متحدہ کو ساڑھے نو کروڑ مصری پونڈ کی آمدنی ہوئی۔

جون ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ چھڑ گئی اور نہر سویز کے مشرق میں سینا کا سارا علاقہ اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا، چنانچہ اس وقت سے یہ نہر ہر قسم کی آمدورفت کے لئے بند ہے۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء میں یہ علاقہ ایک بار پھر میدان جنگ بنا اور جمہوریۂ متحدہ کی فوجوں نے نہر سویز کا مشرقی کنارا دور دور تک اسرائیلیوں سے خالی کرالیا، تاہم اسرائیلی بھی یورش کرکے نہر کے مغربی کنارے پر واقع کچھ علاقوں پر قابض ہوگئے۔ جنوری ۱۹۷۴ء میں امریکہ کی کوششوں سے اسرائیل اور مصر کے درمیان ایک محدود سی مصالحت ہوگئی جس کی رو سے اسرائیل نے نہر کے مغربی علاقے سے اپنی فوجیں نکال لیں۔ اور برطانیہ نے نہر کو بارودی سرنگوں سے صاف کرکے اسے دوبارہ جہازرانی کے قابل بنانے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ج ۱۱، ص ۴۶۲۔۴۶۶، طبع اول ۱۹۷۵ء۔

(۴۱) سر ایلڈون گورسٹ Sir Eldon Gorst (م جولائی ۱۹۱۱ء) مصر میں لارڈ کرومر کے بعد برطانوی حکومت کے وائس رائے مقرر ہوئے انہوں نے ۱۸۸۶۔۱۹۰۴ء میں مصر حکومت کے مسائل اور برطانوی انتداب کے درمیان اعتدال و توازن پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔ خدیو حکومت کے ساتھ مفاہمت کی راہ نکالی اور برطانوی استعمار کے

بڑھتے ہوئے اثرات کو معتدل بنانے کی جدوجہد کی۔ دوسری طرف مصری سیاسی اداروں کو زیادہ بااختیار بنانے کا منصوبہ بنایا، مگر اس پوری مدت میں وہ اپنے مقاصد میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ایک طرف برطانوی افسران نے ان کی پالیسیوں کی مخالفت کی تو دوسری طرف قوم پرست عناصر بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ نہر سویز کے ٹھیکہ کی توسیع کا منصوبہ قوم پرستوں نے مسترد کر دیا۔ لارڈ کچنر (Lord Kitchener) اگلے وائسرائے مقرر ہوئے اور اس طرح خدیو حکومت سے مفاہمت کی راہیں قدر مسدود ہوئیں۔ مگر عباس حلمی کے اختیارات کو محدود کرنے کی وجہ سے کچنر نے گویا قوم پرستوں کے مفاد کو تقویت پہنچائی۔ ۱۹۱۳ء میں مصری دستور سازی نے قوم پرست عناصر کا حوصلہ مزید بڑھایا۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا۔ ج ۱۸، ص ۱۳۹۔

(۴۲) دیکھئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور۔ جلد ۲۱، ص ۱۸۴۔ ۲۲۶، طبع اول ۱۹۸۷ء

باب دوم

احمد لطفی السیّد (۱۸۷۲ـ ۱۹۶۳ء)

حیات وخدمات

الحزب الوطنی کی تشکیل

حزب الامۃ کی تنظیم

مجمع اللغۃ العربیۃ کا قیام

اہل علم وادب سے گہرے روابط

حیات وخدمات

دار الہلال مصر نے استاذ احمد لطفی السید کو اپنی زندگی کے نشیب و فراز مرتب کرنے کی طرف توجہ دلائی چنانچہ مرحوم کی یہ یادداشت مجلّہ المصور میں تفصیل سے شائع ہوئی اس میں بعض ان سیاسی واقعات پر روشنی ڈالی گئی تھی جن کے وہ خود مشاہد تھے یا جن میں آپ نے بھر پور شرکت کی تھی اس یادداشت سے مرحوم کی زندگی کے نت نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

میں ایک ایسے مصری گھرانے میں پیدا ہوا جو مصر ہی کو اپنا وطن سمجھتا تھا اور اپنے مصری ہونے پر فخر کرتا تھا یہ خاندان اپنے کو مصر سے منسوب کرتا تھا یہ وہ پاکیزہ ملک ہے جس میں قدیم ترین زمانے سے تمدن نشو و نما پاتا رہا ہے اور قدرتی دولت اور قدیم شرف و مجد اس کی ترقی و خوشحالی اور وقار کی ہمیشہ سے ضمانت دیتی رہی ہے۔

میری پیدائش ۱۵ر جنوری ۱۸۷۲ء کو ضلع دقہلیہ کے ایک گاؤں برقین میں ہوئی یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی آبادی اُس وقت بمشکل سو افراد پر مشتمل تھی اب اس کی آبادی بہت بڑھ چکی ہے اور تقریباً دو ہزار افراد وہاں بود و باش رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی یہ روایت رہی ہے کہ یہ قاف کو جاف بولتے ہیں یہ لہجہ بات چیت میں میرے اوپر آج تک غالب ہے۔ میرے والد سید پاشا ابو علی اس گاؤں کے مرجع خلائق تھے انہیں قرآن پاک بہت اچھی طرح یاد تھا ان کی بارعب شخصیت ان کا جاہ و جلال اور ان کی انصاف پروری معروف تھی وہ گاؤں کے لوگوں پر بڑے مہربان تھے مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے کبھی میرے اوپر سختی نہیں کی نہ کبھی درشت خوئی سے مجھ سے بات کی نہ کبھی دل آزار لہجے میں مجھے مخاطب کیا مرحوم بچوں کی تربیت کے معاملے میں بڑے حکیم اور سراپا شفقت و رحمت تھے۔ ہر پہلو سے اچھا نمونہ اور ارشاد و تربیت میں بے مثال تھے۔

جب میں چار سال کا ہوا تو مجھے انہوں نے گاؤں کے مکتب میں داخل کرایا جہاں ایک خاتون کی سرپرستی مجھے حاصل رہی انہیں شیخ فاطمہ کہا جاتا تھا میں نے اس میں چھ سال گزارے وہاں لکھنا پڑھنا سیکھا اور پورا قرآن وہیں حفظ کیا۔ میں ہم جماعت دوستوں کے ساتھ چٹائی پر بیٹھتا تھا۔ ہم اپنے ہاتھوں سے روشنائی بناتے تھے۔ ان سالوں میں میری جو پرورش ہوئی اس میں اس خاتون کا بڑا ہاتھ ہے۔ دس سال کی عمر میں میں نے اسی مکتب میں حفظ قرآن مکمل کیا پھر میرے والد نے میرے لئے شام کے دیہات سے ایک گھوڑی خرید دی جو ریلوے لائن سے مانوس نہ تھی میں سیر و تفریح کے لئے اور بعض دوسرے کاموں کے لئے اس پر سواری کرتا تھا میرے والد نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں اس گھوڑی کے ساتھ ریلوے لائن سے دور ہی رہوں مبادا مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے۔ ایک دن میں نے اسے سواری

کے لئے نکالا اور طرابلس مغرب کے ایک گاؤں کی طرف نکل گیا والد کی نصیحت میرے ذہن سے محو ہو گئی۔ میں اس پر سوار ہو کر ریلوے لائن کے کنارے جا رہا تھا کہ یکایک ٹرین آگئی اور میں اس کے اوپر سے چھلانگ لگا کر نیچے آگیا اور اسے تنہا چھوڑ دیا وہ سرپٹ بھاگی یہاں تک کہ اس نے یرقین پہنچ کر دم لیا۔ چنانچہ اسے تنہا پا کر میرے گھر والے گھبرا اٹھے پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ تمام لوگوں نے یہ سمجھا کہ مجھے کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ یہاں تک کہ ٹرین ان کے قریب آگئی انہوں نے دیکھا کہ گاڑی کا ڈرائیور سفید رومال سے اشارہ کر رہا ہے تب جا کر گاؤں کے لوگوں کو کچھ سکون ہوا، پھر مجھے میرے والد کے پاس لایا گیا تو میں بہت خوف زدہ اور پریشان تھا۔ مگر حسب معمول والد مرحوم نے میرے کندھوں کو تھپتھپایا کہ میرے بیٹے کبھی میرے حکم کی خلاف ورزی نہ کرنا اور دوبارہ ریلوے لائن کے قریب نہ بھٹکنا۔ اس واقعہ نے میرے دماغ پر بڑا گہرا اثر کیا اور والد مرحوم سے میری محبت اور تعلق خاطر میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

جب میں نے حفظ قرآن مکمل کر لیا تو میرے والد نے مجھے اعلی تعلیم کے لئے ازہر بھیجنا چاہا ان ہی دنوں اتفاق سے دقہلیہ کے سابق مدیر ابراہیم پاشا ادہم ایک دعوت پر تشریف لائے میں انہیں سلام کرنے کے لئے کمرے میں داخل ہوا تو انہوں نے میرے والد سے پوچھا کہ وہ مزید تعلیم کے لئے مجھے کہاں بھیج رہے ہیں انہوں نے جواب دیا کہ انشاء اللہ ازہر شریف بھیجنے کا ارادہ ہے۔ ابراہیم پاشا نے مشورہ دیا کہ مدرسہ منصورہ میں مجھے داخل کیا جائے اس وقت دقہلیہ میں یہ تنہا سرکاری مدرسہ تھا۔ اور مرحوم امین سامی پاشا اس کے نگراں تھے جو حسن انتظام سختی اور کسی طالب علم کے ساتھ کسی قسم کی کوئی رعایت نہ کرنے کے لئے مشہور تھے تاہم ہم ان سے محبت کرتے تھے ان کا احترام کرتے تھے اور ان کی شفقت پدری کو محسوس کرتے تھے۔ مدرسہ میں ایک داخلی شعبہ بھی تھا چنانچہ امتحان کے ذریعہ دوسرے سال میں میرا داخلہ ہو گیا کیونکہ حفظ قرآن پاک کے علاوہ میں حساب کے چاروں قواعد سے بھی واقف تھا یہ ۱۸۸۲ء کا سال تھا جب مدرسہ منصورہ سے میرا تعلق قائم ہوا اور جب اپنی کلاس کے دوستوں سے گھلنے ملنے کا مجھے موقع ملا تو کچھ دنوں کے بعد مجھے ایک بے چینی سی لاحق ہوئی کیونکہ وہ لوگ میرا مذاق اڑاتے تھے جب میں قاف کو جاف بولتا تھا۔

اس زمانے میں مدارس کے نظام میں عسکریت کی روح طاری تھی اور ہم ہر جمعہ کو اس جیل سے رسی توڑ کر بھاگتے تھے اور شہر کی سڑکوں پر مٹر گشتی کر کے شام کو اپنے قفص میں واپس آجاتے تھے مگر اس قفص کو محبوب بنایا عربی زبان کے استاذ سید آفندی محمد نے جو اپنی تعلیم و تربیت کے لئے بہت مشہور تھے اور جن کے پڑھائے ہوئے طلبہ عربی زبان و ادب میں دوسرے طلبہ پر بہت برتر اور فائق تھے۔ استاذ آفندی محمد کے ہاتھوں طلبہ کی ایک کثیر تعداد نے عربی زبان میں ادب میں مہارت حاصل کی۔ میں نے اس مدرسہ منصورہ میں تین سال گزارے اور ۱۸۸۵ء میں اپنی ابتدائی

تعلیم مکمل کی پھر میں نے مصر کا سفر کیا تاکہ مدرسہ خدیویہ میں تعلیم حاصل کر سکوں مجھے اس مدرسے میں اپنے دوست اور بھائی عبدالعزیز فہمی کی صحبت میسر آئی جو میرے لئے ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوئی۔ ہماری ان کی پہلی ملاقات بڑی دلچسپ تھی ایسا ہوا کہ تمام طلبہ کے درمیان نحو کے مسئلے پر مباحثہ ہوا اس میں میرے دوست کی اور میری رائے دوستوں کے مقابلے میں ایک ٹھہری بس اس دن سے ہم دونوں گہرے دوست ٹھہرے۔ جب ہم مدرسے سے منسلک ہوئے تو لوگوں نے ہماری قد کی لمبائی کے حساب سے درجہ بندی کی جو کثیر القامت تھا اسے پہلے سال میں اور جو ذرا طویل تھا اسے دوسرے سال میں داخل کیا اسی طرح اس وقت وزیر تعلیم عبدالرحمٰن رشدی پاشا تھا اور مدرسے کے وکیل یعقوب ارتین پاشا اور نگراں صادق بک شنن تھے۔ یہ نگراں اہل بیت سے محبت اور عقیدت رکھنے میں بہت معروف تھا۔ اگر کوئی اسے برا بھلا کہتا تو اسے یزید کہہ کر پکارتا۔ میں نے مدرسہ خدیویہ میں کئی سال گزار دیئے یہاں تک کہ ۱۸۸۹ء میں وہاں سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس وقت عام ڈگریوں کا نظام تشکیل پائے ایک ہی سال ہوا تھا۔ مدرسہ خدیویہ سرائے مصطفیٰ پاشا میں تھا مگر مدرسة الترجمة و المهندس خانة کا رعب لوگوں کے دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ مہندس خانہ کے طلبہ اپنے مکمل فوجی ڈریس کیوجہ سے ہم سے بالکل الگ تھے اور یہ لوگ اپنے بغل میں تلواریں لٹکائے رکھتے تھے چنانچہ دوسرے طلبہ کے دلوں پر اور خاص طور سے غیر ملکیوں پر ان کا بڑا زبردست اثر پڑتا تھا۔

ان دنوں قاہرہ میں آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے ہر محلے میں نوجوانوں کی ٹولیاں بنی ہوئی تھیں اور ان ٹولیوں میں خون ریز چھڑپیں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔ لڑائی جھگڑے کے واقعات خود طلبہ کے اندر بھی رونما ہوتے رہتے تھے یہاں تک کہ ہمارے یہاں بھی ایک طالب علم پہلوان نکلا جسے منصور کہا جاتا تھا۔ وہ اپنے دوستوں کو لاٹھی چلانا سکھاتا تھا اسی لئے میں ہفتے کی چھٹی کو مدرسے ہی میں رہنا پسند کرتا تھا۔

ابتدائی تین مہینے میں مدرسے سے چمٹا رہا اس کی چہار دیواری سے کبھی باہر نہ نکلا میں نے ان دنوں میں ڈارون (۱) کی کتاب اصل الانواع پڑھ ڈالی اس کا عربی ترجمہ مرحوم شبلی شمیّل (۲) نے کیا تھا میں نے المعلقات کے متعدد قصیدے یاد کر لئے بعض بڑے شعراء کے اشعار بھی مجھے یاد ہو گئے تھے۔ اس مدرسے میں عربی زبان پڑھانے والے اساتذہ میں شیخ حسین والی اور مرحوم پاشا کے والد شیخ محمد حسنین البولاقی تھے اس وقت ہم نحو کی ایک طویل کتاب پڑھا کرتے تھے جو شیخ محمود العالم نام کے ایک مصنف کی تصنیف تھی۔ مدرسہ خدیویہ ہر مہینے اپنے طلبہ کا ٹسٹ لیتا تھا۔ بی اے کے طلبہ نے خواہش ظاہر کی کہ انہیں اس قسم کے ٹسٹ سے مستثنیٰ کر دیا جائے تاکہ وہ عام امتحان کے مباحثہ کی تیاری کر سکیں۔ وہ سب کے سب اس بات پر متفق ہوئے کہ وزیر تعلیم علی مبارک پاشا (۳) کے پاس چلیں اور ان سے

اس قسم کے امتحانوں سے مستثنی ہونے کی اپیل کریں۔ طلبہ نے یہ ذمہ داری میرے سر ڈالی کہ میں ان سے جا کر بات کروں۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا ان کی عادت تھی کہ انہوں نے اپنے دفتر میں ایک بورڈ لگا رکھا تھا اور وہ اپنے پاس آنے والے ہر طالب علم کا امتحان لیا کرتے تھے اور کسی طالب علم کی ضرورت وہ اسی وقت پوری کرتے تھے جب پوچھے گئے ریاضی یا سائنس کے سوالوں کا وہ صحیح جواب دیتا تھا۔ چنانچہ جب میں نے ان کے سامنے دوسرے طلبہ کی نمائندگی کی تو مجھے بلیک بورڈ کے سامنے کھڑا کر دیا اور ریاضی کے ایک سوال کی وضاحت طلب کی جب میں نے ان کے سامنے اس سوال کو حل کر دیا تو انہوں نے اس مسئلے میں دلچسپی لی جسے میں اپنے ہم جماعت ساتھیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کے سامنے رکھ چکا تھا۔

ثانوی تعلیم کے مرحلے میں میں اوسط درجے کا طالب علم تھا میرا شمار نہ تو ممتاز طلبہ میں تھا اور نہ پیچھے رہنے والے طلبہ میں، مگر عربی علوم اور ریاضی میں مجھے ہمیشہ دوسروں پر برتری حاصل رہی یہاں تک کہ بی اے کے سالانہ امتحان میں ریاضی کے زبانی ٹسٹ بورڈ میں صابر پاشا صبری اور احمد کمال بک کو میری امتیازی صلاحیت نے متأثر کیا اور ان دونوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں مدرسہ مہندس خانہ میں داخلہ لے لوں۔ میں نے ان کی بات سن لی مجھے یہ بات معلوم تھی کہ مہندس خانہ بی اے میں فیل ہونے والے طلبہ کو بھی قبول کر لیتا ہے اس لئے اس مدرسہ سے کوئی تعلق قائم کرنے میں میں نے کوئی وقار اور اعزاز محسوس نہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۸۹ء میں میں نے مدرسہ الحقوق میں داخلہ لے لیا اس مدرسہ کو اس وقت لا کالج اور آرٹس کالج دونوں کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں طلبہ ثانوی علوم کے ساتھ ساتھ ادبی علوم پر عربی زبان، نحو و صرف کے قواعد، علم بیان و معانی، علم بدیع، علم عروض و قوافی، تفسیر قرآن کریم، علوم مباحثہ و مناظرہ اور منطق کی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے اور اس میں تعلیم کی مدت پانچ سال تھی۔ اور اس کے نگراں عمر لطفی بک تھے اور اساتذہ میں حسونہ النواوی، حفنی بک ناصف، سلطان بک محمد اور یوروپین معلمین تھے۔

اس وقت میں محلّہ عمر شاہ میں رہتا تھا جس میں شیخ حسونہ النواوی بھی رہائش پذیر تھے۔ میں ان کی قیام گاہ پر آتا جاتا رہتا تھا اور وہ بھی مجھے برابر اپنے پاس بلایا کرتے تھے تاکہ میں ان سے فقہ کا سبق پڑھایا کروں جسے اگلے دن انہیں ازہر میں پڑھانا ہوتا تھا۔ لا کالج میں شیخ محمد عبدہ اور شیخ حسن الطّویل سے بھی شناسائی ہوئی یہ دونوں علوم عربیہ کی امتحانی کمیٹی میں شیخ عبدالکریم سلمان کے ساتھ تھے۔ مجھے سال سوم کے امتحان میں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم سب سے مطالبہ کیا گیا کہ ہم مجرموں کی تعزیر کے سلسلے میں حکومت کے حق کے موضوع پر کچھ لکھیں چنانچہ میں نے اس موضوع سے متعلق مذاہب اربعہ کی وہ تمام کتابیں چھان لیں جنہیں عقوبات و تعزیرات کی تشریح و تفصیل کے سلسلے میں علماء اور

محققین نے ترتیب دیا تھا۔ پھر میں نے ہر مذہب پر تنقید کی تھی اور آخر میں خلاصہ یہ بیان کیا تھا کہ حکومت کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ مجرم کی تعزیر کرے کیونکہ ہر حکومت طاقت کے ذریعہ وجود میں آتی ہے اور محض طاقت کسی کو کوئی حق نہیں دیتی، حق کا وجود تو محض باہمی معاہدے سے ہوتا ہے اور کسی حکومت اور عوام کے درمیان کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہیں ہوتا۔ جب میں امتحان ہال سے باہر نکلا اور میں نے اس کا تذکرہ اپنے ہم جماعت محمود عبدالغفار سے کہا تو انہوں نے میری سوچ اور طرز تحریر پر بہت افسوس ظاہر کیا۔ اور مجھ سے کہا اے لطفی مجھے تمہارے فلسفے سے سخت اختلاف ہے یہ تم نے کیا لکھ دیا ہے؟ انہوں نے مجھے خوف زدہ کر دیا اور مجھے یقین دلایا کہ میرا جواب بالکل غلط ہے اور مجھے اس میں صفر ہی ملے گا مگر جب میں زبانی امتحان کے لئے حاضر ہوا اور کمیٹی کے سامنے پیش ہوا تو شیخ محمد عبدہ نے مجھ سے فرمایا "تم نے جو کچھ لکھا ہے میں تمہیں اس پر مبارکباد دیتا ہوں ہم نے تمہیں سب سے زیادہ نمبر دیئے ہیں اس لئے نہیں کہ تم نے حکومتوں کے خلاف بغاوت کی ہے بلکہ اس لئے کہ تمہارا استدلال اور طرز تحریر بہت عمدہ ہے میرے خیال میں یہی وہ جملے تھے جنہوں نے بعد کے مراحل میں میری بڑی ہمت افزائی کی اور میں نے مرحوم اسماعیل صدقی، اسماعیل الحکیم، عبدالہادی الجندی، عبدالخالق ثروت اور محمود عبدالغفار کے ساتھ مل کر مجلة التشريع نکالا۔ لا کالج کی طالب علمی کے زمانے ہی سے میں نے اخبارات میں لکھنا شروع کیا چنانچہ جریدہ المؤید میں جب استاذ محمد مسعود بک بیمار ہوئے تو میں نے باہر سے آنے والے ٹیلی گراف کے عربی ترجمہ کا کام کیا۔

۱۸۹۳ء کے موسم گرما میں میں نے استنبول کا سفر کیا جب کہ میں لا کا طالب علم تھا چنانچہ اپنے ہم جماعت اور دوست اسماعیل صدقی سے میری ملاقات ہوئی اس وقت خدیو عباس حلمی دوم عثمانی دارالسلطنت پہنچے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں کی حیثیت کچھ اس طرح کی ہو گئی کہ گویا خدیو کے جلسوں میں ہم مصری طلبہ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ میرا گزر استنبول کے ایک قہوہ خانہ سے ہوا وہاں میری ملاقات بعض مصریوں سے ہوئی جن میں سعد زغلول (۴) شیخ علی یوسف اور حفنی ناصف (۵) بھی تھے۔ یہ لوگ سید جمال الدین افغانی سے ملاقات کا منصوبہ بنا رہے تھے میں ان کے ساتھ شیخ افغانی کے گھر تک گیا۔ میں شیخ کی زندگی سے کسی حد تک واقف تھا مگر اس سے پہلے کبھی ان سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ان کی شخصیت بڑی بارعب اور باوقار ہے۔ سیاہ آنکھوں اور لمبے بالوں والا یہ مرد درویش بڑی پرکشش شخصیت رکھتا ہے استنبول کے عام علماء کی طرح عمامہ، جبہ اور پائجامہ زیب تن کئے ہوئے تھے میں ان سے بڑا متاثر ہوا۔ اگلے دن میں نے سعد زغلول سے سید جمال الدین افغانی کی شاگردی اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا سعد نے کہا ضرور جاؤ اور ان کے سامنے اپنی درخواست رکھو۔

میں نے ان کے گھر کا رخ کیا میں پہنچا ہی تھا کہ انہوں نے بڑھ کر حسب معمول میرا استقبال کیا۔ میں نے کہا میں کوئی ملاقاتی نہیں ہوں میں تو ایک شاگرد کی حیثیت سے حاضر ہوا ہوں مرحوم بڑے خوش ہوئے اور مجھ سے وعدہ لیا کہ جب تک میں استنبول میں مقیم رہوں ان کی صحبت اختیار کروں۔ میں نے اس پر بڑی تندہی سے عمل کیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس مدت میں سید جمال الدین افغانی سے سب سے بڑا فائدہ یہ اٹھایا کہ انہوں نے میری غور و فکر کی دنیا لا محدود کر دی۔ انہوں نے میری اس حقیقت کی طرف رہنمائی کی کہ آدمی اپنے نفس کی تربیت اس وقت کر سکتا ہے جب کہ ہر روز کے آخری لمحے میں سونے سے پہلے اپنا محاسبہ کرے کہ اس نے کیا عمل کیا ہے۔ کیا باتیں کہی ہیں اور اس کی کیا دلچسپیاں رہی ہیں۔(۶)

احمد لطفی السید نے ۱۸۹۴ء میں قانون کا مطالعہ مکمل کیا اور قاہرہ میں محکمۂ استغاثہ میں کلرک متعین ہوئے پھر سرکاری وکیل کے سکریٹری مامور ہوئے اس وقت حسن پاشا عاصم سرکاری وکیل تھے پھر بنی سویف میں استغاثہ کے نمائندے مقرر ہوئے جہاں انہیں اپنے دوست عبد العزیز فہمی وکیل استغاثہ سے ملاقات ہوئی۔ وہیں دونوں دوستوں نے مصر کی سیاسی و سماجی صورت حال پر طویل غور و فکر کیا اور ایک طویل سوچ بچار اور منصوبہ بندی کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ انگریزی استعمار سے ملک کو آزاد کرانے کے لئے ایک خفیہ جماعت قائم کی جائے۔ چنانچہ یہ تنظیم قائم ہوئی اور اس کے دوسرے اراکین میں احمد طلعت، حامد رضوان، محمد بدر الدین اور ڈاکٹر عبد الحلیم حلمی جیسے لوگ شامل ہوئے۔ یہ سارے افراد ماہرین قانون تھے پھر اس کے اراکین میں علی بہجت اور محمد عبد اللطیف کا اضافہ ہوا۔

الحزب الوطنی کی تشکیل

قاہرہ میں ایک دن احمد لطفی السید کی ملاقات مصطفیٰ کامل سے ہوئی۔ جنہوں نے پیش کش کی کہ خدیو عباس کو خفیہ تنظیم اور اس کے اغراض و مقاصد سے پوری واقفیت ہے۔ میرے خیال میں اس میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ خدیو سربراہی میں ایک سیاسی پارٹی کی تشکیل میں آپ ہمارے ساتھ اشتراک کریں۔ استاذ لطفی نے اس سے اتفاق کیا۔ مصطفیٰ کامل نے ان سے خدیو سے ملاقات کی اجازت چاہی دونوں نے مل کر زیر تشکیل سیاسی پارٹی کے اغراض و مقاصد پر گفتگو کی۔ خدیو نے ان سے درخواست کی کہ وہ سوئیزرلینڈ کا سفر کریں تاکہ وہ وہاں کی شہریت حاصل کر لیں۔ اور یہ کام وہاں ایک سال اقامت اختیار کر کے ہی ممکن ہے پھر وہ مصر واپس آئیں اور انگریزی استعمار کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک جریدہ کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالیں۔ اس صورت میں برطانوی استعمار کوئی رکاوٹ نہ ڈال سکے گا۔

احمد لطفی السید اور مصطفیٰ کامل وغیرہ محمد فرید کے مکان پر جمع ہوئے اور ایک خفیہ تنظیم کی حیثیت سے الحزب

الوطنی کی تشکیل عمل میں آئی جس کے صدر خدیو مقرر ہوئے اور اس کی رکنیت مصطفیٰ کامل، لطفی السید، محمد فرید، سعید الشیمی یاور الخدیو، محمد عثمان (امین عثمان پاشا کے والد) اور لبیب محرم (انجینئر عثمان محرم کے چچازاد بھائی) نے اختیار کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ تمام اراکین کے خفیہ نام رکھے گئے تاکہ تنظیم کی کارروائی صیغۂ راز میں رہے مثال کے طور پر خدیو کا نام شیخ رکھا گیا، مصطفیٰ کامل کو ابو الفداء کے نام سے یاد کیا گیا اور احمد لطفی السید کو ابو مسلم کے نام سے پکارا گیا۔

لطفی السید اس کے بعد سوئیزر لینڈ چلے گئے وہاں ان کی ملاقات جنیوا کے ایک ہوٹل میں مشہور مستشرق موسیو نافل سے ہوئی۔ دونوں کے درمیان سیاسی مسائل پر طویل گفتگو ہوئی آخر میں موسیو نے صاف صاف کہا کہ :

"یہ نہ سمجھئے کہ انگریزوں کے خلاف یوروپ آپ لوگوں کی کوئی مدد کرے گا میں سمجھتا ہوں کہ مصر کو مصریوں کے سوا کوئی آزادی نہیں دلا سکتا"۔

۱۸۹۷ء کے موسم گرما میں شیخ محمد عبدہ، سعد زغلول اور قاسم امین (۷) بھی جنیوا میں اکٹھا ہوئے۔ مؤخر الذکر اس وقت اپنی مشہور کتاب تحریر المرأۃ تصنیف کر رہے تھے تو انہوں نے اس کتاب کی کئی فصلیں اپنے دوستوں کو پڑھ کر سنائیں پھر انہوں نے سعد زغلول کے ساتھ پیرس کا سفر کیا اور شیخ محمد عبدہ اپنے بقیہ دو دوستوں کے ساتھ وہیں رہ گئے۔ جنیوا یونیورسٹی نے ایم اے کے طلبہ کے لئے فلسفہ اور آرٹ کے مطالعہ کے لئے ایک Summer Camp کا انعقاد کیا تھا، شیخ محمد عبدہ کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے لطفی السید سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ سے ان کا تعارف مدیر ازہر کی حیثیت سے کرادیں اور اس طرح شیخ محمد عبدہ اس کیمپ میں شرکت کے قابل ہو سکے اور اپنے عمامہ اور چغہ کے ساتھ طالب علم بنے۔ استاذ لطفی السید لکھتے ہیں کہ :

> "ایک دن ہم لوگ فرانسیسی زبان کی کلاس میں تھے اور وکٹر ہیوگو (۸) کے ناول پر گفتگو ہو رہی تھی استاذ نے ہم سے اس ناول اور اس کے مصنف کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے کہا اور اس نے ہمیں ایک ہفتے کی مہلت دی۔ متعین دن آیا تو ہم میں سے ہر طالب علم اور طالبہ نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق رائے ظاہر کی۔ ہم کلاس سے باہر نکلے تو دیکھا کہ شیخ کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا وہ کہنے لگے لطفی تمہارے پاس اساتذہ ہیں مگر ہم اساتذہ سے محروم ہیں۔ (۹)

احمد لطفی السید مصر واپس آئے تو جنیوا میں شیخ محمد عبدہ سے ربط قائم کرنے کی وجہ سے یہاں خدیو کو ناراض پایا اس کے باوجود اس کی خدمت میں آپ نے ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی جس میں اپنے تمام سیاسی افکار و مباحث کو مرتب کر دیا تھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مصر کو آزادی اس وقت مل سکتی ہے جب کہ اس کے اپنے فرزند حصول آزادی کے

لئے سر توڑ کوشش کریں اور یہ کہ ملکی مفاد کا تقاضہ ہے کہ خدیو عام تعلیم کی ہمہ گیر تحریک پورے ملک میں چلائیں اور اس کی سرپرستی کریں۔

سیاست میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی بنا پر احمد لطفی السید فیوم کے رکن پارلیمنٹ بنے اس کے بعد یکے بعد دیگرے میت غمر اور رمنیا کے حلقوں سے بھی نمائندگی کی مگر ۱۹۵۰ء میں پارلیمنٹ کی نمائندگی سے استعفا دے دیا۔ پارلیمان سے استعفا دینے والوں میں استاذ عبدالعزیز فہمی بھی تھے جنہوں نے فراغت کے بعد وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا، باہم رائے مشورہ کے بعد احمد لطفی السید نے بھی اس پیشے سے دلچسپی لی اور وکالت ہی کی ذمہ داری مسلسل نبھاتے رہے تا آنکہ الجریدہ کی ادارت کا تاریخ ساز منصوبہ شروع کیا۔

حزب الأمہ کی تنظیم

الجریدہ کے منصۂ شہود پر آنے کے چند ماہ بعد ہی حزب الأمہ سیاسی پارٹی کی تشکیل عمل میں آئی۔ مصری سیاست کی تاریخ میں یہ اہم اقدام ۲۱ر ستمبر ۱۹۰۷ء کو کیا گیا تھا۔ یہ ملک کی سب سے پہلی سیاسی پارٹی تھی جو مصریوں کے سیاسی اور قومی مفاد کے حصول کے لئے وجود میں آئی۔ اس پارٹی نے اپنا سیاسی منشور شائع کیا تو اس میں سرفہرست مکمل آزادی کا مطالبہ اور ایک دستوری حکومت کی تشکیل شامل تھا۔ حزب الأمہ کے سیاسی پروگرام کے مطابق مجلس شوریٰ کے دائرہ عمل کی توسیع اور ضلعی کمیٹیوں کے اختیارات میں اضافہ کو فی الفور نافذ کرنا تھا تاکہ ملک میں ایک پارلیمنٹ کی تشکیل کی راہ ہموار ہو سکے جس میں پورے ملک کی عوامی نمائندگی شامل ہو۔ پارٹی کے اولین صدر محمود سلیمان پاشا(۱۰) منتخب ہوئے۔ حسن عبدالرازق پاشا(۱۱) اور علی شعراوی پاشا(۱۲) اس کے نائب صدر بنے جب کہ احمد لطفی السید کو جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ اسی دن نائب صدر حسن عبدالرازق پاشا نے ایک پرجوش تقریر کی جس کا موضوع ملک کے سیاسی اور معاشرتی مسائل تھا۔ انہوں نے سیاسی پارٹیوں کی تشکیل پر بطور خاص زور دیا۔ یہ مصر کی وہی فوری ضرورت تھی جس کی طرف شیخ محمد عبدہ نے توجہ دلائی تھی۔ سیاسی پارٹی کی تشکیل کی یہ ضرورت اور اس کے مختلف گوشے ہمدردوں اور مخلصین کے دماغوں میں روشن ہوتے رہے یہاں تک کہ حزب الأمہ وجود میں آئی۔ ملکی سیاست کے فوری تقاضے کی اس تکمیل نے ملک کے ارباب حل و عقد، مقتدر علماء اور سیاست دانوں کو متوجہ کیا، چنانچہ اس کے ارکان کی تعداد ۷۵۰ ہو گئی۔

استاذ علی یوسف جو مصری سیاست اور سماج کے ایک ماہر نباض تھے، اور ملک میں فرانسیسیوں کے انخلاء اور قومی حکومت کی تشکیل کے پرزور حامی تھے انہوں نے دستوری حکومت کی تشکیل کے لئے سیاسی پارٹی حزب الاصلاح

قائم کی۔اس کے بعد معروف سیاست داں اور قومی رہنما مصطفیٰ کامل نے الحزب الوطنی قائم کی۔اس طرح مصر میں تین بڑی سیاسی پارٹیاں وجود میں آگئیں۔ آزادی کی جدوجہد اور دستوری حکومت کی تشکیل میں ان تینوں پارٹیوں نے الگ الگ طریقۂ کار اختیار کیا(۱۳)۔

حزب الأمة کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسکی تشکیل و ترقی میں مختلف عناصر کی کوششیں کارفرما تھیں۔ ایک عنصر جاگیرداروں کا تھا جو قومی اور وطنی مقاصد کے حصول کے لئے بر سر پیکار تھا جب کہ دوسرا عنصر دانشوروں، ادیبوں اور مفکروں پر مشتمل تھا۔ استاذ احمد لطفی السید اس دوسرے عنصر کی نمائندگی کرتے تھے۔ جاگیردار اور اصحاب ثروت نرم پالیسی اختیار کرنے کے قائل تھے۔وہ ایک طرف کسی ایسے دستور کے نفاذ کے حامی تھے جس سے حزب الامة ایک طرف حکومت میں بھی شریک ہو سکے اور دوسری طرف بتدریج کامل آزادی بھی حاصل ہو سکے جبکہ ادیبوں اور دانشوروں کا گروہ کسی قسم کی نرمی، رواداری اور مداہنت کا قائل نہ تھا۔ وہ دستور کے نفاذ اور مکمل آزادی کا علمبردار تھا۔ گرچہ تدریج کا وہ منکر نہ تھا۔ مگر یہ دونوں عناصر مقصد کے حصول پر پوری طرح متفق تھے انہوں نے قوم کے ساتھ کسی قسم کی کوئی غداری نہیں کی اور آپسی انتشار کو اتنا زیادہ نہ بڑھنے دیا کہ استعمار کو استحصال کرنے کا موقع مل سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سیاسی پارٹی پر اعتدال، عقلیت اور دانشوری کا غلبہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ استاذ احمد لطفی السید "عثمانی وحدت" کے بجائے مصری وحدت کے قائل تھے اور قومی مسائل کو حل کرنے میں تدریج سے کام لینے پر یقین رکھتے تھے۔

حزب الامة کی تشکیل کے وقت محمود سلیمان پاشا کے نائب کی حیثیت سے استاذ احمد لطفی السید نے جو تقریر کی اس میں اس طریقۂ کار پر کھل کر اظہار کیا: (۱۴)

> "اگر مصری مسئلہ یا مصر کی آزادی کا مطالبہ محض یوروپ کی پیداوار ہے جیسا کہ لارڈ کرومر کہتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ بلاشبہ تیاری، جدوجہد اور کشمکش کی تمام سرگرمیاں جو لازمی طور پر منتج ہوتی ہیں وہ مصریوں کے درمیان ہی انجام پا رہی ہیں اور یہ مصری انسانوں کی بالکل ذاتی جدوجہد ہے جس میں یوروپ کو کوئی دخل نہیں۔ یہ مصریوں ہی کی جدوجہد ہے کہ وہ تعلیم و تعلم کے میدان میں پیش رفت کر رہے ہیں اور اپنے معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کو سدھارنے کے لئے مصروف عمل ہیں۔ اب اس کے بعد یوروپ کا کام بس اتنا ہی رہ جاتا ہے کہ وہ ہماری آزادی کا اعلان و اعتراف کرے۔ یوروپ کے اس اقدام کا اسی وقت انتظار کیا جا سکتا ہے جب کہ ہم اپنے قومی اور وطنی مقدس

فرائض کی انجام دہی سے فارغ ہو جائیں یعنی آزادی کے لئے ناگزیر تمام اسباب و وسائل کو جمع کر لیں"۔(۱۵)

اس کے بعد فاضل خطیب نے سیاسی حالات، رائے عامہ، اخبارات ورسائل، موجود نظام کار، اور معاشرتی اور اقتصادی حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور فرمایا:

"یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لئے جو جدوجہد کریں وہ ہمارے سیاسی مطالبات کی رفتار اور مقدار سے پوری طرح ہم آہنگ ہو اور ہم انگریزوں کے رد عمل سے مایوس نہ ہوں۔ ایمان داری کی بات یہ ہے کہ انگریزوں کا اصول جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا ہے گرچہ بیسویں صدی کے سیاستدانوں میں کسی کی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ اس باطل نظریہ کی تائید کر سکیں"۔

استاذ احمد لطفی السید کی یہ تقریر پچاس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ تقریر حزب الأمة کی اختیار کردہ پالیسی کا تفصیلی پروگرام سمجھی جاتی ہے اسی لئے اس میں ملک کے متعدد مسائل زیر بحث آتے ہیں جیسے ضلعی کمیٹیوں کا نظام، عدالتی نظام، وفاق کی سیاست، ذاتی اور شخصی حکومت کا نظریہ، مصر کا عثمانی دستور سے تعلق، دستوری حکومت کے خلاف انگریزوں کی مزاحمت، پارلیمانی حکومت کے لئے مصریوں کی صلاحیت و قابلیت اور شخصی اور عوامی آزادی کے حقوق کے مسائل وغیرہ۔ فاضل مقرر نے دو اہم مقاصد کو اپنی تقریر میں بطور تلخیص کے بیان کیا:

۱۔ پارلیمانی حکومت ہی قوم کی ترقی واصلاح کی ضامن ہو سکتی ہے اور یہ کہ پوری قوم دستوری حکومت کے مطالبے میں مجلس شوری کی تائید و حمایت کرتی ہے۔

۲۔ موجودہ حکومت دستوری تحریک کی مخالفت کر کے اور شخصی آزادی کو کچل کر قانون کے حدود سے تجاوز کر رہی ہے اور عوام کی رائے اور رضامندی کو پامال کر رہی ہے اس لئے اس کے خلاف احتجاج کرنا فرض ہے۔

یہ تھا طرز فکر اور اسلوب نگارش جس کی نمائندگی استاذ احمد لطفی السید نے الجریدہ کے صفحات میں کی۔ اس اخبار کا مشن ہی یہ تھا کہ آزادی کے حصول کے لئے معاون تمام سرگرمیاں انجام دی جائیں اور ایک صحت مند دستوری حکومت کے مطالبہ کی کھل کر حمایت کی جائے۔ اس اخبار کے تمام مقالات و مضامین از اول تا آخر اسی مشن کا طواف کرتے نظر آتے ہیں۔

دوسری سیاسی پارٹیوں کی طرح حزب الامة سے بھی حکومت اس وقت ناراض ہو گئی جب اس نے پریس

کے موجودہ قانون اور نہر سوئیز کے ٹھیکے سے متعلق اپنے موقف پر اصرار کیا۔ ۱۹۰۹ء میں پریس قانون کو مصری حکومت نے از سر نو بحث کا موضوع بنایا۔ چنانچہ احمد لطفی السید نے لندن کے سفر میں اس اہم مسئلہ پر کافی غور و تدبر کیا اور انگریز وزیر خارجہ سر ایڈورڈ گرائے سے ملاقات کی لیکن وزیر موصوف نے اس مسئلہ کو وکیل الوزارۃ مسٹر مالیٹ کے حوالے کر دیا۔ چنانچہ وہ میمورنڈم جو احمد لطفی نے تیار کیا تھا اسے قبول کیا اور اسے نافذ کرنے کا وعدہ کیا نہر سوئیز کے ٹھیکہ کا مسئلہ بھی ۱۹۰۹ء ہی میں پیش آیا۔ سوئیز کمپنی چار میلین جنیہہ کے بدلے اگلے چالیس سال کا مزید ٹھیکہ لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ سر ایلڈون گورسٹ اور پطرس غالی اس نظریہ کے حامی تھے۔ احمد لطفی السید نے اس مسئلے پر حسین رشدی (۱۶) اور سعد زغلول سے بات کی۔ ان دونوں نے پطرس غالی اور مالی مشیر کا حوالہ دیا اور ان سے گفتگو کرنے کا مشورہ دیا۔ آخر الذکر سے جب ملاقات کی تو اس نے اس مسئلہ کو اسمبلی میں بحث کے لئے اٹھانے سے انکار کر دیا، چنانچہ انہوں نے وزیر اعظم پطرس غالی سے ملاقات کی اور حزب الأمۃ کی جانب سے اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا۔ ان کی طویل گفتگو سن کر وزیر اعظم نے یہ کہہ کر معاملے کو ٹال دیا:

"لطفی کیا تم آسمان سے اتر کے زمین پر نہیں آؤ گے کہ ہمارا ساتھ دے سکو!"

مجبور ہو کر آپ نے صحافت کا سہارا لیا اور متعدد مقالات الجریدہ میں شائع کئے۔ ان تحریروں کا رائے عامہ پر بڑا زبردست اثر پڑا اور ہر طرف سے احتجاج ہونے لگا۔ مجبور ہو کر سوئیز کمپنی نے اسمبلی میں اس مسئلے کو اٹھانے سے اتفاق کیا اور جب ایوان میں یہ تجویز زیر بحث آئی تو مسترد ہو گئی۔

احمد لطفی السید نے عثمانی وحدت کی جگہ مصری وحدت کا نعرہ بلند کیا جس پر تفصیلی گفتگو آئندہ آ رہی ہے مگر یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ حالات کے دباؤ میں انہوں نے اس نظریہ کو اختیار کیا تھا۔ کیونکہ ۱۹۱۱ء میں لیبیا میں اٹلی اور ترکی جنگ چھڑی اور اٹلی نے طرابلس پر یلغار کر دی۔ اس وقت فاضل مفکر نے موقع کو غنیمت سمجھا اور یہ نعرہ بلند کیا کہ مصر مصریوں ہی کے لئے ہے اور ترکی کی ماتحتی میں مصر کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ اس کی ترقی کی راہ کی رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں۔ اسی دوران دمیاط کے ایک تاجر کی جانب سے انہیں ایک خط ملا جس میں اس نے شکایت کی تھی کہ اطالویوں نے سمندر میں چاول سے بھرے ہوئے اس کے ایک جہاز کو روک رکھا ہے کیونکہ اس پر ترکی علم لہرا رہا ہے جو مصر کا بھی علم تھا۔ یہ اطلاع ملتے ہی وہ وزیر خارجہ حسین رشدی کی خدمت میں پہنچے اور اس سے اس جہاز کو واگزار کرانے کا مطالبہ کیا۔ ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں دوبارہ وزیر خارجہ کے پاس پہنچے اور ان سے مطالبہ کیا کہ اسٹیمروں پر ترکی علم کی جگہ کوئی مصری علم لگایا جائے وہاں موجود بعض حاضرین نے بتایا کہ اس پر عمل ہو چکا

ہے۔ لطفی پھر وزیر خارجہ کی خدمت میں آئے اور عثمانی سلطنت سے مصر کی آزادی کے اعلان کا مطالبہ کیا اور یہ درخواست کی کہ خدیو کو مصر کا بادشاہ مقرر کر دیا جائے۔ اس مطالبے سے خدیو کو مسرت ہوئی مگر لارڈ کچنر کافی غضب ناک ہوا۔ اس نے صراحت کی کہ انگلینڈ اس پر عمل درآمد نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ترکی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ لطفی بذات خود کچنر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس مسئلہ پر اس سے گفتگو کی۔ کچنر نے کوئی مثبت جواب نہ دیا چنانچہ لطفی وزیر خارجہ سے ملے وہاں خدیو کی یہ تجویز زیر بحث آئی کہ عدلی پاشا، سعد پاشا اور لطفی السید پر مشتمل ایک وفد تشکیل دیا جائے جو اس مقصد کے حصول کے لئے براہ راست انگریزی حکومت سے ملے اور انگریز رائے عامہ کو اس کے حق میں ہموار کرے۔ مصری سیاست نے اسی دوران ایک اور پلٹا کھایا۔ امیر عمر طوسون اور بعض امراء اور اشراف ترکی اور اٹلی کے درمیان جنگ میں ترکی کی حمایت کرنے کے لئے بھاری چندہ جمع کرنے لگے اور تمام مصری اخبارات نے اس مہم کی زبردست حمایت کی مگر اخبار الجریدہ اور اس کے فاضل مدیر اپنے موقف پر ڈٹے رہے وہ مصریوں کو ان کی غلطی پر ٹوکتے رہے اور مصری وحدت و قومیت کے نظریہ کی تائید میں مقالات شائع کرتے رہے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی عالمی جنگ چھڑی اور انگریزوں نے مصر میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا اس وقت کے وزیر اعظم حسین رشدی سے احمد لطفی السید نے ملاقات کی اور ان کے ذہن میں یہ سوال ڈالا کہ کیا ہم مفت میں اس جنگ میں شریک ہو جائیں اگر انگریز یہ چاہتے ہیں کہ وہ مصر کو اس جنگ میں گھسیٹیں تو انہیں پہلے ہمارے ملک کی آزادی کا اعلان کرنا ہوگا۔ وزیر اعظم نے کہا میرے خیال میں ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ لطفی کو اس جواب سے اطمینان نہ ہوا انہوں نے رشدی پاشا، عدلی پاشا اور اپنے آپ پر مشتمل ایک وفد تشکیل دیا اور یہ وفد انگریز کارپردازوں سے ملا اور ان کے سامنے اپنا یہ مطالبہ رکھا۔ انہوں نے برطانوی حکومت کے سامنے مسئلے کی اہمیت کو واضح کرنے کا وعدہ کیا انگریز گورنر اس وفد کے ارکان کو وعدوں سے بہلاتا رہا اور لیت و لعل سے کام لیتا رہا۔ آخر کار یہ لوگ مایوس ہو کر رہ گئے۔ احمد لطفی السید کی مایوسی سب سے زیادہ شدید تھی، وہ اس المیہ سے اتنے بددل ہو گئے کہ انہوں نے کہا کہ میں اپنا قلم توڑ دوں گا اور اپنے ملک پہنچ کر سیاست سے گوشہ گیر ہو جاؤں گا چنانچہ یہی ہوا۔ انہوں نے اخبار الجریدہ کی ادارت سے استعفا دے دیا اور اپنے گاؤں برقین کو روانہ ہو گئے۔ یہ مصری صحافت سے ان کا آخری تعلق تھا۔ وہ اپنے گاؤں ایک طویل مدت تک مقیم رہے یہاں تک کہ خدیو عباس کی معزولی کا اعلان ہوا اور امیر حسین کامل (۱۷) سلطان مقرر کئے گئے۔ مصری سیاست میں ایسی اتھل پتھل ہوئی کہ ترکی نے سلطان حسین اور رشدی پاشا وزارت کے اراکین کو پھانسی دینے کا حکم سنایا۔ خود لطفی السید بھی مصری وحدت و قومیت کے علمبردار ہونے کی وجہ سے قابل مؤاخذہ ٹھہرے۔

۱۹۱۵ء میں جب کہ لطفی قاہرہ میں مقیم تھے ان کے والد گاؤں سے بھاگے آئے اور یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ سعد زغلول کی پھانسی کی افواہ اڑی ہوئی ہے مجھے اندیشہ ہے کہ انگریز تمہیں بھی قابل گردن زدنی قرار دیں، دونوں باپ بیٹے علی شعراوی کے گھر پہنچے وہاں صاحب خانہ نے کہا کہ سلطان حسین حکومت میں شامل ہونا چاہتے ہیں بوڑھے باپ نے بیٹے کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ بھی حکومت میں شریک ہو جائے تاکہ وہ انگریزوں کی دارو گیر سے بچ سکے۔ چنانچہ باپ کی خوشی میں لطفی السید نے یہ تجویز قبول کرلی چنانچہ وہ بنو سویف میں حکومتی منصب کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ بعد میں دار الکتب المصریة کے ڈائرکٹر کے عہدے پر سلطان نے ان کا تقرر کیا۔ یہاں انہیں تعلیم و تصنیف کے بڑے مواقع ملے چنانچہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ارسطو کی بعض کتابوں کا ترجمہ کیا اور اپنے بعض ساتھیوں کو کچھ دوسری کتابوں کے ترجمے پر ابھارا۔ غالباً یہی دور ہے جب کہ آپ نے ارسطو کی پانچ کتابوں کتاب الطبیعة، کتاب الکون والفساد، کتاب السیاسة اور اخلاقیات پر دو مزید کتابوں کو عربی قالب میں تبدیل کیا۔ (۱۸)

صدر امریکہ ولسن نے ۱۴ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا اور ہر قوم کو حق خود اختیاری اور اپنی مرضی کے مطابق حکومت تشکیل دینے کے بنیادی حق کو علی الاعلان تسلیم کیا تو مصری رہنماؤں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا چنانچہ سعد زغلول، لطفی السید، عبد العزیز فہمی، علی شعراوی اور محمد محمود سر جوڑ کر بیٹھے کہ ان اعلانات سے وہ کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں استاذ لطفی السید نے دار الکتب المصریة کے ڈائرکٹر کے عہدہ سے استعفا دے دیا اور سیاسی پارٹی وفد المصری کی تشکیل میں ہمہ تن مصروف ہو گئے مگر انگریزوں نے سیاسی تحریک کو دبانے کی قسم کھا رکھی تھی چنانچہ سعد زغلول، محمد محمود، اسماعیل صدقی اور حمد الباسل جیسے چوٹی کے رہنماؤں کو مالٹا میں جلاوطن کر دیا۔ بس یہیں سے انقلاب ۱۹۱۹ء کے شعلے بھڑک اٹھے۔ مصری قوم شعلۂ جوالہ بن گئی۔ ضلع منیا میں ڈاکٹر محمود عبد الرازق بک کی صدارت میں ایک عوامی کمیٹی تشکیل پائی جس نے بجلی کے تار کاٹ دیئے اور ریلوے لائن کو اکھاڑ کر پورے ملک کے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض دوسرے ضلعوں میں بھی اس طرح کی کمیٹیاں تشکیل پائی تھیں اور انہوں نے حکومتی نظام کو درہم برہم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لطفی السید الوفد المصری اور اس انقلاب کی تمام تفصیلات ایک روزنامچہ میں درج کرتے رہتے تھے۔ اس دوران یہ افواہ گرم ہوئی کہ انگریزوں کی فوجی حکومت الوفد المصری کے دوسرے اراکین کے گھروں کی تلاشی لینے جا رہی ہے اور انہیں گرفتار کر کے اگلے دن گولی مار دے گی۔ یہ خبر جیسے ہی لطفی السید تک پہنچی وہ اپنے گھر میں روپوش ہو گئے اور تمام سیاسی کاغذات انہوں نے نذر آتش کر دیئے جن میں رشدی، عدلی اور ثروت وغیرہ کا تذکرہ تھا انہیں اندیشہ لاحق تھا کہ ان کاغذات سے دوسرے رہنماؤں کے ناموں کا پتہ چل جائے

گا اور مبادا وہ بھی حکومت کے عتاب کا شکار ہوں گے۔

احمد لطفی السید اپنے گھر کی پولس تلاشی کے منتظر ہی رہے مگر ایسا کوئی حادثہ اس دوران رونما نہ ہوا۔ پھر دوسرے اراکین کے ساتھ مل کر احمد لطفی السید نے مصری انقلاب پر ایک تفصیلی یادداشت تیار کی اور اسے انگریز حاکموں کی خدمت میں پیش کیا۔ بعد میں ملاقات اور بحث و مباحثہ کے بعد ان کے استدلال سے انگریز حاکم مطمئن ہوئے اور جلاوطن رہنماؤں سے پابندی اٹھانے کا اعلان کیا۔ وفد کے بقیہ رہنماؤں کو اجازت دی گئی کہ وہ ایک فوجی جہاز کے ذریعہ انگلینڈ جائیں یہ جہاز ان اراکین کو لے کر مالٹا پہنچا وہاں سے سعد زغلول، صدقی پاشا، محمد محمود اور حمد الباسل کو بھی ساتھ لیا۔ یہ لوگ ابھی راستے ہی میں تھے کہ انہیں ایک برقیہ موصول ہوا کہ صدر امریکہ مسٹر ولسن نے مصر کے معاملے میں انگریزوں کی حمایت کرنے کا اعلان کیا ہے یہ خبر مصری رہنماؤں کے لئے بڑی جاں کاہ ثابت ہوئی۔ وہ شخص جس نے تمام دنیا کی مظلوم اقوام کی آزادی و حریت اور ان کے بنیادی حقوق کا اعلان و اعتراف کیا تھا میدان عمل میں آکر ظالموں کا ساتھی نکلا۔ مصری رہنما اس خبر سے سخت پریشان ہوئے تاہم انہوں نے پیرس کا رخ کیا اور امن کانفرنس میں شرکت کی کوشش کی مگر وہاں بھی ان کے لئے دروازے بند تھے۔

بعد کے مراحل میں مصری سیاست ایک نازک موڑ پر پہنچ گئی جب کہ سعد زغلول اور عدلی یکن کے درمیان انگریز حاکموں سے گفت و شنید کے مسئلہ پر اختلاف ہو گیا۔ اختلاف کی شدت اتنی بڑھی کہ باقاعدہ ایک دوسرے کی مخالفت شروع ہو گئی اور دونوں رہنماؤں کے درمیان رسہ کشی کا آغاز ہو گیا۔ اس سیاسی کشمکش میں کسی ایک فریق کا ساتھ دینا لطفی السید نے مناسب نہ سمجھا مجبور ہو کر انہوں نے سیاست ہی کو خیرباد کہہ دیا اور دارالکتب المصریة کی ملازمت دوبارہ اختیار کر لی اور قدیم جامعہ مصریہ جس کے وہ مہتمم تھے کے معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی۔

۱۹۲۲ء میں احمد لطفی السید نے جامعہ مصریہ کو آرٹس کالج بنانے کا ایک نیا منصوبہ پیش کیا اور اس مسئلہ پر ملک فؤاد سے ملاقات کی اور ان سے یہ درخواست کی کہ دوسرے اعلیٰ مدارس کی طرح جامعہ مصریہ کی ڈگری کو بھی حکومت تسلیم کر لے۔ ملک فؤاد نے اس کے جواب میں یہ تجویز رکھی کہ حکومت خود ایک یونیورسٹی بنانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جامعہ مصریہ کو اس یونیورسٹی کا آرٹس کالج تسلیم کر لیا جائے۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ۱۲/ دسمبر ۱۹۲۳ء کو جامعہ مصریہ کی مجلس منتظمہ کی میٹنگ ہوئی تاکہ جامعہ کو وزارت تعلیم کی تحویل میں دینے کا فیصلہ کیا جا سکے۔ اس موقع پر احمد لطفی السید نے ایک معاہدہ تحریر کیا جس پر وزیر تعلیم احمد زکی ابو السعود پاشا نے دستخط کئے اور رئیس الجامعہ حسین رشدی نے بھی اس معاہدہ پر دستخط کئے اس طرح ۱۹۰۸ء میں قائم ہونے والی قدیم مصری جامعہ اب

حکومت کی تحویل میں چلی گئی۔ احمد لطفی السید نے معاہدہ کی شرائط میں ڈاکٹر طہ حسین (۱۹) کو جدید یونیورسٹی میں استاذ مقرر کرنے کی سفارش بھی شامل کی تھی۔ ۱۹۲۵ء تک لطفی السید دار الکتب المصریة کے ڈائرکٹر رہے۔ اسی سال انہیں نئی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنادیا گیا۔

نئی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس کی سربراہی احمد لطفی السید کے ہاتھوں میں آئی تو یہ یونیورسٹی مصری سیاست و معاشرت کے مختلف میدانوں میں قومی اتحاد کے لئے ایک منارۂ نور بن گئی۔ اس نے اجتماعی و معاشرتی انقلاب برپا کرنے کیلئے ہراول دستہ کا کام کیا۔ اس یونیورسٹی کے متعدد مقاصد تھے۔

- نئی نسلوں کی تربیت اور زندگی کے تمام شعبوں میں قیادت کے لئے نوجوانوں کی تیاری
- علمی وادبی تحقیقات کی ہمت افزائی اور تمام شعبوں میں علم وادب اور تہذیب وثقافت کی نشر واشاعت۔
- محاضرات، مذاکرات اور مباحثوں کے ذریعے نیز مختلف قسم کی کتابوں اور تصنیفات کو شائع کر کے تعلیم کو عام کرنا۔
- معاشرتی انقلاب کے لئے نثر وشعر کے مختلف میدانوں میں تجدید، مختلف فنون لطیفہ کے تئیں عوام کے نقطۂ نظر کو تبدیل کرنا اور ان کی اشاعت وترقی کے لئے پروگرام بنانا جیسے موسیقی و نغمہ اور انسانی اخلاقیات پر ان کے اثرات وغیرہ۔

قدامت پرستوں اور علماء کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس نئی یونیورسٹی نے لڑکوں اور لڑکیوں کے مختلف پروگرام رکھے۔ لطفی السید اور ان کے حامیوں نے پوری کوشش کی کہ یہ مسئلہ اخبارات کا موضوع نہ بنے تاکہ رائے عامہ کی تشکیل سے پہلے کسی قسم کا فتنہ وفساد نہ کھڑا ہو۔

ملک فؤاد نے جون ۱۹۲۸ء میں محمد محمود پاشا کو تشکیل وزارت کی دعوت دی انہوں نے احمد لطفی السید سے بھی اشتراک کی درخواست کی۔ لطفی نے مصری یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی ذمہ داریوں کا حوالہ دیتے ہوئے معذرت ظاہر کی اور سیاست اور اس کے مسائل سے دور رہنے ہی میں عافیت سمجھی مگر محمد محمود پاشا نے جب پیہم اسرار کیا تو وزیر تعلیم کا منصب قبول کر لیا۔ دراصل یہ وزارت ان کے ذاتی رجحانات سے ہم آہنگ تھی اور اس کے ذریعے تعلیم وتربیت کے مشن کو زیادہ بہتر طریقے سے وہ جاری رکھ سکتے تھے مگر ۱۲/ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو یہ وزارت مستعفی ہو گئی اور لطفی السید پھر اپنی علمی دنیا میں واپس آگئے۔

۱۹۳۰ء کے اوائل میں دوبارہ لطفی السید کو مصری یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا گیا اور وہ از سر نو اس ذمہ داری کی

ادائیگی میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے اس بات کی بھر پور کوشش کی کہ یونیورسٹی کی آزادی و خود مختاری کی ہر حال میں تکریم اور احترام کیا جاتا رہے مگر مارچ ۱۹۳۲ء میں وزارت تعلیم نے یونیورسٹی کی خود مختاری پر شب خوں مارا۔ چنانچہ ڈاکٹر طہ حسین کو آرٹس کالج کی ڈین شپ سے ہٹادیا۔ لطفی السید اس صورت حال پر تلملا اٹھے۔ انہوں نے اس وقت کے وزیر اعظم اسماعیل صدقی پاشا سے ملاقات کی اور یونیورسٹی کی خود مختاری کے مسئلہ پر اپنے موقف کی وضاحت کی اور فرمایا کہ یونیورسٹی طہ حسین سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اس وقت کے وزیر تعلیم حلمی عیسی پاشا کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اور ان سے کسی قسم کی کشمکش کے اندیشہ کو پیش نظر رکھ کر یہ تجویز رکھی کہ طہ حسین کو ڈین کے بجائے ایک استاد کے عہدہ پر بحال کر دیا جائے۔ چنانچہ وزیر اعظم نے اس رائے سے اتفاق کیا مگر اگلے ہی دن یہ افواہ اڑی کہ وزارت تعلیم نے احمد لطفی السید کی تجویز مسترد کر دی ہے۔ چنانچہ انہوں نے یونیورسٹی جانا چھوڑ دیا اور اپنا استعفا نامہ تیار کر لیا۔ یہ واقعہ ۹/ مارچ ۱۹۳۲ء کا ہے۔ اپریل ۱۹۳۵ء تک احمد لطفی السید یونیورسٹی سے الگ تھلگ رہے تا آنکہ نسیم پاشا کی دوسری وزارت میں نجیب الہلالی وزیر تعلیم بنے اور انہوں نے احمد لطفی السید سے وائس چانسلر کے عہدے پر کام کرنے کی درخواست کی۔ اس کے جواب میں احمد لطفی السید نے یونیورسٹی کے قانون میں ترمیم کی شرط رکھی کہ یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ کی منظوری کے بغیر وہاں کے کسی استاذ کو کہیں دوسری جگہ منتقل نہ کیا جائے۔ وزیر تعلیم نے اس ترمیم کو قبول کیا تو لطفی السید دوبارہ وائس چانسلر کے عہدہ پر کام کرنے لگے، یہ صورت حال ۱۹۳۷ء تک باقی رہی مگر اس کے بعد سیاسی پارٹیوں کا عمل دخل یونیورسٹی میں بہت زیادہ ہو گیا اور وہ طلبہ کو اپنے مقاصد کے لئے براہ راست استعمال کرنے لگیں اور یونیورسٹی میں عمومی بھائی چارہ اور تعلیمی سکون درہم برہم ہونے لگا اور تعلیمی اقدار و روایات کے انہدام کا اندیشہ محسوس ہوا۔ احمد لطفی السید نے وزارت داخلہ سے مطالبہ کیا کہ یونیورسٹی میں امن و امان کو بحال رکھنے کے لئے پولس متعین کی جائے مگر جب ان کی درخواست لائق توجہ نہ سمجھی گئی تو انہوں نے دوسری بار پھر استعفا دے دیا۔ تین مہینوں کے بعد ۳۱ دسمبر کو محمد محمود پاشا الکبری کی وزارت تشکیل پائی تو احمد لطفی السید وزیر مملکت بنائے گئے۔ پھر عام انتخابات ہوئے اور اس کے نتیجہ میں محمد محمود پاشا دوسری بار وزارت کی تشکیل کے لئے کمر بستہ ہوئے تو لطفی السید پہلے وزیر مملکت بنے اور پھر وزیر داخلہ کے عہدے پر مامور ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے وزارت کو خیر باد کہہ دیا تا کہ سعد نوازوں کو بھی وزارت میں شامل کر لیا جائے اور وسیع تر حکومت کی بنیاد پڑ سکے۔

کچھ دنوں کے بعد وزیر تعلیم ڈاکٹر حسین ہیکل نے احمد لطفی السید سے ملاقات کی اور انہیں مصری یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدہ کو دوبارہ قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ ارباب حکومت یونیورسٹی کے طلبہ سے

کسی قسم کا رابطہ نہ رکھیں گے۔ ۱۹۴۱ء تک وہ اس عہدہ پر کام کرتے رہے تا آنکہ حسین سری پاشا(۲۰) وزیر اعظم نے انہیں سینیٹ کی رکنیت کی پیش کش کی۔ احمد لطفی السید نے یونیورسٹی کی ایک طویل مدت تک خدمت کرنے کے بعد سکون کا سانس لینے کے لئے نئی ذمہ داری کو قبول کر لیا۔(۲۱)

مجمع اللغۃ العربیۃ کا قیام

احمد لطفی السید کی حیات وخدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے مجمع اللغۃ العربیۃ کی تشکیل کو نظر انداز نہیں کیا سکتا۔ ۱۹۱۶ء میں انہوں نے عدلی یکن، حسین رشدی، یعقوب صروف(۲۲)، اسماعیل عاصم(۲۳) ایڈوکیٹ سے اس مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت پر گفتگو کی۔ ان سارے احباب کے درمیان اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ عربی زبان وادب کے فروغ کے لئے ایک اکیڈیمی کی تشکیل عمل میں آئے جو وزارت تعلیم کی ماتحت نہ ہو اور عارضی طور پر اس کا دفتر دار الکتب المصریۃ میں ہو۔ پھر احمد لطفی السید نے حفنی ناصف اور عاصف برکات سے ملاقات کی اور تینوں نے مل کر اکیڈیمی کا دستور مرتب کیا۔ انہوں نے اس کا چیئرمین شیخ الازھر محمد ابوالفضل الجیزاوی (۲۴) کو بنایا اور اراکین میں شیخ عبدالرحمٰن قراعہ، شیخ محمد بخیت(۲۵)، شیخ سکندری(۲۶)، حفنی ناصف اور حلمی عیسی(۲۷) پاشا کو نامزد کیا۔ جلد ہی اس اکیڈیمی کی بساط لپیٹ دی گئی مگر کچھ عرصہ بعد اس نے از سر نو کام کرنا شروع کیا۔ احمد لطفی السید شروع سے آخر تک اس علمی اکیڈیمی کے ڈائرکٹر رہے۔

۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۳ء میں احمد لطفی قاہرہ میں اپنے رب سے جا ملے۔ ان کے انتقال پر ملال پر پورے مصر اور عالم عرب میں صف ماتم بچھ گئی۔ تمام مصنفین، محققین، سیاست دانوں اور ہر طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور دانشوروں نے انہیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا مجلّہ المجمع العلمی العربی دمشق نے بھی ان کی وفات پر ایک جامع تعزیتی ادارتی نوٹ تحریر کیا جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

> "مارچ کے مہینہ میں قاہرہ میں عالم عرب ایک بڑے عالم، ایک نابغۂ روزگار فلسفی، ایک عظیم مفکر اور ایک جلیل القدر مربی سے محروم ہو گیا ہے اور وہ ہیں مرحوم احمد لطفی السید رئیس مجمع اللغۃ العربیۃ۔
>
> جو شخص اس عظیم شخصیت کی زندگی پر نگاہ ڈالے گا وہ تین اہم پہلوؤں سے ضرور واقف ہو کر رہے گا جو صحافت، سیاست اور فلسفہ کے میدانوں میں بہت نمایاں ہیں۔
>
> میدان صحافت میں پہلی عالمی جنگ سے پہلے آپ نے اخبار الجریدہ کی بنیاد رکھی مگر ۱۹۱۵ء

میں جب انگریزوں نے ان کے گرد گھیرا تنگ کیا تو وہ اخبار بند کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس مختصر مدت کے باوجود یہ اخبار احمد لطفی السید کے افکار کی جولان گاہ تھا۔ ان افکار میں فکر جدید کا عکس بھی شامل تھا اور صحت مند رائے اور دانش ورانہ رہنمائی کی روشنی بھی۔

میدان سیاست میں آپ کا مقام بڑا ممتاز اور منفرد تھا، عہد استعمار میں مصر میں رونما ہونے والے تمام سیاسی واقعات میں آپ کا اسم گرامی سر فہرست نظر آتا ہے، پہلی عالمی جنگ کے بعد سعد زغلول کی رہنمائی میں الوفد المصری کی تشکیل ہوئی تو آپ اس کے رکن منتخب کئے گئے، یہ انتخاب قومی اور وطنی تحریک میں اس فلسفی شخصیت کے مقام و مرتبہ پر دلالت کرتا ہے۔

فلسفہ کے میدان میں آپ کی خدمات بڑی نمایاں ہیں اور بجا طور پر آپ کو فلسفی کے لقب سے نوازا گیا کیوں کہ آپ کا رجحان فلسفیانہ غور و فکر اور دانشورانہ تدبر کی طرف تھا۔ آپ نے کانٹ (۲۸)، اسٹورٹ مل (۲۹)، لاک اور اسپینسر (۳۰) جیسے فلسفیوں کے افکار و نظریات کا گہرا مطالعہ کیا تھا، مگر ارسطو کی تحریروں اور اس کے فلسفہ پر آپ کو عبور حاصل تھا یہ اسی لئے ارسطو (۳۱) کے افکار و نظریات کو آپ نے بطور خاص مرکز توجہ قرار دیا یہاں تک کہ استاذ عباس محمود عقاد کو کہنا پڑا کہ "در حقیقت ارسطو سے واقف ہونے سے پہلے یا اس کی شخصیت پر غور و فکر کرنے سے قبل ہی استاذ لطفی السید "ارسطو" بن چکے تھے کیوں کہ ان کی استدلالی اور منطقی عقلیت کی تشکیل ہی نے ارسطو کے فلسفہ کو ان کی نگاہ میں محبوب بنایا تھا"۔

احمد لطفی السید کی فکر فلسفیانہ تھی ان کی سوچ میں بڑی گہرائی اور گیرائی تھی، سیاست، ادب، زبان اور صحافت کے میدانوں میں ان کے جو بھی افکار و نظریات ملتے ہیں ان میں یہ فلسفیانہ رنگ اور دانشورانہ آہنگ بہت نمایاں ہے اسی لئے آپ کو فلسفی کہا گیا اور نئی نسل کے استاذ قرار دیئے گئے۔

ان کی نجی زندگی شاید ہمیں یہ ماننے پر مجبور کرے کہ یہ رجل عظیم اپنی فطرت کے اعتبار سے فلسفی تھا کیوں کہ ان کے اسلوب تحریر پر جدت فکر اور انقلابیت کے باوجود قدیم صعیدی لہجہ کی چھاپ ہے اور وہ عربی رسوم و روایات کے محافظ نظر آتے ہیں۔

نئی نسل کے استاذ اور مربی کے حوالہ سے بڑے اہم علمی کاموں کا حوالہ دیا جاتا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کی علمی شخصیت پر اہل علم و تحقیق کو بڑا اعتماد تھا۔ اخبار الجریدہ سے مستعفی

ہونے کے بعد آپ کو دار الکتب المصریة کا ڈائرکٹر متعین کیا گیا۔ یہ عہدہ خود ایک عظیم الشان اور نہایت بلند عہدہ تھا، جس پر وہی شخص فائز ہو سکتا تھا جسے گہرا علم حاصل ہو اور جس کا احترام سب کی نگاہوں میں یکساں ہو اسی طرح مصری یونیورسٹی کے آپ اولین وائس چانسلر بنائے گئے تو وہاں آپ نے ناقابل فراموش کارنامے چھوڑے۔ دار الکتب المصریة میں مرحوم نے ارسطو کی معروف و مشہور کتابوں کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمے محض ترجمہ ہی نہ تھے۔ بلکہ ارسطو کے افکار و نظریات کی تحقیق اور مطالعہ پر بھی مشتمل تھے۔ ان ترجموں میں یونانی مفاہیم کے لئے عربی الفاظ کی تخلیق پر آپ کی مہارت بھی صاف جھلکتی ہے۔ اسی وجہ سے بعد میں آپ مجمع اللغة العربیة کے رئیس منتخب ہوئے۔

مجمع اللغة العربیة میں احمد لطفی السید کی شخصیت بڑی ممتاز اور فائق تھی کیوں کہ آپ کو چیئرمین کی ذمہ داری نبھانی ہوتی تھی۔ تمام میٹنگوں کی آپ صدارت کرتے تھے، طول کلامی سے پرہیز کرتے تھے مبادا کام میں تاخیر ہو اور تنفیذ میں لیت و لعل ہو جائے، اسی لئے جب بھی کسی موضوع پر باہم شدید اختلاف ہوتا تو صاف لفظوں میں اپنی رائے ظاہر کرنے سے ہمیشہ اجتناب کرتے تھے تاکہ ان پر جانب داری کا الزام نہ لگ سکے، مگر جب رفع اختلاف کے لئے تشکیل پانے والی کمیٹیوں کی نشست ہوتی تھی تو اس وقت اپنی رائے ظاہر کرنے میں کوئی سستی اور تساہلی نہ کرتے جیسا کہ استاد عقاد نے خود بیان کیا ہے۔

۱۸ سال تک مجمع اللغة العربیة کے وہ رئیس رہے اور ان طویل سالوں میں مجمع کے تمام اراکین آپ کا یکساں احترام کرتے رہے یہ احترام مرحوم کی شخصیت سے ذاتی محبت و عقیدت سے اور ان کی منفرد خصوصیات کے تئیں گہرے جذبۂ اخلاص پر مبنی تھا۔

لطفی السید وفات پا گئے۔ رجل عظیم فلسفی اور دانشور اور نئی نسل کے مربی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پوری مصری قوم نے ان کی وفات کا سوگ بنایا۔ یہ قومی سوگ اس دانائے روزگار کے شایان شان تھا جس نے اپنی زبان اور اپنی قوم کے لئے بے مثال کارنامے انجام دیئے۔

المجمع العلمی العربی (مجمع اللغة العربیة دمشق) سے قدیم روابط رکھتا ہے۔ وہ مرحوم کو رحمت و مغفرت کی دعائیں بھیجنے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھتا ہے یہاں رئیس مجمع امیر مصطفیٰ الشہابی

کے وہ تعزیتی کلمات نقل کئے جارہے ہیں جو انہوں نے قاہرہ کی تعزیتی کمیٹی کو ارسال کئے ہیں :

مجمع اللغۃ العربیۃ کے فاضل مدیر کی خدمت میں

نیک خواہشات اور پاکیزہ سلام قبول ہو آپ کا مکتوب مؤرخہ ۲۴ر مارچ ۱۹۶۳ء موصول ہوا اس میں مرحوم احمد لطفی السید کی تعزیت میں منعقد ہونے والے جلسہ کے سلسلہ میں مجمع کا فیصلہ تحریر ہے نیز مجمع کی جانب سے تعزیتی کلمات کو پیش کرنے کی جنہیں میں مجلّہ میں شائع کرنا چاہتا ہوں مجھے دعوت دی گئی ہے۔ شدید ترین خواہش تھی کہ اس دعوت پر لبیک کہوں لیکن افسوس ہے کہ پیٹ کے خطرناک آپریشن کی وجہ سے میں سفر کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، کیا اس یاد دہانی کی ضرورت ہے کہ ہم شام میں مرحوم کی سچی وطن دوستی سے برابر مستفید ہوتے رہے جب سے قاہرہ سے انہوں نے الجریدہ نکالنا شروع کیا تھا ان کی تمام سرگرمیوں اور تحریروں کا زور قومی جدوجہد پر تھا وہ سلطنت عثمانیہ اور غصب شدہ سلطنت کے مسائل سے کہیں زیادہ قومی جدوجہد سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ہم ان کے علم فلسفہ طرازی، زبان دانی، اور ترقی یافتہ افکار و نظریات سے برابر مستفید ہوتے رہے۔ ۱۹۲۷ء سے ہی دمشق کی مجمع نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں اپنا رکن منتخب کر رکھا تھا۔ قاہرہ کے المجمع کے رئیس کی حیثیت سے ان سے میرے جو ذاتی مراسم تھے ان میں میں نے ہمیشہ عقل مندی و دانشوری، فکر تاباں اور ذہن رساں کی جلوہ فرمائی دیکھی قرآن کریم کی آیات کے گہرے مطالعہ عربی زبان وادب کے اسرار و رموز، آباء و اجداد کے کارناموں کی تفصیلات اور امت کے اندر صحت مند بیداری اور ترقی کے وسائل سے بھرپور واقفیت ان کی گفتگو اور تحریر سے چھلکی پڑتی تھی۔

میرے لئے اور تمام شامی ادیبوں کے لئے جن کے مرحوم سے تعلقات تھے وہ ایک مخلص باپ اور باکمال مرشد کا درجہ رکھتے تھے جس طرح مصر میں عربی زبان وادب کے عالموں اور محققوں کے لئے وہ عظیم مربی تھے۔ میں اپنی جانب سے اور مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق میں اپنے تمام رفقاء کی جانب سے اس مرد عظیم کی رحلت پر گہرے درد و غم کا اظہار کرتا ہوں۔ مصر عالم عرب کو قرآن کریم کی زبان خدمت کے لئے عظیم شخصیات اور نادر مفکرین کو فراہم کرتا رہے گا۔

مصطفیٰ الشہابی

رئیس مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق (۳۲)

احمد لطفی السید نے نازو نعمت اور دولت و ثروت کے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ شروع ہی سے زندگی کے مسائل اور جان لیوا مشکلات سے وہ محفوظ تھے۔ مگر عجیب بات ہے کہ جاہ و حشمت اور دولت کی کثرت کے باوجود طبیعت میں غنی اور بے نیازی، نرمی و رواداری اور خوش گفتاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ خود محبت کرنے والے انسان تھے اور مصری عوام کی جانب سے بھی انہیں بے پناہ محبت ملی تھی۔ انہیں جوانی ہی سے دوسروں کی عزت نفس کا پورا ادراک تھا۔ دوستوں اور ساتھیوں کا حد درجہ احترام کرتے تھے اور دوسروں کے جذبات اور رجحانات کا احترام اور مکمل پاسداری کرتے تھے۔ دوستوں کے سلسلہ میں ان کے خیالات کس طرح کے تھے اور وہ خوشی و غمی کے ہر موقع پر اپنے احباب کو کس طرح یاد رکھتے تھے اس کا اندازہ خود ان کی اپنی تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔ ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں :

> مرا دوست مجھے یاد آجاتا ہے جب بھی خوشی کی کوئی رمق مجھے نظر آتی ہے میں اسے یاد کرتا ہوں جب بھی میرا ذہن خوش گوار ہوتا ہے اور زندگی میں خاص و عام معاملات میں اسے کوئی خوشی نصیب ہوتی ہے۔ میں اسے یاد کرتا ہوں جب بھی میں زندگی کی کسی نعمت سے دوچار ہوتا ہوں ذہنی و نفسی دباؤں میں وہ میری نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور نجی اور عوامی مصیبت میں میں اسے فراموش نہیں کرپاتا۔ امید و بیم میں وہ میرے ذہن کے حافظہ میں محفوظ رہتا ہے اسے یاد رکھنے کے لئے مجھے ذہن پر کوئی زور نہیں دینا پڑتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میری جسم و جان کا ناگزیر حصہ ہے"۔(۳۳)

اہل علم و ادب سے گہرے روابط

احمد لطفی السید نے سیاست و صحافت کی بھرپور زندگی گزاری، ہزاروں افراد سے ملے، زندگی کے تمام گوشوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے ان کا رابطہ ہوا۔ ان میں اصلاح و انقلاب کے علم بردار اور احیائے اسلامی کے نقیب بھی تھے اور تجدید و تجدّد کے حامل ادیب اور صحافی بھی، مگر انہوں نے اپنی یادداشت میں پانچ افراد کو خاص طور پر محفوظ رکھا ہے اور ان کے سلسلے میں اپنے جذبات کا بھی اظہار کیا ہے۔ وہ ہیں حسن عاصم، مصطفیٰ کامل، قاسم امین، فتحی زغلول (۳۴) اور عبدالعزیز فہمی (۳۵)۔ اپنے دوستوں کے سلسلہ میں انہوں نے جن تأثرات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی شخصیت کے ایک اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور وہ ہے خیال خاطر احباب۔

حسن عاصم کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :

> "میں نے انہیں چیئرمین کی حیثیت میں دیکھا پھر میرا ایک دوست کی حیثیت سے ان سے

تعارف ہوا پھر میں نے انہیں ایک مشیر کی حیثیت میں پایا۔ اس کے بعد خدیو عباس حلمی دوم کے دفتر میں عہدہ دار کی حیثیت میں ان سے معاملہ کیا اس کے بعد دیوان خدیو کے رئیس کی حیثیت میں ان سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اصولوں پر ثابت قدم مستقل مزاجی اور استقامت میں راسخ ان سے زیادہ کسی کو نہیں پایا۔ جو لوگ انہیں جانتے ہیں وہ تائید کریں گے کہ وہ دوٹوک بات کہنے والے انسان تھے۔ تلون مزاجی سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا وہ ایک صحیح مسلک کے علم بردار تھے جن میں کوئی انحراف نہ تھا۔ وہ مضبوط اصولوں کے حامل تھے جن میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکتی تھی حتی کہ بعض لوگوں نے ان پر انتہا پسندی اور شدت پسندی کا الزام لگایا اور بعض لوگوں نے اس سے آگے بڑھ کر انہیں بد اخلاق قرار دیا جب کہ وہ بد اخلاق نہ تھے دراصل اصولوں کی پابندی میدان جنگ میں کمانڈر کی فرمانبرداری کی طرح ہے"۔(۳۶)

مصطفیٰ کامل کے بارے میں احمد لطفی السید لکھتے ہیں :

"ان کا نعرہ وطن دوستی تھا، ان کا وسیلہ اور مقصد وطن دوستی تھا، ان کی تحریر وطن دوستی تھی، ان کی زندگی وطن دوستی تھی، یہاں تک کہ وہ وطن دوستی میں گھل مل گئے تھے اور ذہنی اعتبار سے اور عرف عام میں بھی دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہو گئے تھے۔ تم مصطفیٰ کامل کا ذکر خیر کرو گے تو وطن دوستی تمہارے سامنے آکھڑی ہو گی اور جب تم وطن دوستی پر گفتگو کرو گے تو پہلا شخص جس کا خیال تمہارے ذہن میں آئے گا وہ مصطفیٰ کامل ہوں گے گویا وہی وطن دوست ہیں اور وطن دوستی مصطفیٰ کامل سے عبارت ہے۔

وطن دوستی اس مظاہرے میں پوری طرح نمایاں ہوئی جو ان کی وفات پر منعقد ہوا تھا جس کی کوئی نظیر مصر کی تاریخ میں نہیں ملتی، پوری قوم ایک ہی معاملہ میں شریک تھی، ان کی رائے ایک تھی اور اس کی شکل بھی ایک تھی، حالانکہ دوسرے معاملات میں اس کے اندر بڑا اختلاف تھا اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ جس شعور و احساس نے پوری قوم کو یکجا کیا وہ کوئی سیاسی مسلک نہ تھا بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ کی چیز تھی اور وہ تھی قومی وحدت اور وطنی اتحاد احمد لطفی السید نے قاسم امین کی زندگی کے مختلف گوشوں پر بھی روشنی ڈالی وہ کہتے ہیں :

"جو شخص قاسم کی زندگی کی اس مختصر تاریخ پر نگاہ ڈالے گا وہ یہ محسوس کرے گا کہ یہ ایک

عام تاریخ ہے جس میں ان سخت وشدید حالات کا کوئی اثر نہیں ہے جو بڑے آدمیوں کی زندگیوں میں ناگزیر عنصر کا اثر رکھتے ہیں اور جن سے وہ قوت و توانائی اخذ کرتے ہیں اور جن کے تجربات سے یہ سبق حاصل کرتے ہیں کہ کس طرح حوادث پر قابو پایا جائے اور انہیں اپنا تابع بنایا جائے، اس کے علی الرغم قاسم اپنے ذاتی مشاہدہ اور تجربات سے فائدہ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ قاسم نے خود لکھا ہے کہ "علم کا سب سے کم تر مرتبہ وہ ہے جو انسان کتابوں اور اساتذہ سے حاصل کرتا ہے اور علم کا سب سے بڑا مرتبہ وہ ہے جو انسان اپنے ذاتی تجربات سے حاصل کرتا ہے"

قاسم نے عام طور سے معاشرتی مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کی رائے تھی کہ یہ معاشرتی مسائل قوانین فطرت، قوانین تحلیل و تجزیہ اور تدریجی ارتقاء و منتقلی کے قوانین کے ہمیشہ تابع ہوتے ہیں۔ انہوں نے بالخصوص مصر کے معاشرتی مسئلہ سے تعرض کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کا حل مصر کے عائلی نظام پر موقوف ہے۔ ان کا نتیجۂ تحقیق یہ تھا کہ عورت ہی خاندان کی تشکیل میں اولین بنیاد ہے۔ وہ اس غور و فکر میں لگے رہے کہ مصری عورت کس طرح ترقی کر سکتی ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر طویل غور و فکر کیا۔

فتحی زغلول کے بارے میں احمد لطفی السید کہتے ہیں :

"میرے خیال میں حریت کے اصولوں اور ان کے علم برداروں سے وفاداری کا تقاضہ ہے کہ میں ان صفحات میں ایک ایسے عظیم دوست کا تذکرہ کروں جس نے ان اصولوں کی نشر و اشاعت کے لئے عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ اور وہ ہیں مرحوم محمد فتحی زغلول پاشا۔ انہوں نے مصری قوم کی حالت پر مخلصانہ تدبر کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ قوم اس اعلیٰ ترین قدر سے آشنائی کی سب سے زیادہ محتاج ہے جس تک رسائی اس کے سیاسی و معاشرتی اداروں اور تنظیموں میں مطلوب ہونی چاہئے تا آنکہ نہایت صاف اور دوٹوک طریقہ سے اس کے وطنی اور قومی اغراض میں وحدت ہو۔ مزید انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اس وقت مصلح علماء کا سب سے پہلا قدم اس جانب اٹھنا چاہئے کہ ترجمہ کی تحریک برپا کر کے علم کو اپنے ہم وطنوں تک منتقل کریں۔ ہر قوم کے اندر اور ہر زمانے میں کسی بھی علمی بیداری کی الف، ب اسی طریقہ کار کو اختیار کرنا ہے۔

۱۸۸۸ء میں انہوں نے جان جاک روسو (۳۷) کی مشہور زمانہ کتاب Social

Contract کا ترجمہ کرنا شروع کیا مگر اسے مکمل نہ کر سکے۔ اس کے بعد انہوں نے بن تام کی کتاب "اصول قوانین" اور کانٹ ہنیری ڈی کلیزی کی کتاب "اسلام میں سوانح وخواطر" ریموڈی مولان کی کتاب "انگریزوں کی ترقی کا راز" اور گستاؤ لیبان کی کتابیں "روح اجتماع" اور "ترقی اقوام کا راز" کا ترجمہ مکمل کیا یہ تمام کتابیں پریس سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ سیاسی معاشیات پر بور جار کی کتاب، لیبان کی تمدن عرب، جمہوریہ افلاطون اور اسپینسر کی "فرد بر خلاف مملکت" کے ترجمے بھی کئے یہ چاروں کتابیں شائع نہیں ہو سکیں۔ فتحی زغلول کے یہ ترجمے اتنی مہارت سے کئے گئے ہیں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بغیر کسی فرق کے اصل مصنف کو پڑھ رہے ہیں۔ اس تحریک ترجمہ سے ان کا مقصد حریت کے اصولوں، فرد اور قوم کی آزادی کی نشر واشاعت کرنا اور افراد اور قوم دونوں کو اعلیٰ ترین قدر اختیار کرنے کی دعوت دینا تھا تاکہ قومی اور وطنی مقاصد میں وہ اعلیٰ ترین قدر ہر حال میں شامل رہے۔

ترجمہ کے لئے ان کتابوں کے انتخاب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ فتحی زغلول جمہوریت نوازوں کے مسلک کے علم بردار تھے۔ خواہ تعلیم وتربیت کا میدان ہو یا سیاسی و معاشرتی مسائل ہوں بلکہ اقتصادیات میں بھی جمہوریت ہی کے وہ ہم نوا تھے۔ کیونکہ اگر معاشیات میں اشتراکی فکر کے علم بردار ہوتے تو سیاسی اقتصادیات پر بور جار کا ترجمہ نہ کرتے بلکہ کسی اشتراکی ماہر معاشیات جیسے جید محقق کے ترجمہ کا منصوبہ بناتے"۔ (۳۹)۔

عبدالعزیز فہمی جن سے سب سے زیادہ رابطہ تھا ان کے بارے میں احمد لطفی السید الجریدہ میں لکھتے ہیں :

"بسا اوقات بعض ناخوشگوار باتیں پیش آتی ہیں جنہیں قبول کرنا ضروری ہو جاتا ہے یہ ایک صحافی کی ذمہ داری ہے کہ کوئی ایسا چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا واقعہ نظر انداز نہ کرے جس سے اخلاق کریمانہ کی جانب کوئی اشارہ ہوتا ہو یا اعلیٰ ترجذبات واحساسات کی جانب کوئی رہنمائی ملتی ہو تاکہ عام انسانوں کو کوئی بہترین نمونہ فراہم ہو سکے اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے رہنمائی کا کام دے سکے اور ذاتی مفادات پر عوامی مفاد کو ترجیح دینے کی مثالیں موجود رہیں۔ یہاں تک کہ صحت جو انسان کی سب سے قیمتی چیز ہے اسے بھی تج دینے کی روایت قائم ہو سکے۔

استاد عبدالعزیز کے مسئلہ میں پچھلے ایک ہفتہ سے رائے عامہ بڑی دلچسپی لے رہی ہے۔ یہ کتنی خوشی اور سعادت کی بات ہے کہ ہم اپنے کانوں سے سن رہے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے

ہیں کہ عوام نے شیخ عبدالعزیز کے سلسلہ میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس مرد آزاد کو اپنی جان اور اپنی جائیداد پر تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ شخصیت تو قوم کی خدمت کرنے کے لئے وقف ہے اور قوم جہاں چاہے اس شخصیت سے فائدہ اٹھائے، یہ خبر اتنی مسرت افزاں ہے کہ سن کر آنکھوں سے آنسو رواں ہیں کہ اب تخریب کا زمانہ رخصت ہو گیا اور افراد سازی اور شخصیات کی تکریم کا زمانہ آگیا ہے"۔

اس کے بعد احمد لطفی السید نے ان حالات کی جانب اشارہ کیا ہے جن کے پیش نظر انہیں یہ مضمون لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے اختصار کے ساتھ اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ حکومت نے شیخ عبدالعزیز سے درخواست کی کہ وہ مجلس قانون ساز چھوڑ دیں اور محکمۃ الاستئناف میں قاضی کا عہدہ قبول کرلیں حکومت کی اس درخواست پر رائے عامہ پھر اٹھی یہاں تک کہ سعد زغلول نے یہ کہا کہ مجلس قانون ساز کے ساتھ یہ ایک سازش رچی جارہی ہے۔ جب سعد زغلول کا یہ حال ہے تو بقیہ لوگوں کی رائے کتنی شدید ہو گی اور ان احتجاجی مظاہروں کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے جو قاہرہ میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی جانب سے دوسرے شہروں اور دیہاتوں میں حکومت کے اس فیصلے کے خلاف منظم کئے گئے۔ چنانچہ احمد لطفی السید شیخ عبدالعزیز فہمی کی صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"عبدالعزیز اپنے معروف تواضع اور خاکساری کی بنا پر شاید الجمعیۃ التشریعیۃ میں مزید کام کرنے کے لائق نہ رہے آپ قانون کے آدمی ہیں اسی لئے محکمۃ الاستئناف میں قانون ہی کی خدمت کے لئے آپ سے درخواست کی گئی۔ آپ کا معاملہ اس فوجی کی طرح ہے جسے میدان جہاد میں ایک دوسرے فوجی کی جگہ ہتھیار اٹھانے کا حکم دیا جائے، ایک کام کے بدلہ دوسرے کام یہاں بھی حق کی خدمت اور وہاں بھی، دونوں ہی صورتوں میں قوم کی خدمت ہو رہی ہے۔ ان کی نگاہ میں ان دونوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے، البتہ ذاتی حالات قابل لحاظ ہیں۔ آپ کو کوئی مزید طمع بھی نہیں ہے۔ بقدر کفاف پر قناعت آپ کا شیوہ ہے۔ وجہ ترجیح وہی چیز ہو سکتی ہے جو آپ کے مزاج سے ہم آہنگ ہو اور جسے آپ کی صحت خوشی قبول کرے۔ آپ کے دوستوں کو معلوم ہے کہ آپ کے طبیب نے متعدد بار زور دیا ہے کہ آپ مجلس قانون ساز میں مزید وقت نہ لیں۔ طبیب کی رائے اس معاملہ میں سند ہے اور یہی استاد عبدالعزیز اور ان کے دوستوں کی نگاہ میں وجہ

ترجیح ہے۔ جب آپ نے محسوس کیا کہ قوم جس نے آپ کو اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے وہ نمائندگی کرنے ہی پر مصر ہے اور آپ کے دوست اور ساتھی آپ کی صحت اور تندرستی کی خواہاں ہیں تو آپ نے یہ موقف اختیار کیا کہ میری صحت بھی قوم پر قربان ہے"۔(۴۰)

احمد لطفی السید نے مصری سیاست اور معاشرہ میں بھرپور زندگی بسر کی۔ قوم کو وطنیت اور جنگ آزادی کی راہ دکھائی مصری انقلاب ۱۹۱۹ء کا قائد ان کے دوست سعد زغلول کو قرار دیا جاتا ہے جو بہر حال آپ سے بہتر درجہ کی صلاحیت کے مالک تھے، لیکن اس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ لطفی السید مصری قوم کے پہلے روحانی رہنما ہیں جنہوں نے قوم کی خود مختاری اور سیاسی معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے لئے اپنی پوری زندگی قربان کردی۔ ان کے افکار و نظریات کا سب سے بڑا ترجمان ان کا اخبار الجریدہ تھا۔ الجریدہ ہی نے مصری قومیت و وطنیت اور قومی بیداری کا صور پھونکا۔ مصر کی جدید تاریخ نامکمل رہے گی اگر الجریدہ کے سیاسی اور سماجی کردار اور تعلیمی و معاشرتی ترقی میں اس کے رول پر بھرپور گفتگو نہ کی جائے۔

حواشی و تعلیقات

(۱) رابرٹ چارلس ڈارون (۱۸۰۹ء۔ ۱۸۸۲ء) مشہور سائنس داں اور نظریۂ ارتقاء کا بانی انگلینڈ میں پیدا ہوا اور وہیں وفات پائی۔ ابتداء ہی سے تاریخ فطرت کے مضامین سے اس کو دلچسپی تھی۔ ۱۸۳۱ء میں اس نے مختلف ملکوں کی سیاحت کی۔ پانچ سالہ بحری سفر کے دوران خلیہ جات کے تدریجی ارتقاء پر اس کا اطمینان بڑھتا گیا۔ انگلینڈ واپس آکر بیس سال تک اس نے نظریۂ ارتقاء کے تمام گوشوں پر بار بار تحقیق کی۔ اور آخر کار ۱۸۵۹ء میں اُصل الانواع پر مشہور زمانہ کتاب "On the Origin of Species by Means of Natural Selection" لکھی۔ ۱۸۵۸ء میں ڈارون کو اپنے نوجوان دوست الفریڈ رسیل ولیس کی جانب سے ایک خط موصول ہوا جس میں اس سائنس داں نے نظریۂ ارتقاء کے بارے میں اپنے خیالات و تجربات ظاہر کئے تھے۔ اسی سال ڈارون کے احباب نے مل کر لینین Linnean Society of London میں ایک مقالہ پڑھا۔ اور آخر کار ڈارون نے اپنی مذکورہ بالا کتاب شائع کرائی۔ ۱۸۶۸ء میں اس کی دوسری کتاب Variation in Animals and Plants Under Domestication منظر عام پر آئی۔ ۱۸۷۱ء میں اس کی ایک اور معروف کتاب The Descent of Man and Selection in Relation to Sex شائع ہوئی۔ ان کتابوں نے دور جدید میں سائنسی اور مذہبی نظریات پر دور رس اثرات ڈالے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا، ایڈیشن ۱۵، ج ۳، ص ۸۹۴۔

(۲) ڈاکٹر شبلی بن ابراہیم شمیّل (۱۲۶۹۔ ۱۳۳۵ھ / ۱۸۵۳۔ ۱۹۱۷ء) ایک طبیب اور محقق تھے جنہوں نے اپنے افکار و نظریات میں فلاسفہ کا رنگ و آہنگ اختیار کیا۔ لبنان کے ایک گاؤں کفر شیمہ میں پیدا ہوئے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ایک سال یوروپ میں رہے اور مصر میں سکونت اختیار کی۔ وفات قاہرہ میں ہوئی۔ ۱۸۸۶ء۔ ۱۸۹۱ء میں مجلّہ "الشفاء" نکالا۔ آپ کی تصانیف میں "فلسفة النشوء والارتقاء"، "مجموعة مقالات" (اخبارات و جرائد میں شائع شدہ مقالات کا مجموعہ)، "المعاطس"، "سکوی و آمال" اور "رسالة آراء الدکتور شمیّل" قابل ذکر ہیں۔ مختلف قدیم طبّی کتابوں پر آپ کی شروح و تعلیقات معروف ہیں جیسے فصول بقراط، ارجوزۃ ابن سینا وغیرہ، فرانسیسی زبان میں آپ کو مہارت حاصل تھی۔ الزرکلی: الاعلام ۳ / ۱۵۵۔

(۳) علی پاشا مبارک (۱۲۳۹۔ ۱۳۱۱ھ / ۱۸۲۴۔ ۱۸۹۳ء) مصر کے وزیر اور معروف مؤرخ ایک دیہات برنبال میں پیدا ہوئے۔ عربی زبان و ادب میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ۱۲۶۰ھ میں ایک وفد کے ساتھ پیرس کا سفر کیا اور

وہاں فرانسیسی دفاعی نظام کا مطالعہ کیا۔ وطن واپسی کے بعد فوج میں مختلف ملازمتیں اختیار کیں۔ ۱۲۷۰ھ کی ترکی روسی جنگ میں بھی شریک ہوئے۔ اس کے بعد مصری اوقاف کے انسپکٹر بنے۔ وزارت تعلیم سے تعلق ہوا تو مختلف اسکول قائم کئے۔ قاہرہ میں دار الکتب المصریۃ آپ ہی کی قائم کردہ یادگار ہے۔ عرابی انقلاب کے موقع پر اپنے ساتھیوں کو لے کر وزارت سے مستعفی ہوئے۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ آپ کی مشہور تصنیف "الخطط التوفیقیة" بیس حصوں میں ہے اس میں انہوں نے مقریزی کی نقل کی ہے۔ تین جلدوں میں دینی معاشرتی مباحث پر مشتمل "علم الدین"، "حقائق الاخبار فی اوصاف البحار"، "خواص الاعداد"، "نخبة الفکر فی نیل مصر"، تذکرہ المهندسین"، "تقریب المهندسة" اور "جغرافیة مصر" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ الزرکلی: الاعلام ۳۲۲/۴

(۴) سعد زغلول (۱۲۷۳۔۱۳۴۶ھ / ۱۸۵۷۔۱۹۲۷ء) مصر کے معروف سیاسی رہنما قومی جنگ آزادی کے ہیرو اور ایک شعلہ بار خطیب تھے۔ اعلیٰ تعلیم کی تکمیل جامع ازہر سے کی۔ جمال الدین افغانی کی صحبت سے فکر و نظر میں انقلابیت آئی۔ محمد عبدہ کے ساتھ مل کر الوقائع المصریة نکالا عرابی انقلاب کے رہنماؤں میں شامل تھے۔ قید و بند کی صعوبتیں اٹھانے کے بعد پھر قانون میں ڈگری حاصل کی اور وکیل بن گئے۔ بعد میں ملک کے مختلف شعبوں میں ملازمت کی۔ آخر میں وفد پارٹی کے صدر کی حیثیت سے مصری سیاست کی باگ ڈور سنبھالی۔ تحریک آزادی میں بھرپور شرکت کی اور جلاوطن ہوئے۔ وطن واپسی کے بعد مجلس الوزراء اور پارلیمنٹ کے صدر کی حیثیت سے قوم کی رہنمائی کی۔ قاہرہ میں انتقال ہوا۔ الزرکلی: الأعلام ۳/ ۸۳۔

(۵) حفنی ناصف (۱۲۷۲۔۱۳۳۸ھ / ۱۸۵۶۔۱۹۱۹ء) مصر کے معروف ادیب قاضی اور شاعر تھے۔ شعبۂ تعلیم کے مختلف عہدوں پر فائز ہوئے اس کے مختلف عدالتی ذمہ داریاں نبھائیں۔ آخر میں وزارۃ المعارف میں عربی زبان کے اولین انسپکٹر مقرر ہوئے۔ اپنی شعلہ بار تقریروں کے ذریعہ عرابی انقلاب کی حمایت کی۔ بعض مصری اخبارات میں ادریس محمدین کے نام سے مضامین بھی لکھے۔ شام، استنبول، یونان و روم، آسٹریلیا، جرمنی، سوئیزرلینڈ، سیوئیڈن اور عرب ممالک کے مختلف اسفار کئے۔ بیس سال تک مصری عدالت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز رہے۔ مصری یونیورسٹی کے رئیس بھی منتخب ہوئے۔ المجمع اللغوی کی تشکیل میں بھی حصہ لیا۔ شعر و شاعری میں فخر و مباہات اور مدح سرائی سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ باحثۃ البادیہ کے والد تھے۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ تصنیفات میں "تاریخ الأدب اور حیاۃ اللغة العربیة" دو حصوں میں ہے اسی طرح "مُمَیزات لغات العرب" بھی آپ کی ایک اہم تصنیف ہے۔ مشہور کتاب

"الدروس النحوية " (چار حصوں میں) کی تصنیف میں بھی آپ شریک رہے۔ بیٹے نے آپ کا شعری دیوان مرتب کر کے شائع کر دیا۔ الزرکلی: الأعلام ۲ / ۲۶۵۔

(٦) دکتور اللطیف حمزہ : ادب المقالة الصحفية فی مصر ، الجزء السادس ، دار الفكر العربی ، ۱۹٦۱ء الطبعة الثانية ، ص ۴۲۔۴۸۔

(۷) قاسم امین (۱۸٦۳۔ ۱۹۰۳ء) تحریک آزادی نسواں مصر کے معروف علم بردار قاہرہ کے قصبہ میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ میں مدرسة الحقوق سے قانون کی ڈگری لی۔ مزید تعلیم کے لئے ۱۸۸۱ء میں فرانس کا سفر کیا۔ ۱۸۸۵ء میں وہاں سے وطن واپس ہوئے۔ ۱۸۸۷ء میں مصر میں ایک عدالتی عہدہ پر فائز ہوئے، تو عرابی انقلاب کے تمام ملزمین کو انہوں نے رہا کر دیا۔ ۱۸۹۸ء میں تحریر المرأة لکھ کر تحریک نسواں کے بہت بڑے نقیب بن کر ابھرے اور پورے عالم عرب میں ان کی حمایت و مخالفت کا بازار گرم ہو گیا۔ اپنی دوسری کتاب المرأة الجديدة میں عورتوں کی آزادی کے حق میں مزید شدومد سے استدلال کیا۔ الزرکلی: الأعلام ۵ / ۱۸۴۔

(۸) وکٹر ہیوگو Victor Hugo (۱۸۰۲۔ ۱۸۸۵ء) مشہور شاعر، ناول نگار اور ڈرامہ نگار جنہوں نے فرانسیسی اور رومانوی ادب میں سب سے زیادہ شہرت پائی۔ فرانس کے ایک بہت بڑے شاعر ہونے کے ساتھ اپنے ناولوں اور ڈراموں کی وجہ سے عالمی ادیب قرار دیئے گئے۔ ۱۸۳۰۔ ۱۸۵۱ء کا دور ان کی عالمی شہرت اور ادبی و فنی عروج کا دور ہے۔ ۱۸۴۸ء میں فرانسیسی انقلاب کے بعد مجلس دستور ساز میں پیرس کے ڈپٹی منتخب ہوئے اور بعد میں مجلس قانون ساز کے ڈپٹی بھی مقرر ہوئے۔ سیاسی شکست وریخت کے نتیجہ میں ۱۸۵۱ء سے ۱۸۷۰ء تک انہیں ملک سے باہر رہنا پڑا۔ ملک میں آزادی اور جمہوریت کی بحالی کے بعد ہی وہ اپنے وطن واپس آسکے۔ اسی سال قومی اسمبلی میں وہ ڈپٹی منتخب ہوئے مگر اگلے ہی مہینہ انہوں نے استعفا دے دیا۔ فرانسیسی ادب میں ہیوگو کی تخلیقات نے اعلیٰ ترین درجہ حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہر صبح کو سو اشعار اور بیس نثری صفحات لکھتے تھے۔ وہ عوامی شاعر تھے۔ سلاست روانی اور عوامی ترجمانی ان کی شاعری کی خصوصیات تھیں، وہ عوام کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے تھے۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا، جلد ٦، ص ۱۲۵۔ ۱۲۷

(۹) احمد لطفی السید: المنتخبات، جلد ۲، ص ۵۲

(۱۰) محمود سلیمان پاشا حزب الامۃ سیاسی پارٹی کے مؤسسین میں سے تھے۔ ان کا پورا گھرانہ مصر کی سیاسی زندگی میں بڑا متحرک تھا۔ ان کے صاحب زادے محمد محمود پاشا (۱۲۹۴۔ ۱۳٦۰ھ / ۱۸۷۷۔ ۱۹۴۱ء) خود ۱۹۱۹ء کے مصری

انقلاب میں پیش پیش تھے اور سعد زغلول کی صدارت میں جب الوفد المصری کی تشکیل ہوئی تو وہ بھی سعد کے ساتھ تھے اور ان کی معیت میں مالٹا جلاوطنی کی سزا بھی برداشت کی۔ محمود سلیمان پاشا در اصل تدریجی سیاست کے قائل تھے۔ انہوں نے حسن عبدالرازق اور لطفی السید کے ساتھ مل کر حزب الأمة کی تشکیل اسی لئے کی تھی کہ انگریزی استعمار اور مصری اشراف کے درمیان طے کردہ معاہدوں کے مطابق قومی و ملکی مقاصد حاصل کئے جائیں۔ مصری اشراف کو وہ حقیقی مفادات کا اہل قرار دیتے تھے۔ انہوں نے تمام قانونی و دستوری اختیارات کی بتدریج حصول یابی کا مطالبہ کیا تھا۔ دیکھئے شہدی عطیہ الشافعی : تطور الحركة الوطنية المصرية ، ۱۸۸۲ء۔۱۹۵۶ء، ۱۹۵۷ء، قاہرہ، ص ۱۶۔ ۱۷

(۱۱) پورا نام مصطفیٰ بن حسن عبدالرازق (۱۳۰۲۔۱۳۶۶ھ / ۱۸۸۵۔۱۹۴۶ء) ہے علوم ادب اور شریعت، محقق تھے ۔ مصر کے ایک گاؤں منیا میں پیدا ہوئے۔ جامع ازہر سے فراغت حاصل کی شیخ محمد عبدہ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ پیرس اور لیون کی یونیورسٹیوں میں تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۹۱۶ء میں قاہرہ واپس آئے تو ازہر اکیڈیمی کے جنرل سکریٹری متعین ہوئے۔ اس کے بعد بالترتیب شرعی عدالت میں انسپکٹر اور آرٹس کالج میں اسلامی فلسفہ کے استاذ، ۱۹۳۸ء میں وزیر اوقاف کے عہدہ پر مامور ہوئے اور ۱۹۴۵ء میں جامع ازہر کے شیخ کا عہدہ سنبھالا۔ قاہرہ میں وفات پانے تک اسی منصب پر فائز رہے۔ بڑے خاموش مزاج سنجیدہ و بردبار اور روشن فکر قلم کار تھے۔ آپ کی تصنیفات میں "تمہید لتاريخ الفلسفة الاسلامية" ، "فيلسوف العرب و المعلم الثاني" ، " في سيرة الكندي و الفارابي" ، "الدين والوحي والاسلام" ، "البهاء زهير" ، "محمد عبده" ، "مذكرات مسافر" اور "مذكرات مقيم" وغیرہ شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ منطق، تصوف، ادب اور خود نوشت پر مشتمل آپ کی بہت سی کتابیں ابھی تک مخطوطہ کی شکل میں ہیں۔ الزرکلی : الأعلام ۷ / ۲۳۱

(۱۲) احمد بن علی الشعراوی (م ۹۰۷ھ / ۱۵۰۱ء) شافعی المسلک عالم اور مصنف تھے۔ علم حدیث، علم نحو، اصول فقہ، علوم معانی و بیان میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ عمر رضا کحالہ : معجم المؤلفین، ۲ / ۹

(۱۳) حزب الاصلاح الدستوری کا قیام اپریل ۱۹۰۶ء میں مصری رہنما شیخ علی یوسف اور ان کے احباب کے ذریعہ عمل میں آیا۔ اس سیاسی پارٹی نے اپنے اولین پروگرام میں درجہ ذیل نکات کو شامل کیا :

۱۔ مصر کی آزادی کے لئے خدیو حکومت کے فرامین کی حمایت کرنا۔

۲۔ برطانیہ کے تمام وعدوں پر اعتماد کر کے انہیں نافذ کرنے کا مطالبہ کرنا۔

۳۔ ایک بااختیار مصری پارلیمان کا قیام جس میں پورا اقتدار مصریوں کے ہاتھ میں ہو۔

۴۔ پرائمری تعلیم کو عام اور مفت بنانا۔

۵۔ ذریعۂ تعلیم عربی زبان کو قرار دینا۔

۶۔ غیر ملکیوں کے بجائے مصری عوام کو صلاحیت اور استحقاق کی بنیاد پر ملازمتوں میں تقرر کرنے کا مطالبہ۔

۷۔ مخلوط عدالتوں کے سامنے تعزیری معاملات میں بھی غیر ملکیوں کی عدالت کے جواب دہ ہونے کا مطالبہ۔

۱۰/ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو مصر کے شعلہ بار مقرر اور رہنما مصطفیٰ کامل نے الحزب الوطنی سیاسی پارٹی کی تشکیل کی، جس کا مقصد غیر ملکی اقتدار کو بے دخل کرنا، خدیو حکومت سے قطع تعلق کرنا اور عوامی طاقت کا اظہار کر کے ملک کو انگریزوں کے استبداد سے نجات دلانا تھا۔ الحزب الوطنی کسی قسم کی مفاہمت اور مصالحت کی قائل نہ تھی۔ وہ علی الاعلان جنگ آزادی میں بغیر کسی مداہنت کے شرکت کر رہی تھی اور کسی قسم کی نرمی اور صلح جوئی سے کام لینے پر تیار نہ تھی۔ شہدی عطیہ الشافعی : تطور الحركة الوطنية المصرية ، ۱۸۸۲۔ ۱۹۵۶ء ، الداء المصرية للطباعة والنشر والتوزيعة قاہرہ، ۱۹۵۷ء ص ۲۰۔۲۱

(۱۴) دیکھئے پورا خطبہ، الجریدہ، عدد ۳۶۲، ۱۷/ مئی ۱۹۰۸ء

(۱۵) صفحات مطویہ، حوالہ بالا، ص ۷

(۱۶) حسین رشدی کا پورا نام ابن طبوزادہ محمد حمدی پاشا (۱۲۸۰۔ ۱۳۶۴ھ / ۱۸۶۳۔ ۱۹۲۸ء) مصر کے ارباب سیاست میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ چار مرتبہ وزارت عظمیٰ پر فائز کئے گئے۔ پیدائش اور وفات قاہرہ میں ہوئی، وہیں تعلیم حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے پیرس گئے۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی بار وزیر اعظم بنے۔ اس دوران عباس حلمی پاشا دوم کا مصر سے اخراج عمل میں آیا اور معزول کر دیئے گئے۔ ان کی جگہ حسین کامل پاشا سلطان مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں لندن جانے والے سرکاری وفد میں عدلی یکن کے ساتھ آپ بھی شریک رہے۔ ۱۹۲۵ء میں مجلس الشیوخ یعنی سینیٹ کے رکن بنے۔ پھر وفات تک اس مجلس کے صدر رہے۔ بڑی باوقار اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ دیکھئے الزرکلی : الأعلام ۲ / ۲۳۷

(۱۷) حسین کامل پاشا (۱۲۷۰۔ ۱۳۳۶ھ / ۱۸۵۳۔ ۱۹۱۷ء) خدیوی حکومت کے خاتمہ کے بعد مصر کے تخت حکومت پر فائز پہلے حکمراں کی پیدائش اور وفات قاہرہ میں ہوئی۔ قاہرہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ پیرس میں تعلیم کی تکمیل کی۔ عہد شباب ہی سے بڑے دور اندیش، معاملہ فہم اور متحرک شخص تھے، تخت سلطنت پر فائز ہونے سے پہلے

مختلف حکومتی مناصب پر فائز رہے۔ قاہرہ اور حلوان کے درمیان ریلوے لائن کی تنصیب آپ ہی کا کارنامہ ہے، مجلس شوری کے صدر بھی رہے۔ پہلی عالمی جنگ چھڑی اور آخری خدیو حکمراں عباس حلمی دوم حکومت سے ہٹائے گئے تو ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء میں آپ مصر کے پہلے سلطان مقرر کئے گئے۔ جلد ہی موت نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ اپنے دور سلطانی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ الزرکلی: الأعلام ۲/ ۲۵۲

(۱۸) ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ، ادب المقالة الصحيفة فی مصر، ج۶، ص۳۶

(۱۹) ڈاکٹر طہ حسین (۱۳۰۷۔ ۱۳۹۳ھ / ۱۸۸۹۔ ۱۹۷۳ء) جدید مصر کے بڑے ادیب اور ہنگامہ خیز مصنف ہیں۔ تین سال کی عمر میں چیچک کی وجہ سے نابینا ہو گئے۔ الازہر سے فراغت کے بعد ۱۹۱۴ء میں مصری یونیورسٹی سے "ذکری أبی العلاء" پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۱۸ء میں سوربون یونیورسٹی سے بھی فلسفہ ابن خلدون کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپسی کے بعد آرٹس کالج قاہرہ یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ بعد میں ترقی کر کے فیکلٹی کے ڈین اور آخر کار وزیر تعلیم کے عہدہ پر مامور ہوئے آپ کی سب سے مشہور کتاب "فی الادب الجاهلی" اور دوسری تصنیف "فی الشعر الجاهلی" نے ادب کے قدیم نظریات کے تار و پود بکھیر دیئے۔ ان دونوں تصانیف کی وجہ سے عالم اسلام میں آپ کی حمایت اور مخالفت کا زبردست طوفان اٹھا۔ دوسری تصانیف میں "حديث الاربعاء" (تین جلدیں)، "قعدة الفكر" (تین حصے)، على هامش السيرة"، "مع ابی العلاء فی السجن" (دو حصے)، "مع المتنبی"، "احاديث" اور "الأيام" قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح دو حصوں میں آپ کی تصنیف "مستقبل الثقافة فی مصر" نے بھی علمی حلقوں میں شورش برپا کی، الزرکلی: الأعلام ۳/ ۲۳۱۔ ۲۳۲

(۲۰) حسین فؤاد سری (۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۲ء سے قبل حیات تھے) مشہور مؤرخ اور جغرافیہ داں تھے۔ آپ کی تحقیقات میں سے "القاموس الجغرافی التاريخی" ۱۹۱۲ء میں قاہرہ سے شائع ہوئی عمر رضا کحالہ: معجم المؤلفين، جلد ۲، ص۹

(۲۱) عبداللطیف حمزہ، ادب المقالة الصحيفة فی مصر، حوالہ بالا، ص ۶۰۔ ۶۲، الزرکلی: الأعلام نے احمد لطفی السید کی جو سوانحی تفصیلات مرتب کی ہیں اس میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ الزرکلی کے مطابق ۱۹۴۶ء میں لطفی السید وزیر تعلیم اور پھر وزیر داخلہ اور وزیر خارجہ مقرر ہوئے اور ۱۹۴۹ء میں انہیں مجلس الشیوخ یعنی سینیٹ کی رکنیت تفویض کی گئی اور ۱۹۴۵ء میں مجمع اللغة العربية کے چیئرمین کے عہدہ پر وہ مقرر کئے گئے اور تاحیات اس جلیل عہدہ پر

فائز رہے، دیکھئے، الزرکلی: الأعلام ۱/ ۲۰۰، الطبعة التاسعة ۱۹۹۰ء۔

(۲۲) ڈاکٹر یعقوب صروف (۱۲۶۸۔ ۱۳۴۶ھ / ۱۸۵۲۔ ۱۹۲۷ء) فلسفہ ریاضیات اور فلکیات کے مشہور مصنف بیروت کے قریب ایک گاؤں الحدث میں پیدا ہوئے۔ وہیں امریکن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ مختلف ملکوں میں تدریس کے پیشے سے منسلک رہے۔ ۱۸۷۶ء میں احباب کے ساتھ مل کر مجلّہ المقتطف نکالا، ۱۸۸۹ء میں جریدہ المقطم کی اشاعت میں بھی شریک ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں بیس ناولوں کے علاوہ "سر النجاح"، "بسائط الفلک"، "الحرب المقدسة"، "الحکمة الالٰهية"، "سير الابطال و العظماء" قابل ذکر ہیں۔ الزرکلی: الاعلام ۸/ ۲۰۲

(۲۳) اسماعیل عاصم (م ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) مصر کے مشہور ڈرامہ نگار اور اداکار جو ادب اور لاء کے میدانوں سے بھی پوری طرح وابستہ تھے۔ جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی۔ قرآن کریم حفظ کیا اور شعر و شاعری بھی کی۔ زبان آور خطیب تھے۔ وکالت کے پیشہ سے منسلک ہوئے اور بعض قومی مسائل کا دفاع کر کے شہرت حاصل کی۔ تین ڈرامے تخلیق کئے "صدق الأخاء"، "حسن العواقب" اور "هناء المحبين" یہ تینوں ڈرامے شائع ہو چکے ہیں۔ اوبرا ہوٹل قاہرہ میں ان ڈراموں کو اسٹیج کرنے میں بھی حصہ لیا۔ عوام کی دلچسپی بڑھی اور وہ چوتھائی صدی تک یہ گانے گاتے رہے۔ عرابی انقلاب کے حامیوں اور خطیبوں میں سے تھے۔ ایک لمبی مدت تک جیل میں رہے۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ الزرکلی: الاعلام ۱/ ۳۱۶

(۲۴) محمد ابو الفضل الجیزاوی (۱۲۶۳۔ ۱۳۴۶ھ / ۱۸۴۷۔ ۱۹۲۷ء) جامع ازہر کے شیخ اصول فقہ کے ماہر اور مالکی فقیہ تھے۔ قاہرہ کے مضافات میں پیدا ہوئے۔ جامع ازہر میں تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۲۸۷ھ سے تدریس کا آغاز کیا۔ منطق اور اصول فقہ کی تدریس میں شہرت حاصل کی۔ معهد الاسكندرية کے شیخ مقرر ہوئے پھر شیخ ازہر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ آپ کی تصنیفات میں "الطراز الحديث فی فن مصطلح الحديث"، "كتاب على شرح العضد وحاشيتی السعد و السيد"، "تحقيقات شريفة" (اصول فقہ پر نوٹ) کا تذکرہ ملتا ہے، الزرکلی: الاعلام ۶/ ۳۳۰

(۲۵) شیخ محمد بخیت المطیعی (۱۲۷۱۔ ۱۳۵۴ھ / ۱۸۵۴۔ ۱۹۳۵ء) دیار مصر کے مفتی اور ایک بڑے فقیہ اسیوط کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ازہر میں تعلیم حاصل کی اور وہیں تدریس میں لگ گئے۔ ۱۲۹۷ھ میں شرعی عدالت میں ملازمت اختیار کی۔ جمال الدین افغانی سے ملاقات کی۔ بعد میں محمد عبدہ کی تحریک اصلاح کی

زبردست مخالفت کرنے لگے۔ ۱۳۳۳۔۱۳۳۹ھ کے وقفہ میں مفتی رہے۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ آپ نے متعدد تصانیف چھوڑی ہیں جیسے "ارشاد الامة الی احکام اہل الذمة" ، "احسن الکلام فیما یتعلق بالسنة والبدع من الاحکام" ، "حسن البیان فی دفع ما ورد من الشبه علی القرآن" ، "الکلمات الحسان فی الاحرف السبعة وجمع القرآن" ، "القول المفید فی علم التوحید" ، "حقیقة الاسلام و اصول الحکم" ، " الکلمات الطیبات " اور " رفع الاغلاق عن مشروع الزواج والطلاق " الزرکلی :الاعلام ۶ / ۵۰

(۲۶) احمد عمر الاسکندری (۱۲۹۲۔۱۳۵۷ھ / ۱۸۷۵۔۱۹۳۸ء) مصر کے عالم اور ادیب تھے اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم ازہر اور دارالعلوم قاہرہ میں حاصل کی۔ تعلیم کو پیشہ کے طور پر اختیار کیا۔ وزارۃ المعارف میں المکتب الفنی کے رکن تھے۔المجمع اللغوی کی رکنیت سے بھی سرفراز تھے۔ مختلف درسی کتابیں تیار کیں جیسے " تاریخ آداب اللغة العربیة فی العصر العباسی " ، " نزہة القاری " (دو حصے)،"انتقاد کتاب تاریخ آداب اللغة العربیة" ، "انتقاد کتاب تاریخ العرب قبل الاسلام " وغیرہ، قاہرہ میں وفات ہوئی۔الزرکلی :الاعلام ۱ / ۱۸۳

(۲۷) محمد حلمی عیسیٰ پاشا (م ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۳ء) مصر کے عالم اور وزیر تھے۔ منوفیہ کے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں قاہرہ سے قانون کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور مختلف انتظامی اور عدالتی ذمہ داریاں نبھائیں۔ مصری پارلیمنٹ کے رکن اور مواصلات اور تعلیم کے شعبوں کے وزیر رہے۔ قاہرہ میں انتقال ہوا۔ ایک ضخیم جلد پر مشتمل آپ کی تصنیف " شرح البیع فی القوانین المصریة والفرنسیة وفی الشریعة الاسلامیة " طبع ہو چکی ہے۔ الزرکلی :الاعلام ۶ / ۱۰۹

(۲۸) ایمانویل کانٹ Immanuel Kant (۱۷۲۴۔۱۸۰۴ء) مشہور جرمنی فلسفی اور ماہر مابعد الطبیعات فن کے ہمہ گیر اور منظم علمی کاموں میں پوری دنیا کو متاثر کیا اور علوم الہیات اور جمالیات کے میدانوں میں اپنی علمی اور سائنسی تحقیقات کے ذریعہ فلسفہ کو اور خاص طور سے جرمنی کے مختلف مکاتب فکر کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ کانٹ کی پوری زندگی کونسبرگ میں گزری۔ ۱۷۴۰ء میں الہیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یونیورسٹی میں داخل ہوئے مگر الہیات اور فلسفہ کے بجائے ریاضیات اور طبعیات کے مضامین میں خاص طور سے سر اسحاق نیوٹن کی تحقیقات کی طرف توجہ بڑھتی چلی گئی۔ ۱۷۴۶ء سے ۱۷۵۵ء تک وہ مختلف خاندانوں میں ٹیوٹر کی طرح پڑھاتے رہے تاکہ معاشی کی ضروریات کی

تکمیل ہو سکے تا آنکہ یونیورسٹی میں انہوں نے اپنی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد پندرہ سال تک وہ لکچرر رہے۔ اس دوران ایک استاد کی حیثیت سے معروف ہو گئے۔ اور ان کی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہوا انہوں نے اس سائنس داں کی ریاضیاتی منہاجیات اور اس کے اہم نظریات کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ ۱۷۷۰ء میں منطق اور مابعد الطبعیات کے چیئر پر ان کا تقرر ہوا۔ اس دوران ان کے علمی اور تحقیقی کاموں کی اشاعت شروع ہوئی۔ ۱۷۸۱ء میں ان کی تصنیف Critique of Pure Reason شائع ہوئی جو مابعد الطبعیات پر ان کے نظریات پر مشتمل تھی۔ ۱۷۸۸ء میں Critique of Practicl Reason طبع ہوئی جو کانٹ کے الہیاتی اصولوں کا اہم ماخذ ہے اور ۱۷۹۰ء میں ان کی ایک اور تخلیق Critique of Judgement منظر عام پر آئی۔ کانٹ کا اثر جدید مغربی فکر و فلسفہ پر آج بہت زیادہ ہے۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، ج ۶، ص ۷۱۶

(۲۹) جان اسٹوارٹ مل John Stuart Mill (۱۸۰۶۔ ۱۸۷۳ء) مشہور انگریز فلسفی ماہر معاشیات اور نظریۂ افادیت کا علم بردار لندن میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے والدین کی سرپرستی میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۵۶ء میں انڈیا ہاؤس کے دفتر کا سربراہ مقرر ہوا۔ اس نے متعدد انگریزی جریدوں اور اخبارات میں مضامین لکھے۔ آخر کار لندن ریویو کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ یہ سارے مضامین ۱۸۵۹ء میں Dissertations and Discussions کی دونوں جلدوں میں شامل کر دیئے گئے۔ اس کی اہم ترین تصنیفات میں چند یہ ہیں :

Principles of Potitical Economy (1848)

Subjection of Women (1868), On Liberty (1859)

Considerations on Representative Government (1861)

۱۸۶۷ء میں وہ St. Andrews University کے ایکٹر منتخب ہوئے مگر اسی سال ریٹائر ہو گئے۔ ان کی خود نوشت (Autobiography) اور Three Essays on Religion ان کی وفات کے بعد شائع ہو سکیں۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، ج ۸، ص ۱۳۱

(۳۰) ہربرٹ اسپینسر (Herbert Spencer) (۱۸۲۰۔ ۱۹۰۳ء) انگریز ماہر سماجیات اور فلسفی جو نظریۂ ارتقاء کے اولین علم برداروں میں سے ہیں اور معاشرہ پر فرد کی برتری اور مذہب پر سائنس کو ترجیح دینے کی وکالت کی ان کا سب سے مشہور کارنامہ ان کی کتاب The Synthetic Philosophy ہے جو ۱۸۹۶ء میں مکمل ہوئی۔ یہ کتاب حیاتیات، نفسیات، اخلاقیات اور سماجیات جیسے علوم کی بنیادوں پر مختلف جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسپینسر نے ذاتی مطالعہ

کے نتیجہ میں طبعی علوم میں مہارت پیدا کی چند ماہ تک اسکول ٹیچر بھی رہے۔ ۱۸۳۷ء سے ۱۸۴۱ء تک ریلوے سول انجینئر کی حیثیت سے کام کیا۔ ابتداء میں ۱۸۴۳ء میں The Proper Sphere of Government کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی، مختلف اخباروں میں کام کرنے کے بعد ۱۸۴۸ء میں دی اکونومسٹ کے سب ایڈیٹر ہوئے۔ ۱۸۵۱ء میں ایک اور کتاب Social Statics شائع کرائی۔ ۱۸۵۵ء میں The Principles of Psychology کا پہلا حصہ شائع کرایا۔ اسپینسر عہد وکٹوریہ کے سب سے ممتاز اور زیر بحث مفکر اور فلسفی ہیں۔ ان کی تخلیقات نے سماجی مظاہر کا علمی اور سائنسی طریقے سے تجزیہ کرنے کی راہ ہموار کی۔ ان کے خیال میں سائنس اور فلسفہ نظریۂ انفرادیت کی توسیع کرتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، جلد ۱۱، ص ۸۳۔۸۴

(۳۱) ارسطو Aristotle (۳۸۴ قبل مسیح۔ ۳۲۲ ق. م.) افلاطون کے بعد دوسرا بین الاقوامی، یونانی فلسفی سائنس داں اور معلم جس نے اس وقت کے دریافت کردہ تمام انسانی علوم کا جائزہ لیا اور مغربی اور مسلم مفکرین کو بڑی حد تک متأثر کیا۔ شاہ مقدونیہ کے دربار میں متعین طبیب کا یہ بیٹا عہد شباب ہی میں یونانی طب اور حیاتیات سے روشناس ہوا۔ والد کی وفات کے بعد وہ ۳۶۷ ق. م. میں افلاطون کی قائم کردہ اتھنز اکیڈیمی بھیج دیئے گئے جہاں بیس سال تک وہ مکالمات میں مصروف رہے۔ ۳۴۸ ق. م. میں افلاطون کی وفات کے بعد انہوں نے اتھنز کو خیرباد کہا اور بیس سال تک سیاحت کی۔ مقدونیہ کی راجدھانی پیلا میں تقریباً تین سال تک رہے جہاں الیکزنڈر اعظم کو پڑھایا۔ ۳۳۵ ق. م. میں وہ اتھنز واپس آئے اور پچاس سال کی عمر میں اپنا ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا۔ اگلے بارہ سالوں تک حیاتیات اور تاریخ کے میدانوں میں مختلف قسم کی تحقیقات کرائیں۔ ۳۲۳ ق. م. میں الیکزنڈر کی وفات ہو گئی اور ارسطو وہاں سے واپس آ گئے اور زندگی کے آخری ایام ایوبیا میں گزارے۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا۔ جلد ۱، ص ۵۵۶۔

(۳۲) مجلة المجمع العلمي العربي بدمشق، ۱۹۶۳ء، شمارہ نمبر ۱، ج ۳۸، ص ۵۱۴۔۵۱۸

(۳۳) الجریدہ، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۰ء

(۳۴) فتحی زغلول (۱۲۷۹۔۱۳۳۲ھ / ۱۸۶۳۔۱۹۱۴ء) کا پورا نام احمد فتحی پاشا بن شیخ ابراہیم زغلول تھا، قضا اور قانون کے میدان میں مہارت رکھنے والے یہ عالم مصر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مصری اسکولوں میں حاصل کی اور فرانس جا کر قانون اور وکالت کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۳۰۴ھ میں قاہرہ واپس آئے۔ مختلف حیثیتوں میں ذمہ داریاں نبھائیں۔ عربی میں تصنیف و تحقیق کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی سے ترجمے بھی کئے۔ المحاماۃ اور شرح القانون المدنی آپ کی مشہور کتابیں ہیں۔

(۳۵) عبدالعزیز فہمی (۱۲۸۷۔۱۳۷۰ھ / ۱۸۷۰۔۱۹۵۱ء) مصر کے ماہر قانون تھے۔ جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی۔ لاء کالج قاہرہ سے ڈگری حاصل کر کے وکیل ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء میں وزیر حقانیہ مقرر ہوئے اس کے علاوہ دوسرے انتظامی اور عدالتی عہدوں پر بھی کام کیا۔ ۱۹۱۸ء میں الوفد المصری سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھی۔ پیرس کے سفر میں سعد زغلول سے اختلاف بڑھا تو وطن واپس آگئے۔ ۱۹۲۴ء میں حزب الاحراء الدستوریین کی صدارت کی ذمہ داری نبھائی پھر سیاست سے یکایک الگ ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں وکیلوں کی انجمن کا صدر آپ کو بنایا گیا۔ مجمع اللغۃ العربیۃ کے رکن بھی رہے ۔ فرانسیسی سے عربی میں متعدد کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ قاہرہ میں انتقال ہوا۔ الزرکلی : الأعلام ۴ / ۲۵۔

(۳۶) المصور، ۲۹/ ستمبر ۱۹۵۰ء

(۳۷) جان جاک روسو (Jean Jacques Rousseau) (۱۷۱۲۔۱۷۷۸ء) فرانسیسی فلسفی مصنف اور عالم سیاست کے ماہر تھے۔ ان کے افکار و نظریات نے فرانسیسی انقلاب کے رہنماؤں کو غذا فراہم کی اور دور جدید میں مغرب کے اندر حریت فکر اور معاہدہ عمرانی کے افکار کے ذریعہ جمہوریت اور ذمہ دار حکومت کے قیام کی دعوت دی۔ ۱۷۴۲ء میں شہرت اور قسمت کی تلاش میں پیرس کا سفر کیا لیکن سالوں تک محرومی کا شکار رہے۔ ۱۷۴۳ء میں وینس میں فرانسیسی سفیر کے سکریٹری رہے۔ ۱۷۴۵ء میں پیرس کے ایک ہوٹل میں کام کرنے والی ایک خاتون سے شادی کی۔ جس نے معاشی اعتبار سے انہیں بڑا سہارا دیا۔ موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ فرانسیسی موسیقی پر اطالوی موسیقی کو ترجیح دیتے تھے۔ ۱۷۵۰ء میں اکیڈیمی آف ڈیجن کی جانب سے منعقدہ مضمون نویسی میں حصہ لیا اور " Discourse on the Sciences and Arts" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پہلا انعام حاصل کیا۔ ۱۷۵۴ء میں اسی اکیڈیمی کی جانب سے عدم مساوات کے آغاز پر پھر مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا جس میں روسو نے اپنے مقالہ میں تمام انسانوں کو پیدائشی طور پر مساوی قرار دیا ہے۔ البتہ سماج اور ریاست کی تشکیل نے انسانوں کو اونچ نیچ اور بھید بھاؤ میں بانٹ دیا۔ ۱۷۵۴ء میں وہ اپنی جائے پیدائش جینوا واپس آئے پھر انہوں نے متعدد ناولیں لکھیں۔ ۱۷۶۲ء میں معاہدہ عمرانی (The Social Contract) تصنیف کی۔ پیرس کی پارلیمنٹ نے اس تصنیف کے خلاف آواز اٹھائی اور روسو کو مجبور ہو کر سوئیزرلینڈ میں پناہ لینی پڑی۔ جینوا کی شہریت سے دست بردار ہو کر وہ انگلینڈ چلے گئے مگر ۱۷۶۷ء میں پھر فرانس واپس چلے آئے۔ زندگی کے آخری ایام میں اپنی خود نوشت Confessions لکھی جو ان کے انتقال کے بعد ۱۷۸۲ء میں شائع ہو سکی۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا۔ جلد ۱۰، ص ۲۱۰۔

(۳۸) گستاؤ لیبان (Gustave Le.Bon) (۱۸۴۱۔۱۹۳۱ء) فرانسیسی ماہر نفسیات و سماجیات جو علمی دنیا میں

T- 5767

انبوہ انسانی کی نفسیاتی خصوصیات کے متخصصانہ مطالعہ کے لئے مشہور ہیں۔ فرانس کے ایک گاؤں میں ۷ر مئی کو پیدا ہوئے۔ طب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یوروپ، شمالی افریقہ اور ایشیاء کے متعدد اسفار کئے، اور علم الانسان اور علم اثرات پر متعدد کتابیں لکھیں، اسی زمانہ میں تمدن عرب نامی کتاب بھی تحریر کی جس میں اسلام اور مسلمانوں کی علمی اور تہذیبی تاریخ پر اچھا مطالعہ پیش کیا تھا۔ عمر کے آخری ادوار میں نیچرل سائنس اور سماجی نفسیات میں دلچسپی زیادہ بڑھ گئی۔ ۱۸۹۴ء میں فرانسیسی زبان میں The Psychology of Peoples لکھی اور اس نظریہ کی بنیاد رکھی کہ تاریخ جذبات کے ساتھ نسلی یا قومی کردار کی تخلیق کا نام ہے اور سماجی ارتقاء میں جذبات کی کارفرمائی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے ان کا یہ نظریہ پختہ ہوتا چلا گیا کہ جدید زندگی کی خصوصیت بتدریج انبوہ انسانی کے اجتماع سے عبارت ہے۔ ۱۸۹۵ء میں اپنی مشہور ترین تصنیف The Crowd میں بحث کی بنیاد یہ رکھی کہ ہجوم میں فرد کی باشعور شخصیت خلط ملط ہو جاتی ہے اور کسی ہجوم کی اجتماعی فکر ہی غالب ہوتی ہے۔ ہجوم کا رویہ متفقہ طور پر جذباتی اور علمی اعتبار سے کمزور ہوتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا۔ جلد ۷، ص ۲۱۳۔

(۳۹) المصور، ۳ر جون ۱۹۵۰ء

(۴۰) الجریدۃ، ۱۵ر اپریل ۱۹۱۴ء

باب سوم

الجریدہ اور اس کی خدمات

الجریدہ اور اس کی تاسیس

مشمولات

تعلیم و تربیت کے میدان میں

معاشرتی میدان میں

سیاست کی وادی میں

الجریدہ اور اس کی تاسیس

مصر کے سیاسی و معاشرتی حالات میں انگریز استعمار کے خلاف اُبال آچکا تھا۔ مصری قوم کو اس بات کا شدت سے احساس ہو گیا تھا کہ جب تک ملک استعمار کے چنگل سے نہیں نکلے گا اور اسے آزادی حاصل نہیں ہو گی اس وقت تک تعلیمی بیداری، معاشرتی اصلاح، سیاسی خود مختاری اور قومی شعور کی آبیاری کے خواب ادھورے ہی رہیں گے۔ ملک میں اخبارات و رسائل کی دنیا میں سناٹا تھا۔ بعض اخبارات اگر نکل بھی رہے تھے تو وہ استعمار کے حامی تھے اور ملکی و قومی مسائل میں ان کا رویہ انگریزوں کے ساتھ ہمدردی اور مصریوں کے خلاف محاذ آرائی کا تھا۔ ان حالات میں استاد احمد لطفی السید نے اپنے ہم خیال احباب کے درمیان یہ طے کیا کہ ایک ایسا مصری اخبار شائع کیا جائے جو صرف مصری مفادات کا ترجمان ہو اور سلطنت عثمانیہ یا انگریزی استعمار اور اس کی پروردہ حکومت کی جانب اس کا کوئی میلان نہ ہو، نیز یہ کہ اس اخبار کی ملکیت ملک کے شرفاء اور مخلصین پر مشتمل کسی کمپنی کے ہاتھ میں ہو۔ چنانچہ احمد لطفی السید نے ہوٹل کانٹی نینٹل میں اپنے دوستوں محمد محمود، عمر سلطان، احمد حجازی اور محمود عبد الغفار کی دعوت کی اور مصر کے سیاسی حالات پر طویل غور و خوض کیا۔ وہاں اس مسئلہ پر اتفاق رائے ہوا کہ انگریزوں کے خلاف فرانس سے کسی قسم کا معاہدہ کرنا عبث ہے اور مصری مسئلہ میں کسی بھی دوسری حکومت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

ان احباب کی اگلی نشست محمد محمود پاشا کے مکان پر ہوئی۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے ایک کمپنی الجریدہ کے نام سے قائم کی۔ دس سال کے لئے احمد لطفی السید کو اس کمپنی کا ڈائرکٹر اور چیف ایڈیٹر مقرر کیا۔ ماہانہ ان کی تنخواہ پچاس مصری جنیہہ مقرر ہوئی۔ کمپنی کا قیام کیا ہوا مصری اخبارات و رسائل میں زلزلہ سا آگیا۔ خدیو کے حمایتی اخبارات نے پروپگنڈہ شروع کیا کہ اس نئے گروہ کا تعلق انگریزوں سے ہے اور خدیو کے خلاف سامراج کا ساتھ دے رہا ہے۔ اس الزام کی ایک وجہ یہ تھی کہ کمپنی کے اراکین میں حکومت کے متعدد ملازمین بھی شامل تھے جیسے احمد فتحی زغلول پاشا رئیس محکمہ مصر، احمد عفیفی پاشا مشیر محکمہ استئناف اور عبد الخالق ثروت رکن لجنۃ المراقبۃ وغیرہ۔

افواہوں کی گرم بازاری میں خدیو مصر نے بھی الجریدہ کی جانب سے سخت اندیشہ محسوس کئے، چنانچہ اس نے احمد لطفی السید کو اپنے محل میں ملاقات کی غرض سے بلایا مگر انہوں یہ کہہ کر معذرت ظاہر کر دی کہ میری رائے میں کسی قلم کار کو سلطان کے گھر جا کر ملاقات نہیں کرنی چاہئے۔

الجریدہ کا پہلا شمارہ ۹/ مارچ ۱۹۰۷ء کو شائع ہوا۔ افتتاحیہ میں احمد لطفی السید نے ایک نئے اخبار کی اشاعت کے

پس منظر اور اس کے محرکات و عوامل اور اغراض و مقاصد پر تفصیل سے گفتگو کی۔ مناسب ہوگا کہ وہ افتتاحی مضمون یہاں نقل کیا جائے وہ لکھتے ہیں :

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الجریدۃ

یہ الجریدہ بس ایک مصری اخبار ہے جس کا شعار اعتدال اور میانہ روی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ صحت مند ترقی کے اسباب کی جانب مصری قوم کی رہنمائی کرے انہیں اختیار کرنے کی اسے دعوت دے اور حکومت اور قوم کے تئیں نصح و خیر خواہی کا اظہار کرے اور جو چیز بہتر اور افضل ہو اسے واضح کرے۔ یہ اخبار فرد اور حکومت کی سرگرمیوں پر پوری آزادی سے تنقید کرے گا جس کی بنیاد حسن ظن پر ہوگی اور ملازمین اور افراد کی ذاتی زندگی اور ان کی نجی سرگرمیوں کو نشانہ نہیں بنائے گا جن کا غیر منقسم کُل یعنی امت سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

مصری قوم کے درمیان الجریدہ کے منصوبہ کے آغاز سے ہی بڑا اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے بعض لوگوں نے اس کا ایک مسلک اپنی مرضی سے متعین کر لیا ہے، حالانکہ انہیں ظن و گمان کے سوا اس کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے اگر وہ صبر سے کام لیتے تا آنکہ اخبار شائع ہونے لگتا تو یہ ان کے لئے بہتر ہوتا اور محبّ وطن عناصر کی تعظیم و تکریم کے زیادہ شایان شان ہوتا اور قومی اور وطنی وحدت کے علم برداروں کے درمیان کسی قسم کا کوئی انتشار برپا نہ ہوتا لیکن انہیں صبر کہاں!

اگر معاملہ ان لوگوں تک محدود ہوتا جو علم نہیں رکھتے تو آسان تھا، مگر بعض قلم کاروں اور مصنفوں نے ٹھان لی کہ الجریدہ کی اشاعت سے پہلے ہی اس کی خامیاں گنائیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کا ایک حسب و نسب بھی تخلیق کر لیا جس سے خود اخبار بھی آشنا نہیں ہے، وہ حیرانی اور سرگشتگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا ہے اور ان تمام الزامات سے بَری ہے۔

بہر حال صورت حال جو بھی ہو ہم ان تمام الزامات کو نظر انداز کرتے ہیں کیونکہ ہم شبہات کو دور کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور نہ کوئی ایسا موقف اختیار کرنا چاہتے ہیں جس سے خود ہمارا وقت بھی ضائع ہو، بہر حال ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ خوش خوش اپنے حال میں مست رہے۔

ایک وطن میں رہنے والے کوئی قوم اسی وقت بن سکتے ہیں جب کہ ان کے درمیان اختلافات کا دائرہ تنگ تر ہو اور مشابہت اور اتحاد کا دائرہ وسیع تر ہو۔ بلاشبہ امت کے سیاسی حالات میں سب سے نمایاں مشابہت افراد کے درمیان رائے اور فکر کی مشابہت ہے اسی کو رائے عامہ کہا جاتا ہے۔

اسی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحافت رہنمائی اور نگہبانی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جو قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتا ہے یہاں تک کہ بیشتر عوامی سرگرمیوں کی طرح فرد کے ہاتھ سے نکل کر یہ صحافت گروہوں اور قوموں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہے۔ فرد کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس پر ذاتی میلان اور نجی کمزوری غالب آسکتی ہے مگر ایک متحد جمعیت فرد سے کہیں زیادہ دور رس فیصلہ، مثبت رائے اور محکم فکر کی علم بردار ہوگی۔ وہ ہوا وہوس سے زیادہ محفوظ ہوگی اور واقعات و حوادث کے محرکات ور جحانات اس پر کم اثر انداز ہوں گے۔

قومی خدمت، عوامی معاملات کی نگرانی اور رائے عامہ کی تشکیل کے لئے بہترین صلاحیت اور قدرت سب سے زیادہ اصحاب الرائے کے گروہ میں پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ نسب کی بلندی علم کی برتری یا فضیلت کی وجہ سے عوام و خواص کے لئے مرجع ہوتے ہیں، ایسے لوگ جب امت کی ضروریات میں دلچسپی نہیں لیتے، عمومی تعلیم کی نشر واشاعت، صنعت زراعت اور تجارت کی ترقی کے لئے متحرک نہیں ہوتے اور عوامی نگرانی کا کوئی حصہ ادا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تو پوری قوم صحت مند تہذیب کی ترقیوں کی راہ میں بتدریج پیش رفت سے رک جاتی ہے۔ خاص طور سے اس کے انتظامی معاملات درہم برہم ہو جاتے ہیں اور سب کچھ حکام وقت کی دلچسپیوں پر منحصر رہ جاتا ہے وہی جس طرح چاہتے ہیں معاملات کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں۔

الجریدہ کمپنی کے اراکین انہی محکم اصولوں کی تحصیل کو پیش نظر رکھتے ہیں اور چونکہ یہ اراکین اپنے مراکز اور عوامی سرگرمیوں میں حکومت سے اشتراک و تعاون کے سبب اس سے پوری طرح مربوط ہیں اور اس طرح کے لوگ جب بھی کسی سیاسی سرگرمی کے لئے جمع ہوتے ہیں تو شکوک وشبہات کے سائے انہیں گھیر لیتے ہیں اس لئے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ تمام ممکن شبہات کا ازالہ کرنے کے لئے اس اہم منصوبہ کے متعلق حکومت کو پوری طرح اعتماد میں لیں،

کیوں کہ یہ لوگ اصلاح وترقی کا جو مقصد پیش نظر رکھتے ہیں اس کے حصول کا سب سے بہتر طریقہ بھی یہی ہے۔ حکومت خود بسا اوقات نرمی اور سہولت کے ساتھ کسی مطالبہ کو تسلیم کر لیتی ہے بشرطیکہ اسے اطمینان ہو کہ یہ قوم کے مفاد میں ہے۔

دوسروں کو مطمئن کرنے کی سب سے آسان ترکیب اور مقصد کے حصول کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ طرفین حسن معاملہ اور نرم روی کا مظاہرہ کریں جس میں نہ کسی کی حق تلفی ہوتی ہو اور نہ کسی باطل کی ملمع کاری مقصود ہو۔ یہ اعتدال کا سب سے نمایاں مظہر ہے جو ایک قوم اور حکومت کے درمیان مضبوط روابط کا محکم ستون بن سکتا ہے۔ قوم اور حکومت دونوں تعمیر و تشکیل کے مرحلہ میں ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ضروری ہے کہ کوئی خلاء نہ ہو مبادا حکومت قوم کے مفاد اور آرزوؤں سے واقف نہ ہو سکے اور قوم حکومت کے مقاصد سے نا آشنا رہ جائے اور اس طرح ترقی و تعمیر کے اسباب معطل ہو کر رہ جائیں جو طرفین کے اشتراک و تعاون سے ہی وجود میں آسکتے ہیں۔

الجریدہ کی پالیسی کمپنی کے قانون کی دفعہ ۳ میں صراحت سے بیان کی گئی ہے اسی کے الفاظ ہیں :

"الجریدہ خالصۃً مصری اخبار ہے اس کا مقصد ہر نوع کے مصری مفادات کا دفاع کرنا اور پوری قوم کو صحت مند حیات بخش فوائد کی طرف راستہ دکھانا ہے اور ان کے مادی یا اخلاقی پہلو کو واضح کرنا ہے، اور ہر ایسی سرگرمی کو پرکھنا ہے جس کا کوئی بھی تعلق ان منافع اور مفادات سے ہو خواہ وہ سرگرمی نجی ہو یا عوامی، اور اس کا ماخذ کوئی بھی ہو، اور اس سرگرمی کو انجام دینے والے شخص کی صفت کیسی بھی ہو، اس سرگرمی کے صالح عنصر کو فاسد عنصر سے الگ کرنا بھی اس کے پیش نظر ہے، تمام حالات میں یہ راست بازی کی روش اختیار کرے گا تاکہ غور و تدبر کی مضبوط اساس پر رائے عامہ تشکیل دے سکے۔ یہ اخبار اپنی زبان میں رائے عامہ کی ترجمانی کرے گا اور عوام ہی کی طرف سے اظہار کرے گا۔ پوری قوم کے مفاد کی تائید کرے گا اور ہر قسم کے ذاتی غرض سے بالا ہو کر غور و تدبر کے نتیجہ میں نکلنے والی یہ آواز حکومتی طبقہ تک پہنچے گی اور اعتماد حاصل کرے گی، اور دونوں مل کر ان مصالح و مفادات کی خدمت کے کاز کو آگے بڑھائیں گے، اس میں نہ مذہب کی کوئی

تفریق ہے اور نہ رنگ و نسل کا کوئی فرق ہے۔ یہ اخبار شخصیات کا احترام کرے گا اور خالص مذہبی اختلافی مسائل سے دور رہے گا۔ کسی مقصد کے حصول کے لئے دنیا طلبی اور کسی کا آلۂ کار بنا اس کے پروگرام میں شامل نہیں ہے اور تمام حالات میں اعتدال اور میانہ روی کو ملحوظ رکھنا اس کے پیش نظر ہے"۔

قارئین الجریدہ کے منصوبہ سے پوری طرح واقف رہیں اور اس کے افراد سے مانوس رہیں، اس کی خاطر ہم اخبار کے اراکین کے نام شائع کر رہے ہیں ان کے نام یہ ہیں :

اس کے بعد احمد لطفی السید نے الجریدہ کمپنی کے فاضل اراکین کے اسمائے گرامی تحریر کئے جیسے ابراہیم بک رمزی، احمد فتحی بک زغلول، سید محمد خشبہ بک، حسن بک صبری، حمد بک الباسل، راغب بک عطیہ، سلیمان بک اباظہ، عبدالخالق بک ثروت، عبدالعزیز بک فہمی، علی شعراوی پاشا، عمر بک سلطان، حفنی بک طرزی، علوی بک الجزار، محمد محبّ پاشا، محمود بک عبدالغفار، مصطفیٰ بک رشید اور مصطفیٰ بک کامل الغمراوی وغیرہ۔ اس کے بعد فاضل مدیر لکھتے ہیں کہ :

"اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ راہ حق میں ہمارے قدم مضبوطی سے جمادے اور ہم عوام کی خدمت کے لئے جو جدوجہد کر رہے ہیں اس میں ہمیں راستی سے ہمکنار کرے، وہی راہ دکھانے والا اور مددگار ہے۔ احمد لطفی السید"(۱)

ایک دوسرے مقام پر احمد لطفی السید نے مزید صراحت کی کہ الجریدہ کا مقصد موجودہ حکومت یا منتخب حکومت کی مخالفت کرنا اور اس کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا محاسبہ کرنا نہیں ہے وہ تو ان چیزوں سے بہت بلند مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے :

یہ اخبار اس لئے نکالا گیا ہے کہ حق کی حمایت کرے جسے بیش تر مضمون نگاروں اور مصنفوں نے اپنے ذاتی اغراض کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ رکھا ہے یہ اخبار عوام کے سامنے حقائق کو واشگاف کرے گا، جنہیں آج اکثر لوگوں نے محض اس وجہ سے قوم سے پوشیدہ رکھا ہے کہ ان کی دادودہش کا سلسلہ جاری رہے یا وہ کسی طاقت سے خوف محسوس کر رہے ہیں یا حق پوشی ان کی عادت ثانیہ بن گئی ہے۔ الجریدہ کی اشاعت اس لئے عمل میں آئی ہے کہ وہ واضح کردے کہ ایک ایسا مفاد بھی ہے جس کی راہ میں تمام مفادات قربان کر دیئے جائیں اور ایک ایسا مرتبہ بھی ہے جسے بلند ترین

اور مقدس ترین مرتبہ ہونا چاہئے اور وہ ہے قوم کا مفاد اور اس کا مرتبہ۔ اس اخبار میں ایسے لوگ کام کرتے ہیں جو اس قومی مفاد کو نقصان پہنچانے والے یا قوم کے مقام و مرتبہ کو فروتر کرنے والے ہر عمل اور ہر سرگرمی پر کڑھن محسوس کرتے ہیں۔ ایسی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے اور ان سے انتقام لینے کے لئے قانون کے دائرہ میں رہ کر وہ تمام جائز وسائل کو استعمال کرتے ہیں۔ بانیان الجریدہ اس کی اشاعت سے قبل ہی اس حقیقت سے واقف تھے کہ یہ کام سب سے مشکل، سب سے نازک اور سب سے خطرناک ہے مگر انہوں نے بغیر کسی تردد کے اس خطرہ کو خوش آمدید کہا ہے۔ ملک کی سچی اور حقیقی خدمت اسی وقت ممکن ہے جب کہ اہل الرائے ان صحبتوں اور پریشانیوں پر ملول نہ ہوں جو اعلان حق اور اعلائے کلمۃ الحق کی راہ میں انہیں پیش آسکتی ہیں۔ (۲)

احمد لطفی السید نے بعض ان اخبارات پر تنقید کی ہے جنہوں نے الجریدہ کی پالیسی کو ہدف تنقید بنایا۔ ان میں استاد علی یوسف کا اخبار المؤید پیش پیش تھا۔ اس نے دعوی کیا تھا کہ الجریدہ کے بعض اراکین نے اس کی پالیسی پر اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی ظاہر کی ہے۔ اس اخبار نے یہ الزام بھی لگایا کہ الجریدہ مصری امیر کی آراء کے خلاف رائے عامہ ہموار کر رہا ہے اس پر احمد لطفی السید نے اخبار کے مدیر کو آڑے ہاتھوں لیا:

"یہ ایک نیا مسلک ہے اسلام کی تاریخ میں! المؤید یہ سمجھتا ہے کہ وہ امیر مصر کو مسرور کر رہا ہے خواہ اس کے رویہ سے عقل مذہب فطرت انسانی اور عوام الناس سب غضب ناک ہو جائیں..... کیا حضرت بن عباس اور امام ابو حنیفہ کے وارثوں کو زیب دیتا ہے کہ وہ اپنے لئے اور عوام کے لئے امر کے عمل اور اس کی ترغیب و ترہیب کو سامنے رکھ کر فکر و نظر سے کام لینا چھوڑ دیں؟ کیا ان کے جانشینوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ دھمکی اور خوف سے آزادی و خود مختاری پر پابندی لگائیں، قوم کی خدمت پر ذاتی غرض کو ترجیح دیں؟

..... کوئی بھی مہذب مسلمان امیر..... جیسے ہمارے امیر محترم ہیں..... حکومت کے بیش تر معاملات میں اسلام ہی کی پابندی کرے گا۔ خلیفہ کو بھی وہی کہنا چاہئے جو حضرت عمرؓ نے اپنے عوام سے فرمایا تھا کہ "تم میں سے جو شخص میرے اندر کوئی کجی دیکھے وہ اسے سیدھا کر دے" خلیفہ کو خوشی خوشی ہر مصری کو اس بات کا حق دینا چاہئے کہ وہ حق بات کہہ سکے اور نصح و خیر خواہی کا حق ادا کر سکے" (۳)۔

الجریدہ اخبار میں لکھنے والے قلم کار طبع زاد مصنف بھی تھے اور ماہر مترجم بھی۔ بعض ادیب مخصوص کالموں کی تیاری پر متعین تھے جیسے یوسف البستانی اور نجیب شاہین (۴) غیر ملکی برقیہ کا ترجمہ کرتے تھے اور سیاسی مضامین لکھا کرتے تھے، جب کہ معاشرتی، علمی اور ادبی مقالات لکھنے والوں میں عبد الحمید الزہراوی (۵)، رشید رضا، عبد القادر حمزہ (۶)، محمد السباعی (۷)، عبد الحمید حمدی (۸)، ابراہیم رمزی (۹)، احمد زکی (۱۰)، عبد الرحمٰن شکری (۱۱) اور عبد السلام ذہنی (۱۲) کے نام نمایاں ہیں۔ الجریدہ سے ایسے علماء اور ادیب بھی وابستہ تھے جو عالمی تہذیب و ثقافت سے واقف تھے اور اپنی اعلیٰ تعلیم، ممتاز اسلوب اور منفرد طرز نگارش کے لئے معروف تھے جیسے طہ حسین، مصطفیٰ عبد الرازق (۱۳)، محمد حسین ھیکل (۱۴)، توفیق دیاب (۱۵) اور عباس العقاد (۱۶) وغیرہ۔ ابھرتے ہوئے شعراء حافظ ابراہیم (۱۷)، مصطفیٰ صادق الرافعی (۱۸)، مراد فرج اسماعیل صبری (۱۹)، عبد الحلیم المصری (۲۰)، نقولا الحداد (۲۱)، رشید مصوبع (۲۲) اور نقولا رزق اللہ (۲۳) وغیرہ کی شعری تخلیقات سے الجریدہ کے صفحات مزین رہتے تھے۔

مشمولات

الجریدہ کے مشمولات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آغاز قیام سے ہی قومی اور وطنی تحریک کی حمایت میں مقالہ نگاری اس کا خاص وصف تھا۔ اس کا ہر شمارہ ملکی و قومی مسائل کے تجزیہ پر مشتمل مقالات سے پر ہوتا تھا، صفحہ اول پر اولین سطر میں ہجری اور عیسوی تاریخ رقم ہوتی تھی پھر اس کے نیچے جلی عنوان سے الجریدہ لکھا ہوتا تھا۔ اس کے دائیں جانب زر تعاون اندرون ملک ۱۲۰ قرش سالانہ ۷۵ قرش ششماہی اور بیرون ملک کے لئے ۱۵۰ قرش سالانہ رقم کندہ ہوتی تھی۔ دائیں جانب فاضل مدیر احمد لطفی السید کا نام ثبت ہوتا تھا۔ اس کے نیچے علامہ ابن حزم کی یہ عبارت بطور شعار تحریر ہوتی تھی:

> "جو لوگ تحقیقی نظر رکھتے ہیں اور حقیقت شناسی پر ان کا ضمیر مطمئن ہوتا ہے.... گرچہ یہ حقائق پہلی فرصت میں کرب ناک ہوں..... وہ اپنے بارے میں لوگوں کی مدح و توصیف سن کر جتنا خوش ہوتے ہیں اس سے کہیں زیادہ مسرت انہیں لوگوں کے مذمت آمیز کلمات سن کر ہوتی ہے"

الجریدہ کے صفحات شروع میں چار تھے، بعد میں بڑھ کر چھ صفحے ہو گئے، کچھ دنوں کے بعد پھر چار صفحات میں وہ سمٹ گیا، مگر آخر کار دو صفحات کا اور اس میں اضافہ ہو گیا۔ پہلا شمارہ مثال کے طور پر احمد لطفی السید کے افتتاحی مضمون

سے شروع ہوا، اس میں ایک اور مضمون بھی تھا الوطنیۃ فی مصر (مصر میں وطنی تحریک)۔ دوسرے شمارہ میں ایک معاشرتی اور اجتماعی بحث تھی جس کا عنوان تھا مقابلۃ بین امریکا و مصر (امریکہ اور مصر کے درمیان تقابل)۔ ایک اور مقالہ کا عنوان تھا غنی الطبقة الوسطی بأمریکا (درمیانی طبقہ امریکہ سے بے نیاز ہے)، اس کے ایک کالم کا عنوان تھا المانیا فی مؤتمر الجزیرۃ (الجزیرہ کانفرنس میں جرمنی کی شرکت)۔ تیسرے شمارہ میں اسکندریہ کے حالات اور کچھ تجارتی مشاہدات بیان کئے گئے تھے۔ چوتھے شمارہ میں پبلک ٹیلی گراف علامہ جال فرنٹ کا مضمون "۹۸ گھنٹوں میں چاند کا سفر" شائع ہوا جس کا ترجمہ احمد زکی بک نے کیا تھا۔ نشریات واعلانات کے لئے اخبار کا آخری صفحہ مخصوص تھا۔ اس دور میں مصری صحافت میں مقالہ نگاری کا رجحان غالب تھا۔ الجریدہ کے اولین شماروں میں شائع شدہ بعض مقالات کے عناوین یہاں درج کئے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ مقالہ نگاری کے میدان میں اس اخبار کی ترجیحات کیا تھیں:

- الوطنية المصرية (مصر کی قومی تحریک)
- مقابلة بين امريكا و مصر (امریکہ اور مصر کے درمیان تقابل)
- الدول العظمى و اهم ما يقال فى احوالها (دنیا کی بڑی حکومتیں اور ان کے حالات)
- رقى الحاكمين و المحكومين از رشيد رضا (حاکموں اور محکوموں کی ترقی)
- الصحافة المصرية از يوسف البستانى (مصری صحافت)
- المرأة المسلمة فى روسيا، ہیوگو کا ناول، ترجمہ احمد زکی (روس میں مسلمان عورت)
- الانسان و الحنين إلى الوطن (انسان اور حب وطن)
- التنويم المغناطيسى والوجدان (مقناطیسی خواب آوری اور وجدان)
- حالة التعليم فى مصر از محمد السباعى (مصر میں تعلیم کی حالت)
- المسلمون فى روسيا (روس میں مسلمان)
- مياه الشرب (پینے کا پانی)
- اصلاح المحاكم الشرعية (شرعی عدالتوں کی اصلاح)
- الرياضة البدنية والعقلية (جسمانی اور عقلی ورزش)
- الأوقاف الخيرية والاسلامية (اوقاف اسلامی)
- الشركات والمضاربات (شرکت و مضاربت)

- الحرب العقلية (عقلی جنگ)
- منافع الاوربين ومضارهم فی الشرق از رشید رضا (مشرق میں یوروپین اقوام کے مفادات و نقصانات)
- شبابنا (ہمارے نوجوان)
- الفلاّح المصری (مصری کسان)
- ما للسياسة والعلم (سیاست کا علم سے کیا تعلق ہے)
- إلى النساء از ٹالسٹائی (عورتوں کی خدمت میں)
- حديثة ابن البلد محادثات فی حفلة عرس (شہر زادہ کی داستان)
- كلمة فی خطة الجريدة (الجریدہ کی پالیسی پر چند سطریں)
- تقرير اللورد كرومر عن سنة ١٩٠٦ء (۱۹۰۶ء کے بارے میں لارڈ کرومر کی تجویز)
- إلى الشبان الراشدين (سلیم الفطرت نوجوانوں کی خدمت میں)
- زراعة القطن المصری و اهتمام الانجليز بها (مصری روئی کی کاشت اور انگریزوں کی اس سے دلچسپی)
- إحدى الأغانی (ایک نغمہ)
- لماذا يكون الرجل عظيما (آدمی بڑا کیسے بنتا ہے؟)
- مصر فی عالم السياسة (مصر عالم سیاست میں)
- الوطنية الإنكليزية (اللورد ملنر) (انگریز قومیت)
- دعوة إلى ابناء اللغة العربية از یوسف البستانی (عربی زبان کے سپوتوں سے ایک فریاد)

الجریدہ نے اس طرح ملکی اور قومی مسائل پر مقالات و مضامین شائع کر کے عالم عرب کی صحافت میں ایک ممتاز مقام پیدا کیا تا آنکہ ۳۰ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو اس کا آخری شمارہ شائع ہوا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لئے مصری صحافت کا یہ درخشندہ ستارہ غروب ہو گیا۔

تعلیم و تربیت کے میدان میں

احمد لطفی السید نے اخبار الجریدہ کے ذریعہ مصری صحافت کو جو راہ دکھائی اس میں سب سے زیادہ اہم کردار خود ان کے مقالات و مضامین کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملک اور بیرون ملک کے معروف و ممتاز ادیبوں اور صحافیوں سے بھرپور تعاون لینے کے باوجود اخبار کا زیادہ تر حصہ خود انہی کی تحریروں سے مزین ہوتا تھا۔ فاضل مدیر کی یہ تحریریں مختلف رجحانات کی حامل ہوتی تھیں۔ وہ تعلیم و تربیت کے مسائل پر بھی قلم اٹھاتے تھے اور معاشرتی و اجتماعی مسائل کا تجزیہ بھی ان کے قلم سے شائع ہوتا تھا۔ میدان سیاست کے وہ خود شہہ سوار تھے اور ملکی و قومی مسائل ان کی اولین ترجیح ہوتی تھی۔ پھر عربی لغت کے میدان میں بھی ان کی تحریریں بڑی اہم قرار دی گئیں اور ادب و ثقافت کے رجحانات و مسائل نے بھی ان کے قلم کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

احمد لطفی السید نے الجریدہ کے ذریعہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت اور ان کی ذہنی و فکری آبیاری پر بطور خاص توجہ دی۔ تعلیم و تربیت کے میدان میں ان کی تحریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس ضمن میں مندرجہ ذیل تین بنیادی اصولوں پر زور دیتے تھے۔

۱۔ انسان بنیادی طور پر اپنی فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے جیسا کہ جان جاک روسو نے بھی یہی نظریہ پیش کیا ہے۔ انسان تہذیب و تربیت کے ذریعہ معاشرہ میں اہم کردار ادا کرنے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ یہ قوم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بنیادی اصول کی روشنی میں اپنے فرزندوں کو تیار کرے۔

۲۔ تعلیم و تربیت کا مقصد فرد اور قوم کے اندر اخلاقی اور نفسیاتی توازن پیدا کرنا ہے۔ یہ دونوں کی ذمہ داری ہے کہ عقل اور جسم دونوں کی بھرپور آبیاری پر بہ یک وقت توجہ دیں۔

۳۔ اجتماعی و معاشرتی محققین کی نظر میں تعلیم کا مقصد ایک قوم کے مختلف افراد کے درمیان اتحاد اور مشابہت کا اعلیٰ ترین پیمانے پر حصول ہے کیوں کہ اتحاد اور یگانگت ہی باہمی محبت کا حقیقی سرچشمہ ہے اور محبت ہی قومی وحدت کو جنم دیتی ہے اور قومی وحدت ہی معاشرہ کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔ لطفی السید کی نگاہ میں مذہب کو اخلاقی تربیت کے لئے بنیاد بنایا جاسکتا ہے تاکہ کوئی مصری باشندہ اپنا تشخص نہ کھودے اور اس پر یوروپ کی مادیت غالب نہ آجائے اس مقصد کے لئے وہ نظام تعلیم کی وحدت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقیات عادات و رسوم اور فکر و نظر کے زاویوں میں معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان باہمی قربت کو وہ ناگزیر تصور کرتے ہیں۔ فاضل مصنف کی نگاہ میں جس قوم کے اندر تعلیم و تربیت کے میدان افکار و نظریات میں باہمی قربت ہو، عوام کی دلچسپیوں اور مزاج میں یگانگت ہو، ان کی آرزوؤں اور تمناؤں میں یکسانیت ہو اور اعلیٰ اقدار کے تئیں ایک ہی طرح کی سوچ پوری قوم میں کارفرما

ہو، وہی قوم مجد و شرف اور عظمت و شوکت کی مستحق بنتی ہے اور ترقی کے مختلف میدانوں میں دوسری قوموں سے آگے نکل جاتی ہے۔

تعلیم و تربیت کی اسی اہمیت کی وجہ سے وہ اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں :

"بعض لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم نے تربیت کو اپنا موضوع کیوں بنایا ہے ان کے خیال میں کسی سیاسی اخبار سے تربیت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ پیرس کی صحافت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں جہاں سیاسی اخبارات تربیتی امور سے بحث نہیں کرتے۔ یہ لوگ بھول گئے کہ قاہرہ اور پیرس میں فرق ہے۔ اور یہ کہ بڑے ملکوں کے آزاد اور خود مختار اخبارات اقوام عالم کے مصالح و مفادات سے براہ راست منسلک ہوتے ہیں۔ وہ محض سیاسی تحریکوں کے ترجمان نہیں ہوتے۔ ہمارے سیاسی اخبارات شخصی آزادی کے اصولوں کی نشر و اشاعت سیاسی آزادی کے وسائل کے استحکام مصری رائے عامہ کو مضبوط کرنے کی کوشش کے تئیں بہت زیادہ مخلص نہیں ہیں۔ حکومت کے رویوں کو سمجھنے میں اور خود مختار قوموں کے بالمقابل اپنی ترقی کی راہیں تلاش کرنے میں جن میں سب سے اہم راہ تعلیم کی ہے قوم کی پرانی روش کی اصلاح کی کوشش نہیں کرتی مگر ہمارا معاملہ مختلف ہے۔ ہمارا معاملہ ایک ایسے اخبار سے ہے جو میدان سیاست میں سرگرم ہو یعنی قوم کے مسائل کی تدبیر و انتظام میں مصروف ہو اور اس کا موضوع تعلیم و تربیت کے اہم مسائل ہیں"

(۲۴)

احمد لطفی السید نے مصری معاشرہ پر تعلیمی اور تربیتی نقطۂ نظر سے بڑی تنقیدیں کی ہیں۔ ان کی تنقید کی ایک قسم تو وہ ہے جو مصری معاشرہ کی خصلتوں اور کمزوریوں کے خلاف ہے اور دوسری قسم تعلیم کے نظام اس کے منہج اور طریقۂ کار سے متعلق ہے۔ مصری معاشرہ کی عادات و خصائل کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے ان چھوٹی باتوں پر بھی قلم اٹھایا ہے جن پر عام طور پر لوگ توجہ نہیں دیتے مگر جو ایک فرد اور ایک قوم کے کردار کی تعمیر میں بڑی مؤثر ہوتی ہیں مثال کے طور پر لباس کے مختلف رنگوں کو پسند کرنے کے معاملہ میں مصری ذوق کا انہوں نے محاسبہ کیا ہے، اسی طرح اخبار و واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں نہ سمجھنے پر بھی تنقید کی ہے۔ دوران گفتگو لایعنی اور بے مطلب الفاظ اور جملوں کے استعمال پر بھی گرفت کی ہے، یہاں تک کہ بے نیازی اور سست روی جیسی خصلتوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ایک جگہ وہ ایک فرانسیسی عورت کی مثال دیتے ہیں جو مصر میں کچھ مدت کے لئے بود و باش اختیار کرتی ہے۔ اُس نے اپنی

ڈائری میں لکھا کہ اس نے چار سال مصر میں گزارے، اس دوران باورچی خانہ میں اس سے کوئی پلیٹ نہ ٹوٹی اور نہ کوئی قلم خراب ہوا جب کہ وہ روزانہ لکھنے کا کام کرتی تھی۔ اور ہماری مصری عورتوں کا حال یہ ہے کہ برتن توڑ کر اس پر تبصرہ کرتی ہیں کہ ایک ہی تو ٹوٹا ہے اور اگر نہ ٹوٹے تو قیمتی کراکری کہاں سے آئے۔ (۲۵)

مثبت پہلوؤں پر قلم اٹھاتے ہوئے مصنف نے ان روایات اور عادات کو اختیار کرنے کی دعوت دی ہے جو تہذیب جدید سے ہم آہنگ ہیں، جیسے باغ بانی، پھولوں سے محبت، خوبصورتی سے پیار، عوامی باغات کی دیکھ ریکھ وغیرہ۔ چنانچہ اپنے ایک مقالہ کا عنوان وہ اس طرح قائم کرتے ہیں:

أحبوا الجمال تحبوا الحياة (۲۶)

(جمال اور خوبصورتی کو محبوب بناؤ تو زندگی کو بھی مرغوب بنالو گے)

اس مقالہ میں انہوں نے فنون لطیفہ کی تحصیل پر زور دیا ہے اور فن موسیقی کو علوم وفنون کی فہرست میں شامل نہ کرنے پر تنقید کی ہے۔

تربیت کے تعلق سے استاد احمد لطفی السید تعلیم کو معاشرہ کے تمام طبقوں کے لئے ناگزیر تصور کرتے ہیں، مصر میں تعلیم کا رواج ہوا تو جاگیر دار طبقہ نے عام طور پر طبقۂ اعلی اور طبقہ متوسطہ کے اندر تعلیم کو محدود کرنے پر زور دیا، کسانوں مزدوروں اور کاشت کاروں کے درمیان تعلیم کو عام کرنے پر انہوں نے کوئی توجہ نہ دی، ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر ان لوگوں میں تعلیم عام ہو گئی تو معاشرہ ان کی پیشہ ورانہ خدمات سے محروم رہے گا چنانچہ انہوں نے اپنے ایک مقالہ کا موضوع متعین کیا:

التعليم الأدنى (۲۷)

اس مقالہ میں فاضل مدیر نے تعلیم کے تعلق سے رائج اس غلط فہمی کو رفع کیا کہ تعلیم کسی طبقہ میں محدود رہے، انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ جس قدر ہو سکے حکومت لازمی تعلیم کو عام کرے تاکہ ملک کے مختلف طبقوں کے درمیان ذہنی اور فکری دوری کم ہو سکے اور ان کی سوچ اور خیال میں یکسانیت زیادہ سے زیادہ پیدا ہو سکے، قومی وحدت و سالمیت کے لئے یہ انتہائی ناگزیر ہے۔

احمد لطفی السید تعلیم کے نام پر مصری قوم کے تشخص کو ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں تعلیم لازمی تو ہو مگر مصری ماحول اور تہذیب و تمدن کے تحفظ کے ساتھ ہو۔ اس نظریہ کی اشاعت کے لئے ایک مقالہ تحریر فرمایا:

شئ فی التعلیم (تعلیم پر ایک نوٹ)

اس مقالہ میں انہوں نے وزارت تعلیم پر سخت تنقید کی اور یہ الزام لگایا کہ اس کی ماتحتی میں چلنے والے تمام اسکول اور مدارس مصری تشخص سے عاری ہیں یہاں تک کہ خود مصر کی تاریخ مصری زراعت، آداب نشست، آداب طعام، آداب گفتگو سب پر اغیار کی چھاپ ہے۔ اخلاقیات کی تعلیم سے متعلق کوئی اصول کبھی کسی استاد کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے تو اس پر بھی مصریت کی کوئی چھاپ نہیں ہوتی یعنی خیر و شر کے اصولوں کا ایسا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا جو آخرت میں جزا و سزا پر منتج ہوں بلکہ لذت نفس یا الم و کرب کے اصول کے طور پر یا خود پرستی کے اصول کے تحت ان کے حوالے آجاتے ہیں۔ ان اسکولوں میں جمال اور خوبصورتی کا تصور جو طالب علم کے ذہن میں بیٹھتا ہے اس پر بھی مصری قومیت کا کوئی رنگ نہیں رہتا۔ مدرسہ کی تعمیر اور اس کا نظام سب مصری تشخص سے خالی ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے تمام سرکاری اسکول اور مدارس بس نام کے مصری رہتے ہیں۔ مصر سے ان کا تعلق بس اتنا ہی ہوتا ہے کہ طلبہ مصر کے باشندہ ہیں اور مدرسہ مصر ہی کی سرزمین پر کھڑا ہے۔

احمد لطفی السید نے اپنی اس تنقید سے شرعی عدالت مدرسہ کو مستثنی قرار دیا ہے، جہاں بلاشبہ تعلیم و تربیت کے پورے نظام پر مصری تشخص کی گہری چھاپ ہے انہوں نے محکمہ نظارۃ المعارف کو قدم قدم پر تحریری مشورہ دیئے اس لئے کہ اس کے مشیر بیش تر انگریز تھے اور وہ کوئی ایسا تعلیمی نظام ملک میں رائج کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے جس سے طلبہ میں حریت فکر اور حریت عمل کی آب یاری ہو۔ اسی لئے احمد لطفی السید نے اپنے مختلف مقالوں میں مقصد تعلیم، نظریۂ تعلیم اور تعلیمی مناہج پر گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ تربیت کے مختلف فلسفیانہ نظاموں سے بھی مکمل بحث کی۔ ربیت کے تعلق سے رائج فلسفیانہ مذاہب اور نظریات کا بھرپور جائزہ لیا یعنی :

عملی مسلک تربیت

نظری مسلک تربیت اور

مادی مسلک تربیت

کے تمام پہلوؤں پر کھل کر گفتگو کی۔ مصر میں رائج عوامی سوچ کا بھی ناقدانہ جائزہ لیا اور اپنا یہ نقطۂ نظر مدلل طور پر پیش کیا کہ ہمیں ہمیشہ اس حقیقت کا ادراک ہونا چاہئے کہ ہر قوم کے اندر ایک مخصوص قسم کی تربیت کے لئے مخصوص صلاحیت ہوتی ہے، یہ صلاحیت ترقی کی مسافت اس کی عادات و اخلاق اور روایات سے مربوط ہوتی ہے۔ مصر کا اپنا ایک مخصوص مزاج اور اس کی اپنی اقدار و روایات ہیں۔ تربیت کے مندرجہ بالا تینوں نظریات میں سے کسی نظریہ کو

اس پر ٹھوسا نہیں جاسکتا، مثال کے طور پر جامع ازہر کے ایک طالب علم کے سامنے جو اعلی اقدار ہوتی ہیں وہ سرکاری اسکولوں پروٹسٹنٹ مشینری مدارس کے طلبہ کی اقدار سے مختلف ہوتی ہیں۔

اسی طرح تعلیم وتربیت سے متعلق ایک دوسرے مضمون کا عنوان تھا :

المذهب العملي للتربية والتعليم (۲۸)

(تعلیم وتربیت کا عملی طریقہ)

اس مضمون میں لطفی السید نے ابتدائی تعلیم کو بچوں کی تربیت اور شخصیت سازی میں بہت زیادہ مؤثر قرار نہیں دیا ہے، اس کے بجائے ثانوی تعلیم کی مدت پانچ یا چھ سالوں تک بڑھا کر منطق، اخلاقیات، فلسفہ اور بیالوجی جیسے مضامین کو اس کے کورس میں بڑھانے کی سفارش کی تاکہ سرکاری ملازمت کے لئے طالب علم تیار ہو سکے یا طب، انجنیئرنگ یا قانون جیسی اعلی تعلیم میں اختصاص کی جانب پیش رفت ہو سکے۔ اعلی تعلیم کے مسئلہ پر ان کی رائے یہ ہے کہ اس مرحلہ میں طلبہ کا مسئلہ نہیں ہے اساتذہ کا مسئلہ ہے۔ اس مرحلۂ تعلیم میں لائق محنتی فرض شناس اساتذہ کی تقرری ہی سے اعلی تعلیم کی منزلیں طے ہو سکتی ہیں۔ فاضل مدیر کی نگاہ میں مصر جیسے ملک میں تعلیم وتربیت کے دو اہم مقاصد ہیں :

۱۔ مصری طلبہ کے اندر وہ اجتماعی اور معاشرتی خصوصیات دوبارہ پیدا کی جائیں جن کو استبداد کے طویل دور حکومت نے گھن کی طرح چاٹ لیا ہے مگر طلبہ کے اندر مصری تشخص کا احساس اور اس کا تحفظ ناگزیر ہے۔

۲۔ طلبہ علوم و معارف کے ذریعہ اپنی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کریں تاکہ علمی فنی اور اقتصادی مسائل میں نہ صرف یہ کہ دوسروں کے شانہ بشانہ چل سکیں بلکہ دوسروں سے مسابقت بھی کر سکیں۔

اس طرح احمد لطفی السید نے تعلیم وتربیت کے تمام مسائل پر مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے کھل کر گفتگو کی ہے اور مصری قوم کو قدم قدم پر مخلصانہ مشورے دیئے ہیں۔ تعلیم کے فنی اور تکنیکی پہلو سے بھی بحث کی ہے۔ انتظامی مسائل بھی اٹھائے ہیں اور نظریاتی اور عملی میدان میں بھی قوم کی رہنمائی کی ہے۔

معاشرتی میدان میں

اجتماعی اور معاشرتی مسائل میں الجریدہ نے جو کردار ادا کیا ہے اس کا مقابلہ دوسرے اخبارات ورسائل مشکل سے ہی کر سکتے ہیں۔ حکومتی ملازمین اور حکومت کے مختلف شعبوں میں کارفرما مختلف عوامل اور تقریبات کی آپ نے اصلاح کی، مثال کے طور پر انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ کسی ایک شعبہ میں انگریزوں اور مصریوں کو یکجا نہ رکھا

جائے تاکہ آپس میں اختلاف، نفرت و حقارت، حسد اور کام چوری کے امراض پیدا نہ ہوں ان کے ایک مقالہ کا عنوان ہے:

حُفّتِ الجَنّۃُ بالمکارہ (۲۹) (جنت کانٹوں سے گھری ہوئی ہے)

انہوں نے اس مقالہ میں حکومتی مشینری پر تنقید کی ہے کہ کوئی بھی وزارت ایسی نہیں ہے جس میں کام کرنے والے مختلف عناصر اور اجزاء میں باہمی منافرت نہ ہو۔ ان مختلف عناصر میں نہ تو کوئی ظاہری یگانگت نظر آتی ہے نہ نفسیاتی مفاہیم میں کوئی وحدت کار فرما ہے اور نہ کسی شعبہ میں پیش آنے والے روزمرہ کے واقعات کی تحلیل و تجزیہ میں کوئی متحدہ سوچ نظر آتی ہے۔ انگریز مصری کو حقیر سمجھتا ہے، درجۂ انسانیت میں اسے اپنے سے کم تر گردانتا ہے اسی طرح مصری اگر کمزور ہے تو انگریز کے خلاف سازشیں کرتا ہے اور اگر طاقت ور ہے تو علانیہ اس سے دشمنی کرتا ہے، باہمی منافرت کی یہ صورت حال لطفی السید کی نگاہ میں قومی ترقی کے لئے بے انتہا مضر ہے۔

انگریزوں نے بعض وزارتوں میں اپنے ہم جنس ملازمین ہی کا تقرر کرنے کی پالیسی اختیار کی اور اس کی توجیہ یہ پیش کی کہ اس سے مختلف شعبوں میں انگریز مصریوں کی فنی و انتظامی اور پیشہ ورانہ تربیت کر سکیں گے اور انہیں ان شعبوں کو ذمہ داری کے ساتھ سنبھالنے کے قابل بنائیں گے۔ اس پالیسی پر الجریدہ نے سخت تنقید کی اس طرح کی مخصوص وزارتوں میں کام کرنے والے انگریزوں کی صلاحیت کا اخبار نے ایک سروے پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ ان انگریز ملازموں کی بڑی تعداد ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جو کچھ نہیں جانتے، جن کی کارکردگی سے کسی مخصوص صلاحیت کا پتہ نہیں چلتا اور جن سے مصریوں نے کچھ نہیں سیکھا، اخبار کے ایڈیٹر کی رائے میں اس صورت حال کا اعلان ممکن ہے اور وہ حریت عمل کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

اخبار مذکور نے مصری ملازمین کی اخلاقیات کا بھی جائزہ لیا اور ان اسباب کی نشان دہی کی جن کی وجہ سے مختلف اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جیسے خوشامد، چاپلوسی، تقرب سلطانی اور ارباب حکومت کا خوف جیسی بیماریوں کی اصل وجہ خود اعتمادی کی کمی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اس صورت حال کی واحد وجہ خود اعتمادی کا فقدان ہے کیوں کہ ایک مصری ملازم اسکول سے فارغ ہوتا ہے، کسی ملازمت کو اختیار کرتا ہے اور مختلف عہدوں پر ترقی کرتے کرتے اعلیٰ ترین عہدہ تک بھی پہنچ جاتا ہے، مگر ان سارے مراحل میں وہ اپنے ساتھیوں اور اپنی قوم کا اعتماد حاصل نہیں کر پاتا بلکہ ترقی کے ہر زینہ پر عوام اس کی تنقیص کرتے ہیں، پھر جب وہ ملازمت سے

سبکدوش ہوتا ہے تو اپنے گھر میں بند ہو کر بیٹھ رہتا ہے اور بس خوشی اور غمی کی تقریبات ہی میں بمشکل نظر آتا ہے اس طرح ملازم اپنی ملازمت کی پوری مدت کے دوران ہر قسم کی خود اعتمادی اور احساس قومی سے محروم ہی رہتا ہے"۔(۳۰)

اس طرح انہوں نے مصری ملازمین کے اندر ذمہ داری کا احساس نہ ہونے پر بھی سخت تنقید کی اور اسے ایک قومی مرض قرار دیا(۳۱)، ایک دوسرے مقالے میں انہوں نے ایک دوسری اخلاقی کمزوری پر گرفت کی کہ وہ اپنی ملازمت کی حدود سے واقف نہیں ہوتا اور نہ اطاعت کی حدود کا آشنا ہوتا ہے(۳۲)۔ان تمام مسائل کے تئیں احمد لطفی السید کے نزدیک ہمارا صحت مند نظریہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم قوم سے پہلے فرد کے اندر آزادی اور خود اعتمادی کی روح پھونکیں۔

حکومتی ملازمین ہی نہیں عام مصری شہریوں کی اخلاقیات اور ان کے سماجی رویوں کا بھی احمد لطفی السید نے بے لاگ جائزہ لیا۔ فاضل مدیر کے نزدیک مصری معاشرہ کو جو سب سے بڑی خرابی لاحق ہے وہ قومی تشخص کا فقدان ہے۔ وہ کہتے ہیں :

"آج ہمارا ساتھی زندہ آدمی کے لباس میں ایک مردہ لاش ہے۔وہ خوش پوشاک ہے مگر اس کا وجود عدم کے برابر ہے۔وہ پیٹ کا غلام ہے۔اس کی قربت آپ کو نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ اس سے دوری کسی ضرر کا باعث ہو سکتی ہے کیوں کہ وہ تشخص سے محروم ہے"۔(۳۳)

مصری معاشرہ کی ایک اور خرابی جس پر احمد لطفی السید نے توجہ دلائی ہے وہ ابطال پرستی ہے۔ان کے خیال میں جنگ کے ہیرو عوام کی ذہنی اور فکری صلاحیت کو مسخر کر لیتے ہیں۔ رعایا ان کے سامنے سر افگندہ ہو جاتی ہے۔اپنی ظاہری سرگرمیوں میں اس طرح کے جذبات و احساسات کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ایک طرح کی پرستش اور عبادت معلوم ہوتی ہے۔وہ اس طرح غیر شعوری طور پر اللہ واحد کے ساتھ کچھ نئے خداؤں کو شریک کر لیتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ مصنف نے فرانسیسی حملہ کے دوران مصر میں گائے جانے والے نغموں کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ان عربی نغموں میں نپولین اور اس کی فوج کی تعریف و توصیف اور اس سے محبت و عقیدت کا اظہار ہے مصنف کہتے ہیں :

"دیکھئے تو صحیح ابطال پرستی نے کس طرح عوام کے طبعی اور فطری شعور کو پامال کر دیا ہے، کس طرح اس نے وطن کی محبت کو بھی اپنے سامنے ماند کر دیا ہے لوگوں کی عقلوں پر کس طرح یہ چیز چھا گئی ہے کہ پیش آمدہ واقعات کا تجزیہ بھی اپنے ذہن و فکر کے مطابق وہ نہیں کر پاتے، اور نوبت

یہاں تک پہنچ گئی کہ اس طرح کے گانوں کو وہ پسند کرنے لگتے ہیں اور ان کی زبانوں پر یہ گانے جاری ہو جاتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ عرب ان کے بھائی اور ان کا دفاع کرنے والے ہیں۔ یہ بے چارے فوج کے سامنے عربوں کی شکست پر نغمہ سرا ہوتے ہیں"۔(۳۴)

فاضل مصنف کے نزدیک انسان ہر ایک کی تعظیم و تکریم کرے اور ہر شخص کو اس کا جائز مقام دے مگر یہ احترام اور توقیر اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ شرک کے دائرہ میں آجائے۔ اسی طرح ایک اور معاشرتی برائی ریاو نمود پر بھی وہ تنقید کرتے ہیں۔ کوئی انسان کسی مسئلہ کے سلسلہ میں ایک بات کہتا ہے مگر جلد ہی وہ کسی بڑے آدمی کو خوش کرنے کے لئے یا اس کے غضب سے بچنے کے لئے اپنی بات بدل دیتا ہے۔ احمد لطفی السید کے الفاظ میں "ایک شخص ایک عارضی قمیص تیار کرتا ہے اور اگر وہ قمیص وفاداری کے ساتھ ہم آہنگ ہو تو اسے زیب تن بھی کر لیتا ہے مگر جب کوئی نئی وفاداری آجاتی ہے تو اس قمیص کو اتار دیتا ہے اور اسے پہننا گوارا نہیں کرتا"۔(۳۵)

فاضل مصنف مصری معاشرہ کے مختلف طبقوں میں بدکرداری کے رواج پر بھی تنقید کرتے ہیں(۳۶)۔ اسی طرح وہ عوامی حقوق کے تئیں سہل انگاری کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ اس کی ایک نمایاں مثال دیتے ہیں کہ الیکشن کے زمانہ میں عام مصری یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ بس میں نے آپ کی خاطر آپ کے امیدوار کو ووٹ دے دوں گا۔ اسی طرح ایک دوسرا شخص جواب میں کہے گا کہ میں آپ کے امیدوار کو ووٹ دینے سے معذور ہوں اس لئے کہ میں نے فلاں امیدوار سے وعدہ کر لیا ہے افسوس کہ آپ دیر سے آئے۔ کوئی شخص اس طرح کے جوابات دیتے وقت اس کا اظہار نہیں کرتا کہ فلاں امیدوار مطلوبہ عہدہ کے لئے زیادہ موضوع ہے اور عوامی خدمت کا جذبہ زیادہ رکھتا ہے اور فلاں امیدوار قوم کی نمائندگی کے لئے موضوع نہیں ہے اس لئے میں اسے ووٹ نہیں دے سکتا۔ اس قسم کے سرسری جوابات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عوام حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں بہت کوتاہ واقع ہوئے ہیں۔(۳۷)

احمد لطفی السید نے مصری عورت کے مسائل پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مصر میں تحریک نسواں کے علمبردار قاسم امین کی بڑی تعریف کی ہے۔ فاضل مصنف کی نگاہ میں قاسم امین نے مصری عورت کو قید خانہ سے نکالا ہے اور اس کی عائلی اور ازدواجی زندگی کی تاریکیوں کو دور کیا ہے اور اسے یہ احساس دلایا ہے کہ اگر وہ ماں ہے تو قابل احترام ہے اگر وہ بہن ہے تو قابل شفقت و محبت ہے اور اگر وہ بیوی ہے تو محبت اور اعتماد کا مرکز ہے۔ قاسم امین نے دراصل دین حنیف کی جانب لوگوں کی رہنمائی کی ہے مگر اکثر لوگ اس کو سمجھتے نہیں ہیں۔(۳۸)

اپنے ایک مضمون میں احمد لطفی السید نے مصر کے خاندانی نظام کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

بناتنا و أبنائنا (۳۹) ہمارے بیٹے اور بیٹیاں

اس مقالہ میں فاضل مدیر نے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان فکری اور نفسیاتی ہم آہنگی پر زور دیا ہے جدید تعلیم اور جدید تہذیب سے آراستگی کی دعوت مصری خاتون کو دی۔ ایک اور مقالہ میں وہ عورت کو زندگی کی تمام سہولتیں فراہم کرنے پر زور دیتے ہیں، اس مقالہ کا موضوع قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔

لا تضیقوا علیہن (۴۰) (خواتین کو تنگی میں مبتلا نہ کرو۔)

فاضل مصنف کے نزدیک بہت سے مرد جو خواتین کی تربیت کے قائل ہیں عورتوں کے لئے ان علوم کی تحصیل کو ممنوع قرار دیتے ہیں جنہیں آج کے نوجوان پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ اسی طرح آزادیٔ نسواں کے علمبردار بعض ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو یہ دیکھ کر کڑھتے ہیں کہ وہ تفریح گاہوں میں جاتی ہے یا اپنے قدیم طرز لباس میں کچھ تراش خراش کرتی ہے حالاں کہ لطفی السید کے نزدیک مصری دوشیزہ کو الف ب کی تعلیم کے ساتھ یہ بنیادی سبق بھی دینا چاہئے کہ وہ ایک آزاد مخلوق ہے اور اسے بھی اللہ نے آزادی سے ہم کنار کیا ہے اور جو چیز اللہ کی عطا کردہ ہے اسے دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا انسان بھی چھین نہیں سکتا۔

استاد احمد لطفی السید نے خواتین سے مناسب طرز گفتگو اختیار کرنے پر زور دیتے ہوئے ٹالسٹائی کے اقوال نقل کئے ہیں اور ایک اور مضمون اس عنوان کا تحریر کیا ہے :

المرأة ایضاً (۴۱) (خاتون بھی)

وہ لکھتے ہیں :

> "جب مرد عورت کے حق مساوات اور حق انتخاب اور حق ملازمت کو غصب کرتا ہے تو عورت بھی اس کی آزادی کو غصب کر لیتی ہے اور اپنے آپ کو ایک ایسے بادشاہ کے روپ میں پیش کرتی ہے جو قدرت ملنے کے بعد رحم نہیں کرتا، بوقت ضرورت حسن سلوک سے پیش نہیں آتا اور مجبوری میں معافی کا قائل نہیں ہوتا گویا، عورت مرد کی فریفتگیٔ جمال کو ہتھیار بنا لیتی ہے جس سے وہ عدم مساوات کا انتقام لیتی ہے اور مرد کے فکر غلط کا تاوان وصول کرتی ہے۔ اگر مرد اس پر حکمرانی کرتا ہے تو عورت گھر کے اندر اس پر حکومت کرتی ہے"۔

استاد لطفی السید عورت کے انتقام اور مرد سے بدلہ لینے کی مختلف ترکیبوں کی تفصیل بتاتے ہیں۔ مرد کی طرف سے جو زیادتی ہوتی ہے اس کا مداوا عورت اس طرح تلاش کرتی ہے کہ وہ اس کے دل و دماغ کو قابو میں کر لیتی ہے کبھی

اسے مفارقت کے آزار میں مبتلا کرتی ہے اور کبھی بد کردار بن کر اس کے لئے مختلف قسم کے مسائل کھڑا کرتی ہے اور میدان زندگی میں اپنے مجموعی رویّہ سے یہ سوال کھڑا کر دیتی ہے کہ کون حاکم ہے اور کون محکوم۔ فاضل مصنف کے نزدیک مصری عورت اس طرح کی کوئی انتقامی کارروائی نہیں کرتی۔ انگلینڈ میں خواتین نے مطالبات کی جو تحریک جاری کر رکھی ہے اس طرح کی کوئی فہرست مطالبات وہ یہاں اپنے خاوندوں کے سامنے پیش نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس وہ مردوں کی انفرادی خوش حالی اور قومی آسودگی کی خواہش رکھتی ہیں۔

خواتین کے اخلاق اور روحانی جمال اور حسن سیرت پر استاد لطفی السید نے متعدد مقالے تحریر کئے ان میں سے ایک مقالہ کا عنوان ہے :

بناتنا (۴۲) ہماری بیٹیاں

اس مقالہ میں وہ بچیوں کی تعلیم و تربیت پر بڑے دل نشیں پیرائے میں روشنی ڈالتے ہیں اور والدین کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں کی جسمانی اور بدنی خوبصورتی کو سب سے اہم مسئلہ سمجھتے ہیں۔ وہ پریشان رہتے ہیں کہ کسی عضو میں کوئی نقص نہ ہو چہرہ پر کیل مہاسے نہ ہوں، کھال میں کوئی خرابی نہ ظاہر ہو جائے جس سے اس کا ظاہری حسن متاثر ہو اور شادی کے مارکیٹ میں اس کی قیمت کم ہو جائے۔ استاد لطفی السید اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ والدین اپنی بیٹیوں کے جسمانی عیوب سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں مگر عقل و ضمیر کے معنوی عیوب کی جانب سے بے فکر رہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :

> "والدین کو اپنی بیٹیوں کے لئے جہیز کی فکر پریشان رکھتی ہے۔ وہ آغاز طفولیت ہی سے اس کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ لڑکی کے کان اور ناک میں سوراخ کروا دیتے ہیں پھر وہ ہر سال اس کے لئے کچھ نہ کچھ زیور خریدنے لگتے ہیں۔ والدین اس مضحکہ خیز انداز میں اپنی بیٹی کی شادی کی تیاری کرتے ہیں گویا شادی بس اسی کا نام ہے کہ کان میں بالی ہو، ناک میں لونگ ہو، کلائیوں میں سونے کے کنگن ہوں اور انگلیوں میں انگوٹھیاں ہوں۔ گلے میں ہار ہو، گلابند ہو، لاکٹ ہو، مگر شادی کا ان چیزوں سے کیا تعلق؟ شادی تو نام ہے دو روحوں کے درمیان ایسے ملاپ کا جسے صرف موت ہی جدا کر سکے۔ اصل میں اس کی وجہ یہ ہے کہ عزیز و اقارب آج تک یہی سمجھتے ہیں کہ زوجین کے درمیان ہم آہنگی محض اتفاق ہے اور محبت والدین کی برکت سے محض خدا کی توفیق سے پیدا ہوتی ہے، یا دلہن کی خوبصورتی کی وجہ سے محبت کا اظہار ہوتا ہے اور چونکہ ہم آہنگی اور محبت

اتفاقیہ وجود میں آتی ہے اور دلوں کی قربت اور عقلوں کی تعلیم وتربیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے والدین جہیز کی تیاری ہی میں پوری طاقت صرف کر دیتے ہیں۔ آگاہ باش! زیورات کی خریداری میں جو کچھ تم خرچ کرتے ہو وہ لڑکیوں کی تعلیم وتربیت پر خرچ کرو یہ دائمی زیورات ہیں۔ اس سے جوانی کا حسن بھی نکھرے گا اور بڑھاپے میں بھی جمال باقی رہے گا"۔(۴۳)

استاد احمد لطفی السید نے معاشرہ کے کمزور طبقات خاص طور سے کسانوں اور مزدوروں کے مسائل سے بھی دلچسپی لی اور ان کی اخلاقیات کو سدھارنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اس موضوع پر ان کے ایک مقالہ کا عنوان ہے :

الرجل الطیب (۴۴)(نیک آدمی)

اس میں انہوں نے عوام کو توجہ دلائی ہے کہ کبھی اچھے اور نیک آدمی کی تلاش میں الہ دین کا چراغ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں وہ کسان اچھا نظر آتا ہے جو دن بھر کھیت میں ہل چلاتا ہے، وہ کاری گر انہیں بہت پسند آتا ہے جو دن رات فیکٹری میں اپنے کام میں مست رہتا ہے، وہ تاجر ان کے دل کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے جو تجارت کی راہ میں منزل مقصود کی جانب گامزن رہتا ہے۔

اس طرح اجتماعی اور معاشرتی مسائل میں استاد احمد لطفی السید نے قوم کی رہنمائی کی اور ان کے سامنے اعلی اقدار وروایات پیش کیں۔

سیاست کی وادی میں

الجریدہ کا اصل میدان کار سیاست کی وادیٔ خارزار تھا۔ استاد احمد لطفی السید میدان سیاست ہی کے شہہ سوار تھے۔ انہوں نے مصری سیاست کے نشیب وفراز کو اچھی طرح دیکھا اور پرکھا تھا اور اس راہ کے ہر موڑ پر قوم کی رہنمائی کی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ مصر میں ایک دستوری حکومت کا قیام تھا۔ انگریز سامراج کا انخلاء اور قومی حکومت کی تشکیل الجریدہ کا اہم ترین نصب العین تھی مگر لطفی السید انقلاب وتشدد کی جگہ اعتدال اور تدریج کے قائل تھے۔ الجریدہ کے صفحات میں دستور سازی اور مصری حکومت کی شکل وصورت انہی دو اہم ترین مسائل پر زیادہ تر بحث ملتی ہے۔ احمد لطفی السید نے حزب الامۃ کے صدر دفتر میں لکچر دیتے ہوئے دستور کے مسئلہ پر روشنی ڈالی کہ ۱۸۷۷ء میں عثمانی دستور نافذ ہوا تو اس وقت مصریوں کو اپنے دستوری حقوق کی فکر لاحق ہوئی اور یہ کہ عرابی انقلاب دراصل ایک دستوری انقلاب تھا اور مصری پارلیمنٹ اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس لئے مستعد نہیں ہے کہ اسے ابھی سیاست کا زیادہ تجربہ

نہیں ہے اور یہ کہ قصر عابدین اور قصر الدوبارہ کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور برطانوی استعمار اس کے خلاف مسلسل سازشیں کرتا رہتا ہے۔ اور ارباب حکومت کی نیتوں میں فساد بھی اس ناکامی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ ایک بار خدیو عباس نے یہ بیان دے دیا کہ مصری قوم دوسری مشرقی اقوام کی طرح شخصی اور آمرانہ حکومت ہی کے لائق ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے احمد لطفی السید لکھتے ہیں کہ : مصری رائے عامہ خدیو کے اس بیان پر چراغ پا ہو گئی چنانچہ اس نے اپنے کسی حاشیہ نشیں کی زبان سے فوراً معذرت شائع کرائی۔ معاملہ مزید خراب ہو گیا جب سر گورسٹ نے سر میں سر ملائی اور یہ بیان دیا کہ مصری اس وقت کسی دستور کے اہل نہیں ہیں، اس وقت سے انگریز یہ سوچنے لگے کہ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ مصری باشندے اس تحریک کے بارے میں سوچنا بند کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سیاسی پٹارے سے ایک نیا موضوع نکالا اور وہ تھا مصری قوم کی صلاحیت کا مسئلہ۔ چنانچہ انہیں اس نئے موضوع پر الجھا دیا۔ یہ شوشہ برطانوی استعمار کا پیدا کردہ دراصل ایک مغالطہ تھا۔ وہ وقت گزاری کے لئے مصری قوم کو الجھائے رکھنا چاہتا تھا۔ اس موقع پر لطفی السید نے اپنے مقالات اور تحریروں کے ذریعہ استعمار کی تمام دلیلوں کے تار و پود ایک ایک کر کے بکھیر دیئے اور مصری قوم کے سامنے برملا اعلان کیا کہ قوم کو دستور بنانے کا حق اسی طرح ہے جس طرح فرد کو آزاد رہنے کا حق ہے اور کسی قوم کو دستور سے محروم کرنا ایسا ہی ہے جیسے فرد کو اس بنا پر آزادی سے محروم کر دیا جائے کہ وہ حبشی ہے یا لکھنا پڑھنا نہیں جانتا یا اس نے غزالی اور ابن رشد وغیرہ پر سند فراغت حاصل نہیں کی ہے، قوم کے اقتدار کا معاملہ بقیہ حقوق کی طرح نہیں ہے اس لئے اس میں کسی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں ہے۔ قوم اس میں کوئی ترمیم و اضافہ بغیر کسی معاہدہ کے نہیں کر سکتی، اس طرح کی کوئی کارروائی سراسر باطل اور بے بنیاد ہو گی۔ (۴۵)

حکومت کی شکل و صورت کے بارے میں فاضل مدیر نے بارہا اس کی صراحت کی کہ مطلق العنان حکومت ایک مجبوری کی حکومت ہوتی ہے۔ اگر قوم کے مختلف عناصر کے درمیان اجتماعی اور معاشرتی روابط اس طرح مستحکم ہو جائیں کہ وہ ایک قوم بن سکیں تو وہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ایک مطلق العنان حکومت وجود میں آتی ہے۔ ایک آمر مطلق خواہ کتنا ہی نیک دل اور بہتر سیاست داں ہو اس کی حکومت بہر حال شر کا مجموعہ ہو گی اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ایک نمائندہ حکومت قوم کی تربیت کے لئے بہترین ذریعہ ہوتی ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بات یہ ہے کہ کوئی فرد واحد خواہ عقل و حکومت کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہو تنہا اجتماعی و تمدنی مسائل کو حل کرنے کی قدرت نہیں رکھ سکتا۔ لامحالہ اس کی وجہ سے قوم بڑے بڑے مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنے پر مجبور ہو گی جن سے وہ دوسری صورت میں محفوظ رہ سکتی تھی۔ (۴۶)

اس طرح کی مطلق العنان حکومت پر استاد احمد لطفی السید جابجا تنقید کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات اس پر پھبتی بھی کستے ہیں اور مثالیں دے کر اس کی شناعت بھی ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس موضوع پر ایک مقالہ تحریر کرتے ہیں جس کا عنوان ہے :

روضوا أنفسكم على الإستقلال (۴۷)

(اپنے آپ کو آزادی کے لئے تیار کرو۔)

اس مقالہ میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :

"ہندو اپنے ہاتھ سے اسٹیچو بناتے ہیں، صبح کو جب وہ نیند سے بیدار ہوتے ہیں تو کوئی کام نہیں کرتے جب تک کہ اس خود ساختہ بت کو پرنام نہ کرلیں اور اس کی پوجا پاٹ نہ کرلیں، یہی معاملہ مصریوں کا ہے، اپنی ہی تشکیل دی ہوئی حکومت کو یہ بڑا مقدس سمجھتے ہیں، کیا آپ اس شخص پر ہنسنے کا یارا رکھتے ہیں جو اپنے ہی ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز کو مقدس سمجھے"۔

مصری اخبارات نے قوم کے حق نمائندگی پر جتنا زیادہ اصرار کیا اور دستوری حکومت کی تشکیل پر جس قدر زور دیا اتنا ہی برطانوی استعمار نے اہالیان مصر کو ان کے حقوق سے محروم رکھا۔ لارڈ کرومر نے چند قدم آگے بڑھ کر ایک بین الاقوامی مجلس قانون ساز کی تشکیل کا اعلان کیا، جس کا مقصد استثنائی حقوق کو اس طرح اصل اور بنیادی حقوق کا درجہ دینا تھا کہ کسی بھی مصری حکومت کے لئے یہ آسان نہ رہ جائے کہ ان حقوق سے دست برداری پر یوروپین اقوام کو مطمئن کرسکے۔ اس نئے اعلان کے مطابق غیر ملکی مقیم باشندوں کو تمام ٹیکسوں سے مستثنی قرار دینا تھا اور اہل وطن ایک غیر ملکی قانون کے مطابق قونسلیٹ کی عدالتوں کے سامنے اپنے مقدمات لے جاتے۔ اس طرح غیر ملکیوں کا اقتدار اہل وطن کے مقابلہ میں مزید مستحکم ہوتا اور پوری قوم ایک غیر ملکی قانون کے تابع ہوتی جسے نافذ کرنے والی غیر ملکی عدالتیں ہوتیں اور غیر ملکی پولیس امن عامہ کی محافظ ہوتی اور مجلس شوری حسب معمول قانون سازی کے ہر قسم کے اختیار سے محروم رہتی۔ اس پر مستزاد یہ کہ بین الاقوامی مجلس قانون ساز جب جوان ہوتی اور مصری ترقی کے اعلی درجہ تک پہنچ جاتے تو یہ ایک مخلوط پارلیمنٹ میں تبدیل ہو جاتی جس میں یوروپین باشندے اصل باشندے قرار پاتے اور مصری اپنی قدر و قیمت کھو چکے ہوتے۔ استاد احمد لطفی السید اس مجلس کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"ہمیں نہیں معلوم کہ اس ملک میں ..... جو نوادر و عجائبات کا ملک ہوگا ..... اس وقت مصری اور یوروپین کے درمیان حقوق میں مساوات عمل میں آسکے گی، یا غیر ملکی امتیازات یوروپین

اقوام کے امتیازات نہ ہو کر ایسے امتیازات میں تبدیل ہو جائیں گے جو سفید مصریوں کو کالے مصریوں پر حاصل ہوں گے۔ یہ لازمی نتیجہ ہو گا اس مجلس قانون ساز کا جو بدلتے ہوئے حالات میں غیر ملکیوں کے دل و دماغ میں قانون سازی کے عمل کو اور مصریوں پر حکومت کرنے کی روایت کو راسخ کر دے گا۔ اس طرح ان مصریوں کے دلوں میں یہ بات جڑ پکڑ لے گی کہ وہ ان قوانین پر راضی برضا ہیں جن کو مقامی قرار دیا جا رہا ہے اور جنہیں بنانے والے بھی غیر ملکی ہی ہیں۔ اس لئے بین الاقوامی مجلس قانون ساز کا یہ منصوبہ اصلاح سیاسی کا کوئی منصوبہ نہیں ہے بلکہ سیاسی عمل کو پیچھے لے جانے کا منصوبہ ہے"۔(۴۸)

استاد احمد لطفی السید نے لارڈ کرومر کے جانشین سر ایلڈون گورسٹ پر تنقیدوں کا سلسلہ جاری رکھا، چنانچہ ان کے ایک مضمون کا عنوان یہ ہے :

المجالس النيابية (پارلیمان کمیٹیاں)

أو مطالب الأمة من السرغورست (۴۹)

(سر گورسٹ سے قوم کے مطالبات)

اس مقالہ میں فاضل مصنف نے تین قومی مطالبات کی تفصیل پیش کی :

۱۔ طریقۂ انتخاب میں ترمیم

۲۔ مجلس شوریٰ کی تجدید

۳۔ موجودہ مجلسوں کے اختصاص میں توسیع کرنا

سیاست کے میدان میں استاد احمد لطفی السید نے اخبار الجریدہ کے ذریعے ایک اور جنگ لڑی اور وہ تھی ملکی اور غیر ملکی اقتدار کے خلاف مصری قوم کے مفادات کے تحفظ کی جنگ، بسا اوقات خدیو کی حکومت اور انگریز استعمار کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی جو سیاسۃ الوفاق کے نام سے معروف تھی اور کبھی ان دونوں قوتوں کے درمیان مختلف مسائل میں اختلاف ہو جاتا جو سیاسۃ الخلاف کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مصری قوم ان دونوں قسم کی سیاستوں کے درمیان حیران و پریشان ٹامک ٹویاں مارتی رہتی تھی۔ الجریدہ نے ان حالات میں نہ خدیو حکومت کی تائید کر کے کوئی مفاد حاصل کیا اور نہ انگریزوں سے قربت حاصل کر کے کسی قسم کی حاشیہ نشینی کی۔ اس نے ان دونوں مرکزی طاقتوں کے درمیان قوم کے مفادات کی حمایت اور ترجمانی ہی کو اپنا شعار بنایا۔

الجریدہ کی رپورٹنگ کے مطابق وفاق کی سیاست کا آغاز خدیو توفیق پاشا کے دور سے ہوا۔ انگریز اس حکومت کے ساتھ ایک معاہدہ کر کے مصر میں داخل ہوئے انہوں نے مصری فوج کو معطل کر دیا، اس کی جگہ ایک چھوٹی سی فوج بنا ڈالی جس کے تمام افسر انگریز تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے ملٹری اسکولوں میں فنون جنگ کی اعلیٰ تعلیم بھی ختم کر دی۔ (۵۰) بہر حال خدیو توفیق کی وفات کے ساتھ ہی وفاق کی سیاست کا دور ختم ہوا، اس کے بعد خدیو عباس حلمی ثانی تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو انگریزوں سے اختلاف کی سیاست شروع ہوئی۔ پہلے دور کی طرح اس دور کو بھی لطفی السید نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کے ایک مقالہ کا عنوان تھا:

نتائج سیاسة الخلاف (۵۱)

(اختلاف کی سیاست کے نتائج)

اس مقالہ میں فاضل مدیر نے عباس کی تعریف کی کہ اس نے اپنے والد کی انگریزوں کے تئیں وفادارانہ سیاست ترک کر کے ایک نئے دور کا آغاز کیا، اور قوم کے اندر قومی اور وطنی شعور کی تخم ریزی شروع کی، اس کے بعد فہمی وزارت کے برطرف ہونے اور فخری وزارت قائم ہونے کا تذکرہ کیا اور ان تبدیلیوں اور اقدامات کی طرف توجہ دلائی جن کی وجہ سے اختلاف کی سیاست اختیار کرنے کی نوبت آئی۔ انہوں نے ۱۸۹۴ء میں نوبار وزارت کے قیام سے وفاقی سیاست کی جو تجدید ہوئی تھی اس پر بھی بحث کی اور بتایا کہ یہ سیاست مفادات کے باہمی تبادلہ پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس میں قوت کے سامنے سر افگندگی کو بنیاد حاصل تھی۔ عباس اور کرومر کے درمیان تعلقات پھر منقطع ہو گئے مگر جب سر گورسٹ کا دور آیا تو پھر وفاق کی سیاست کارفرما ہو گئی مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں کا عمل دخل پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ اس موقع پر استاد احمد لطفی السید نے پھر تنقید کا قلم اٹھایا اور ایک مضمون تحریر کیا جس کا عنوان تھا:

الغرض من سیاسة الوفاق (۵۲)

(وفاقی سیاست کا مقصد)

انہوں نے اس مقالہ میں تحریر کیا کہ:

> ''ہم خود اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کرتے ہیں۔ جب ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ۱۸۸۷ء سے انگریزوں نے اس ملک میں ایک ہی کام کیا ہے، وہ یہ کہ انہوں نے یقین دلایا کہ استعمار کا دور ختم ہو چکا۔ انگریزوں نے مصریوں کو یہ باور کرایا اور اس طرح اپنے انگریز آقاؤں کے اشارہ پر ان کے اولین مقصد کو اختیار کر لیا ہے اور وہ ہے خدیو حکومت کے اقتدار کو سہارا دینا''۔

"اسی طرح وفاق کی سیاست نے مصریوں کے دلوں میں ایک غیر متبدل نتیجہ چھوڑا ہے وہ یہ کہ ان کے دلوں میں یہ بات راسخ ہو گئی ہے کہ ملکی اور غیر ملکی دونوں حکومتیں ایک نمائندہ حکومت کو وسیع تر کرنا چاہتی ہیں بشرطیکہ خدیو حکومت انگریزوں کو من مانی کرنے کی کھلی چھوٹ دے دے جب کہ اختلاف کی سیاست نے بھی مصریوں کے دل ودماغ میں ایک ہی نتیجہ قائم کیا ہے جو بدل نہیں سکتا۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ملکی اور غیر ملکی دونوں حکومتیں قوم کے اختیارات میں توسیع نہیں کر سکتیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ دونوں حکومتیں مصر میں کسی قسم کی دستوری حکومت کے قیام کی اجازت نہیں دیں گی"۔

اسی لئے احمد لطفی السید نے الجریدہ کے صفحات میں "وفاق" اور "اختلاف" دونوں قسم کی سیاستوں پر بھر پور تنقید کی اور دونوں طرح کے حالات میں قومی مفادات کی ترجمانی اور وکالت کی۔ میدان سیاست میں الجریدہ کی جدوجہد کا ایک اور رخ ہے جو عام طور پر نگاہوں سے اوجھل رہ جاتا ہے اور وہ ہے مصری وزراء کو خطاب کرنا اور انہیں ان کی ذمہ داریاں یاد دلانا، چنانچہ استاد لطفی السید نے ایک مطلق العنان حکومت کے سایہ میں وزیر باتدبیر قومی مفادات کی نگہبانی کس طرح کر سکتا ہے اور قوم کی آرزوؤں اور امنگوں کی حفاظت کسطرح کر سکتا ہے اس جانب انہوں نے توجہ دلائی۔ انہوں نے وزیروں سے درخواست کی کہ جب تک مصر میں صحت مند نمائندہ حکومت قائم نہیں ہوتی اور آزاد قانون ساز ادارے وجود میں نہیں آتے انہیں ایک وزیر کی حیثیت میں یہ فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں :

"دستور قوم کو کوئی جمہوری نظام عدم سے نکال کر فراہم نہیں کر سکتا اور نہ حکومت سے مقابلہ کرنے کے لئے اسے کوئی طاقت عطا کرتا ہے، مگر دستور امت کی طاقت اور صلاحیت کو مرتب اور مدون کرتا ہے اور اسے اس کے مفادات ومصالح کی باگ ڈور عطا کرتا ہے۔ دستور افراد اور ملازمین کے دلوں میں آزادی و خود مختاری کی صفات پیدا نہیں کر سکتا مگر دستور تمام صفات کی حفاظت کرتا اور انہیں نشو ونما دیتا ہے اور ان صفات پر کسی قسم کی دست درازی کی کوئی راہ نہیں چھوڑتا۔ دستور حکومت کی نگرانی ونگہبانی کا حق تخلیق نہیں کرتا کیونکہ یہ حق قوموں اور حکومتوں کے مزاج میں فطری طور سے موجود ہے۔ مگر دستور اس حق کا اعتراف ضرور کرتا ہے اور حکومت کو اسے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جب ہم ایک تحریری دستور کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہم پورے نظام کو دستور ہی پر منحصر نہیں چھوڑ دیتے اور جب ہم پارلیمانی

نمائندوں سے محروم ہیں جو وزیروں کی جواب دہی کر سکیں تو ہم اخبارات و جرائد کے ذریعہ ان کی جواب دہی کرنے کے حق سے محروم نہیں ہیں۔ جس طرح وزارت پارلیمانی نمائندوں کے اعتماد کی مرہون ہوتی ہے اسی طرح ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ وزراء رائے عامہ کے حسن اعتماد کے کفیل ہوں، اور اس سلسلے میں اتنا کافی ہے کہ وزراء اپنی قوم کا احترام کریں اور اس کے فیصلوں کے سامنے اپنے سر جھکا دیں۔ اگر ہم اس طریق سفر کو اختیار کریں تو دستور کی منزل قریب تر ہو جائے گی اور آسانی سے ہم مراد کو پا سکیں گے"۔ (۵۳)

اس طرح وزیروں کے فرائض پر ایک اور مقالہ تحریر کیا جس کا عنوان تھا:

مسئولية الوزارة (۵۴)

(وزارت کی ذمہ داری)

اس مقالہ میں احمد لطفی السید نے اس نقطہ پر بحث کی ہے کہ کسی مطلق العنان حکومت میں وزارت اس کا اہم ترین حصہ ہوتی ہے وزیروں کی کابینہ ہی کسی قدر قومی اختیار و اقتدار کی ترجمان ہوتی ہے۔ اگر یہ وزراء راہ راست پر ہوں تو وہ بہت سے فرائض کی انجام دہی کر سکتے ہیں جو کسی ملک میں پارلیمانی اداروں پر عائد ہوتے ہیں۔ آپ نے ایک اور مقالہ اس سلسلہ میں تحریر فرمایا جس کا عنوان تھا:

الوزارة فی الشهرين (۵۵)

(دو مہینے کی وزارت)

اس مقالہ میں فاضل مصنف نے کم سے کم سات مثالیں ایسی دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیروں نے قوم کی رائے کا احترام نہیں کیا پھر انہوں نے وزیروں کو مشورہ دیا کہ پورے ملک کی پالیسی وہ اس طرح مرتب کریں جس سے ملکی مفادات حاصل ہو سکیں اور قومی امنگوں کی ترجمانی ہو سکے۔

مصطفیٰ کامل نے قومی تحریک آزادی کی پرجوش اور شعلہ بار قیادت کی اور ملک کے انقلابی عناصر کو اپنے گرد جمع کیا، مگر استاد احمد لطفی السید اس کے برعکس معتدل اور تدریجی سیاست کے علمبردار تھے۔ انہوں نے قومی اور وطنی تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور تعلیم و تربیت، ادب و ثقافت، اجتماع و معاشرت اور سیاست کے تمام میدانوں میں اپنے معروف اخبار الجریدہ کے ذریعے قوم کی رہنمائی کی۔ مصر کے ایک طبقہ نے لطفی السید اور ان کے حامیوں پر قومی تحریک سے غداری اور انگریزوں سے وفاداری کے الزامات عائد کئے، مگر پچھلے صفحات میں ان کے جن افکار و نظریات کو پیش کیا

گیا ہے ان سے یہ حقیقت الم نشرح ہو جاتی ہے کہ استعمار سے آزادی ان کا نصب العین تھا۔ وہ مصری قوم کو غلامی کی زنجیروں سے نکالنے کے لئے سر پر کفن باندھ کر میدان جنگ میں کودے تھے۔ ان کی تحریروں نے ملک کے سنجیدہ طبقے کو آزادی کے حصول پر آمادہ کیا تھا، مگر ان کا طریقۂ کار مختلف تھا۔ وہ اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ آزادی کی تحریک کو آگے دیکھنا چاہتے تھے۔ نئی نسل کی تعلیم و تربیت اور اس کے اندر قومی اسلامی شعور کی بیداری ان کا مطمح نظر تھا۔ انہوں نے اصلاح معاشرہ کی کٹھن ذمہ داری نبھائی تھی۔ مصر میں جو اخلاقی فساد اور معاشرتی بگاڑ پیدا ہو چکا تھا اس کی اصلاح کو بھی وہ ناگزیر تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک آزادی اسی وقت بامعنی اور مفید ہو سکتی تھی جب کہ قوم انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کی اہل ہو اور اس کے اندر ایک آزاد قوم کے اوصاف اور خصوصیات پیدا ہوں۔ اسی لئے تدریج کے ساتھ مسائل کے حل پر وہ زور دیتے تھے۔

استاد احمد لطفی السید کے تعلیمی، تربیتی، معاشرتی اجتماعی و سیاسی رجحانات کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے ان مخصوص نظریات کا تجزیہ بھی ضروری ہے جو ان کے قلم سے مصر کے مخصوص ماحول میں وجود میں آئے۔ انہوں نے "اسلامی جامعہ" کی جگہ "مصری جامعہ" کا نعرہ دیا۔ آزادی اور حریت پر طول طویل بحثیں کیں اور تعقل اور روشن خیالی کے حق میں دلائل کے انبار لگائے۔ ان افکار و نظریات کے مطالعہ سے اس مخصوص ماحول کی جھلک بھی سامنے آتی ہے جس میں فاضل مصنف نے ان کی ترجمانی کی۔

حواشی و تعلقیات

(۱) دکتور عبداللطیف حمزہ :ادب المقالة الصحیفة فی مصر ،ج۶،ص ۸۲۔۸۵

(۲) احمد لطفی السید : صفحات مطویة من تاریخ الحرکة الاستقلالیة فی مصر ، مصر ۱۹۴۶ء، ص ۱۸۱

(۳) نفس المصدر، ص ۱۸۲۔۱۸۳

(۴) نجیب شاہین (۱۲۸۲۔۱۳۴۵ھ / ۱۸۶۵۔مابعد ۱۹۲۷ء) مشہور ادیب اور صحافی تھے۔ صیدا میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں امریکن یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا۔ ۱۸۹۵ء میں قاہرہ کا سفر کیا اور ۱۸۹۹ء تک المقطم اور المقتطف کی ادارت میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد بیروت کی امریکن کالج میں ۱۹۱۰ء تک پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ المقطم اور الجریدہ اور اس کے بعد المقتطف جیسے جریدوں میں برابر اپنے قلم کی جولانی دکھاتے رہے۔ جنگ عظیم پر سات حصوں میں اپنی کتاب شائع کی۔ جریدہ الاخبار میں " حملة الاقلام فی مصر والشام " کے عنوان سے پندرہ قسطوں میں مسلسل اپنا مضمون شائع کیا۔ الأعلام ۸ / ۱۲

(۵) عبد الحمید بن محمد شاکر بن ابراہیم الزہراوی (۱۲۷۲۔۱۳۳۴ھ / ۱۸۵۵۔۱۹۱۶ء) شام مشہور رہنمائے سیاست ہیں۔ حمص میں ولادت ہوئی۔ عثمانی دستور سے پہلے سلطان عبدالحمید کی سیاست کی مزاحمت کی، انہوں نے المنبر کے نام سے ایک اخبار نکالا اور خفیہ اسے تقسیم کرتے رہے۔ استنبول آئے اور ترکی زبان میں اخبار "معلومات" نکالنے میں معاونت کی۔ حکومت نے تنگ آکر انہیں دمشق جلاوطن کردیا۔ مصری اخبار المقطم میں لکھنا شروع کیا۔ والئ دمشق ناظم پاشا کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہیں استنبول روانہ کردیا، بیچ میں کچھ مصالحت کی کوشش ہوئی تو حمص واپس کردیئے گئے، اس کے بعد مصر فرار ہوگئے اور دستور عثمانی کے اعلان تک صحافت میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد شام واپس آئے اور شہر حماۃ سے رکن پارلیمان منتخب ہوئے پھر استنبول کا رخ کیا اور حزب الحریۃ والاعتدال اور حزب الائتلاف کی تشکیل میں حصہ لیا، ہفت روزہ "الحضارۃ" شائع کیا۔ شام میں جب اصلاحی تحریک رونما ہوئی اور پیرس میں اولین المؤتمر العربی قائم ہوئی تو زہراوی اس کے صدر منتخب ہوئے، بعد میں عثمانی پارلیمنٹ کے رکن بنائے گئے۔ پہلی عالمی جنگ چھڑی تو گرفتار ہوئے اور دمشق میں پھانسی پر لٹکادیئے گئے۔ زہراوی شام کے معروف سیاست دانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک رسالہ الفقه والتصوف اور ایک کتاب خدیجة ام المؤمنین آپ کی تصنیفات ہیں۔ الزرکلی :

الأعلام ۳ / ۲۸۸

(۶) عبد القادر حمزہ (۱۲۹۷۔۱۳۶۰ھ / ۱۸۸۰۔۱۹۴۱ء) مؤرخ اور صحافی، مصر میں شبر خیت میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ میں مدرسۃ الحقوق میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۲ء میں وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۱۰ء میں روزنامہ الأھالی کے مدیر ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں قاہرہ سے البلاغ جاری کیا۔ مصر کی قومی تحریک آزادی کی راہ میں آزمائشوں سے دوچار ہوئے۔ مجلس الشیوخ اور المجمع اللغوی کے رکن بھی مقرر ہوئے۔ "علی ھامش التاریخ المصری القدیم" دو حصوں میں لکھی۔ انگریزی سے عربی میں دو کتابوں کا ترجمہ کیا، (۱) التاریخ السری للاحتلال البریطانوی لمصر، (۲) الصیف والنار فی السودان، مصطفیٰ کامل پاشا سے تعارف ہوا تو ان کی تحریک کے حامی ہو گئے، پھر سعد زغلول سے ملاقات ہوئی تو ایک مدت تک وفد پارٹی سے منسلک رہے۔ آپ کا انتقال قاہرہ میں ہوا۔ الزرکلی: الأعلام ۴ / ۴۴۔۴۵

(۷) محمد السباعی (۱۲۹۸۔۱۳۵۰ھ / ۱۸۸۱۔۱۹۳۱ء) مصر میں انگریزی سے عربی کے بہترین مترجم تھے، پیدائش اور وفات قاہرہ میں ہوئی۔ آپ کی تصانیف میں کارلائل کی کتاب کا ترجمہ "الأبطال"، دکنز کی کتاب کا ترجمہ "قصة المدنیتین"، اسی طرح تین حصوں میں "بلاغة الانکلیز" معروف ہیں۔ دوسرے متعدد انگریز ادیبوں اور مفکروں کی تحریروں کے ترجمے کئے۔ وفات کے بعد ان کے صاحب زادہ یوسف السباعی نے اپنے والد کی تحریروں یا ترجموں کا انتخاب "مأة قصة" کے نام سے شائع کیا۔ الزرکلی: الأعلام ۷ / ۸۰

(۸) عبد الحمید حمدی (المتوفی ۱۳۶۹ھ / ۱۹۵۰ء) مصر کے مشہور انشاء پرداز اپنے مجلۃ "السفور" کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ "الضیاء" شائع کیا جو روزنامہ تھا پھر وہ ہفت روزہ ہو گیا۔ ان کے اخبارات و جرائد بے پردگی کی دعوت دینے والے ادیبوں اور شاعروں کے لئے اپنا سینہ وا کئے ہوئے تھے اسی لئے زندگی بھر اعتراضات کا نشانہ بنے رہے۔ تقریباً نصف صدی تک میدان صحافت میں متحرک رہے۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ الزرکلی: الاعلام ۳ / ۲۸۶

(۹) ابراہیم رمزی بک (۱۲۸۸۔۱۳۴۳ھ / ۱۸۶۷۔۱۹۲۴ء) مصر کی ایک فاضل شخصیت جن کے جد امجد محمد علی کے زمانہ میں آئے۔ مصر کے شہر فیوم میں پیدا ہوئے اور وہاں سے ایک مجلّہ ہفت روزہ "الفیوم" نکالا۔ تاریخ الفیوم لکھی۔ ناول "المعتمدبن عباد" تحریر کیا۔ پیرس گئے تو وہاں ایک مہینہ قیام کیا۔ واپس ہوئے تو قاہرہ میں سکونت اختیار کرلی۔ مجلّہ "المرأة فی الاسلام" شائع کیا، پھر جریدہ "التمدن" نکالا۔ احمد لطفی السید کے اخبار "الجریدة" کی ادارت اور ترتیب و تدوین میں شریک و سہیم رہے۔ سلطان حسین کامل کے دفتر میں قلم

الترجمۃ کی صدارت پر فائز ہوئے۔ اچھے شاعر تھے۔ فرانسیسی اور ترکی دونوں زبانوں پر عبور تھا۔ قاہرہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کی تصنیفات میں "اصول الأخلاق" (فرانسیسی سے عربی میں ترجمہ) اور "مبادئ التعاون" اہم ہیں ۔الزرکلی: الأعلام ۱/۳۹

(۱۰) احمد زکی پاشا (۱۲۸۴۔۱۳۵۳ھ / ۱۸۶۷۔۱۹۳۴ء) مصر کے ادیب محقق اور عرب قومیت کے علم بردار اسکندریہ میں پیدا ہوئے اور قاہرہ کے مدرسۃ الادارۃ والحقوق سے گریجویشن کیا۔ فرانسیسی میں مہارت پیدا کی۔ اطالوی اور انگریزی زبانیں بھی سمجھتے تھے۔ حکومت کے مختلف مناصب پر فائز رہے۔ عربی کتب کی طباعت اور تحقیق پر بہت زور دیا، چنانچہ ان کی تصحیح و تحقیق کے بعد مصری حکومت نے متعدد مخطوطات کو شائع کیا۔ آپ کی لائبریری میں تقریباً دس ہزار کتابیں تھیں جو وفات کے بعد دار الکتب المصریۃ کو منتقل کر دی گئیں۔ شیخ العروبة کے لقب سے معروف تھے اور آپ کی رہائش گاہ بیت العروبة کے نام سے مشہور تھی۔ قاہرہ میں وفات ہوئی، آپ کی تصنیفات میں "السفر إلى المؤتمر"، "موسوعات العلوم العربية"، أسرار الترجمة"، "قاموس الجغرافية القديمة"، "الدنيا في باريس"، "التعليم في مصر"، "أربعة عشر يوما سعداء في خلافة الأمير عبد الرحمن الناصر"، "الرق في الاسلام"، "تاريخ المشرق" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ عربی اور فرانسیسی زبانوں میں آپ نے مختلف موضوعات پر بے شمار مقالے لکھے جو رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ الزرکلی: الأعلام ۱/۱۲۶۔۱۲۷

(۱۱) عبدالرحمٰن شکری (۱۸۸۶ء۔ وفات نامعلوم) اسکندریہ میں پیدا ہوئے۔ خاندان میں شعر و ادب کا ذوق پہلے سے موجود تھا۔ ان کے والد کے کتب خانہ میں دیوان ابن الرومی، دیوان ابن الفارض اور قصیدہ زہیر وغیرہ شعری مجموعے پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے شیخ مرصفی کی مرتب کردہ انتخاب اشعار عرب "الوصيلة الادبية، الشريف الرضي، ابو تمام، ابونواس، البارودي" وغیرہ قدیم و جدید ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ کیا۔ اپنے والد کے دوست عبداللہ الندیم کو بچپن میں دیکھا تھا قاہرہ کے مدرسہ المعلمین میں تعلیم حاصل کی۔ شاعری کو وہ تفریح طبع اور استعارات و تشبیہات کا خزینہ تصور کرتے تھے، چنانچہ یوروپ کے سفر میں انہوں نے انگریزی ادب کو گھول کر پیا اور ان کی علمی نظر بڑی وسیع ہو گئی۔ وہاں سے واپسی کے بعد تیس سال تک استاد انسپکٹر وغیرہ کے مختلف عہدوں پر تعلیم سے وابستہ رہے، حکومتی ملازمت سے استعفا دے کر ۱۹۵۰ء میں پورٹ سعید میں گوشہ گیر ہو گئے۔ ۱۹۵۵ء میں اسکندریہ چلے گئے۔ عمر ۷۰ سال کی ہو چکی تھی مگر انہوں نے شادی نہیں کی۔ آخر عمر میں فالج کا شکار ہو گئے تھے۔ جدید

شاعری کے میدان میں وہ نہایت ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ادیبوں اور محققوں نے ان کو جدید شاعری کا منفرد شاعر قرار دیا ہے۔ ان کے مختلف شعری مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ ۱۹۰۹ء میں معروف شعری مجموعہ "ضوء الفجر" کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں دوسرا حصہ، ۱۹۱۴ء میں تیسرا حصہ، ۱۹۱۶ء میں چوتھا اور پانچواں حصہ، ۱۹۱۸ء میں چھٹا حصہ اور ۱۹۱۹ء میں اس دیوان کا ساتواں حصہ بھی شائع ہو گیا۔ وہ ایک ممتاز نثر نگار بھی تھے۔ ۱۹۱۸ء میں ان کی تصنیف "الصحائف" ۱۹۱۶ء میں "الاعترافات" اور "حدیث ابلیس" اور "الثمرات" جیسی مایہ ناز کتابیں شائع ہوئیں۔ شکری نے مجلۃ "المقتطف"، "الہلال" اور "الرسالۃ" میں مستقل مضامین لکھے مگر بد قسمتی سے جدید عربی ادب میں انہیں اعلیٰ مقام حاصل نہ ہو سکا اور اپنے دوستوں المازنی اور العقاد کی بھینٹ چڑھ کر وہ مظلوم ہی رہے۔ دیکھئے انور الجندی: الکتاب المعاصرون، حوالہ بالا، ص ۹۴۔۹۸

(۱۲) عبد السلام ذہنی (۱۳۰۲۔۱۳۷۴ھ / ۱۸۸۵۔۱۹۵۵ء) ماہر علم قانون کی زندگی کا آغاز بحیثیت مدرس اسکندریہ میں ہوا۔ علوم سیاسیہ، مالیہ اور قانون مدنی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ دو مرتبہ فرانس گئے۔ ۱۹۰۹ء میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ محکمہ مصر کے رئیس اور پھر مستشار بنے تو اس میدان میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ ان کی تصانیف میں "کتاب الحیل"، "المحظور منہا والمشروع"، "مسؤولیۃ الحکومۃ" دو حصوں میں "نہضۃ القانون"، "الانظمۃ الدستوریۃ والاداریۃ"، "النظریۃ العامۃ فی الالتزامات"، "فی القانون التجاری" اور "التطور الاجتماعی والتشریعی" وغیرہ کافی مشہور ہیں۔

(۱۳) مصطفیٰ عبد الرازق (۱۳۰۲۔۱۳۶۶ھ / ۱۸۸۵۔۱۹۴۶ء) شریعت اور ادب کے موضوعات پر لکھنے والے مشہور محقق وزیر اوقاف اور پھر جامعہ ازہر کے شیخ مقرر ہوئے۔ ازہر کے فارغ التحصیل اور شیخ محمد عبدہ کے شاگرد تھے۔ پیرس اور لیون میں تعلیم کی تکمیل کی اور لیون ہی میں اسلامیات کی تدریس کے لئے آپ کا تقرر ہوا۔ ۱۹۱۶ء میں قاہرہ واپس آئے تو مجلس الازہر کے سکریٹری جنرل، شرعی عدالت کے انسپکٹر اور آرٹس کالج میں اسلامی فلسفہ کے استاد یکے بعد دیگرے مقرر ہوتے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں وزارت اوقاف ان کے حوالہ کی گئی پھر ۱۹۴۵ء میں جامع ازہر کے شیخ مقرر ہوئے اور وفات تک اسی منصب پر مامور رہے۔ سنجیدہ مزاجی، خاکساری اور دھیمی طبیعت آپ کا خاص ساتھی ہے مگر فکر نہایت واضح اور روشن تھی۔ آپ کے مطبوعات میں "تمہید لتاریخ الفلسفۃ الاسلامیۃ"، "فیلسوف العرب والمعلم الثانی" (کندی اور فارابی کی سوانح) "الدین والوحی والاسلام" وغیرہ بڑی مشہور ہوئیں۔ الزرکلی: الاعلام ۷ / ۲۳۱

(۱۴)ڈاکٹر محمد حسین ہیکل (۱۳۰۵۔۱۳۷۶ھ / ۱۸۸۸۔۱۹۵۶ء) مصر کے معروف صحافی انشاء پرداز اور سیاست داں تھے۔ کفر غنام گاؤں میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۹ء میں قاہرہ کے مدرسۃ الحقوق سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۱۲ء میں ساربون یونیورسٹی فرانس سے قانون میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ الجریدہ میں کافی مقالات لکھے۔ ۱۹۲۲ء میں اخبار السیاسۃ الیومیۃ کے چیف ایڈیٹر ہوئے پھر یہ اخبار ہفت روزہ ہو گیا۔ مصری یونیورسٹی میں سول لاء کی تدریس کی۔ سعد زغلول کی پارٹی الحزب الدستوری کے رکن تھے۔ دوبار وزیر معارف بنے۔ ۱۹۴۵۔۱۹۵۰ء کے عرصہ میں مجلس الشیوخ کے صدر رہے۔ سب سے پہلے مجلۃ "الفضیلۃ" نکالا، مختلف کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "حیاۃ محمد"، "فی منزل الوحی"، "ثورۃ الادب"، "الصدیق ابوبکر"، "الفاروق عمر"، "ولدی"، "جان جاک روسو" کافی مشہور ہیں۔ تین ناولیں "زینب"، "ابیس" اور "ھکذا خلقت" بھی لکھیں۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ الزرکلی: الاعلام ۶ / ۱۰۷

(۱۵) توفیق دیاب جدید مکتبۂ فکر کے ان ممتاز ادیبوں میں سے ہیں جن کا ظہور ۱۹۱۹ء کے انقلاب کے بعد ہوا۔ ان کا شمار مصر کے رومانوی ادب کی نمائندہ شخصیات میں ہوتا ہے مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر فن خطابت سے فن مقالہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور یونیورسٹی کی فضا کو خیرباد کہہ کر صحافت میں نام پیدا کیا، مگر اپنے اسلوب بیان اور ادبی طرز نگارش کو ترک نہ کیا۔ فکر و خیال میں گہرائی، خفیف طنز اور اظہار میں ندرت کے عناصر ملتے ہیں۔ وہ پہلے مصری ادیب ہیں جنہوں نے مغرب میں فن خطابت کا درس دیا۔ ۱۹۱۷ء میں انگلینڈ سے واپس آئے تو فن خطابت پر لکچر دینا شروع کیا۔ جریدہ السیاسۃ میں "نظرات" اور اخبار الأہرام میں "لمحات" میں مستقل کالم لکھے۔ ۱۹۲۸ء میں یونیورسٹی سے استعفاء دے دیا اور صحافت کے لئے یکسو ہو گئے اس کے بعد آٹھ سال تک قلمی جہاد کرتے رہے، ۱۹۳۳ء میں انہیں ۹ ماہ کے لئے جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ زندگی میں کبھی قلم نہیں پکڑا بلکہ ان کی ساری تحریریں املاء کردہ ہیں۔ ان کی بعض تحریریں ایسی ہیں جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہیں جیسے وہ کہتے ہیں: "زندگی نے مجھے سکھایا کہ نتائج سے نہیں بلکہ وسائل سے کامیابی کا موازنہ کرو..... تجربہ نے مجھے بتایا کہ انسانوں کی قدر و قیمت ان کے افکار کی روشنی میں متعین کروں اور ان کے خزانوں اور مقبوضات کو خاطر میں نہ لاؤں .....زندگی نے مجھے درس دیا کہ میں انسانوں کے اندر ان کی اصل اور جڑ تلاش کروں جس کا تعلق خزف سے ہو، اس کی قیمت میں خزف ریزہ کے برابر لگاؤں .....زندگی نے مجھے تعلیم دی کہ جاہ و منصب والوں کو اونچی کرسی اور دائرہ اثر کی میزان میں نہ تولو بلکہ ان کی بلند ہمتی اور وسعت نظر کو میزان میں رکھوں۔ دیکھئے انور الجندی، الکتاب المعاصرون، مطبعۃ الرسالۃ قاہرہ، ص ۸۴۔۸۸

(۱۶)عباس محمود العقاد (۱۳۰۶۔ ۱۳۸۳ھ / ۱۸۸۹۔ ۱۹۶۴ء) مصر کے معروف اسلامی ادیب مصنف اور انشاء پرداز تھے۔ اسوان میں پیدا ہوئے، اور ابتدائی تعلیم وہیں کے مدرسہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد حصول رزق میں لگ گئے۔ ریلوے میں، وزارۃ الاوقاف میں اور اس کے بعد بعض مقامی اسکولوں میں ملازمت کرتے رہے، لیکن بعد میں تصنیف و تالیف کے لئے یکسو ہو گئے۔ نوجوانی میں انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی پھر جرمن اور فرانسیسی زبانوں سے بھی واقفیت بہم پہنچائی نصف صدی تک تصنیف و تالیف کی دنیا میں نیر تاباں بن کر چمکتے رہے۔ نہایت اعلی درجہ کا ادب تخلیق کیا۔ تقریبا ۸۳ کتابیں لکھیں جن میں " عن الله " ، "عبقرية محمد " ، "عبقرية خالد " ، "عبقرية عمر " ، "عبقرية على " ، "عبقرية الصديق" ، "رجعة أبى العلاء " ، "الفصول" ، "مراجعات فى الادب والفنون " ، "ساعات بين الكتب " ، "ابن الرومى" ، "ابونواس " ، " سارة " ، "سعد زغلول" ، "المرأة فى القرآن" ، "هتلر" ، "إبليس" ، "مجمع الأحياء"، "الصديقة بنت الصديق" ، "عرائس وشياطين" ، "مايقال عن الاسلام" وغیرہ بہت معروف ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ "دیوان العقاد" بھی شائع ہو چکا ہے وہ دمشق قاہرہ اور بغداد تینوں کی مجمع اللغۃ العربیۃ کے رکن تھے قاہرہ میں وفات ہوئی اور اسوان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ الزرکلی: الأعلام ۳ / ۲۶۶۔ ۲۶۷

(۱۷)حافظ ابراہیم (۱۲۸۷۔ ۱۳۵۱ھ / ۱۸۷۱۔ ۱۹۳۲ء) مصر کے وطن پرست شاعر تھے۔ آپ کا پورا نام محمد حافظ بن ابراہم فہمی تھا۔ دریائے نیل کی آبادی ذہیہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ یتیمی کی حالت میں تعلیم و تربیت پائی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد طنطا اور قاہرہ میں وکالت کا پیشہ اختیار کر لیا، پھر ملیٹری اسکول سے منسلک ہوئے اور مصر کی خفیہ پولس کے ساتھ مل کر جنگ آزادی میں شرکت کے لئے ایک خفیہ انجمن کی تاسیس کی، اس سازش کا پردہ چاک ہونے پر انگریزوں نے ان کے تمام ارکان پر کیس دائر کر دیا۔ بعد میں محکمۂ پولس سے بھی وابستہ ہوئے اور پھر یہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ رزق کی تلاش میں اخبار "الاہرام" سے وابستگی اختیار کی اور شاعر النیل کے لقب سے معروف ہوئے۔ ان کی نثر نگاری اور اشعار کی شہرت مصر کے باہر تک پہنچی۔ مصطفیٰ کامل کی تحریک آزادی کا بھرپور تعاون کیا۔ ۱۹۱۱ء میں دار الکتب المصریۃ کے شعبۂ ادب کے صدر منتخب ہوئے اور وفات تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ آپ کے اشعار کا مجموعہ دیوان حافظ دو جلدوں میں طبع ہو چکا ہے۔ ادب، تاریخ اور عصری مسائل پر متعدد کتابوں کی تالیف کی۔ فرانسیسی سے عربی میں بھی متعدد ترجمے کئے۔ الزرکلی: الاعلام ۶ / ۷۶

(۱۸) مصطفیٰ صادق الرافعی (۱۲۹۸۔ ۱۳۵۶ھ / ۱۸۸۱۔ ۱۹۳۷ء) دور جدید کے مایہ ناز اسلامی ادیب اور

شاعر اصلاً شامی طرابلس سے تعلق رکھتے تھے۔ وفات مصر کے علاقہ طنطا میں ہوئی۔ آخر میں وہ بہرہ ہو گئے تھے اور مخاطب کو اپنی بات سنانے کے لئے کاغذ اور قلم کا استعمال کرنا پڑتا تھا۔ اول درجہ کے نثر نگار تھے۔ صاحب طرز ادیب تسلیم کئے جاتے ہیں، خاص طور سے "اعجاز القرآن والبلاغة النبوية" نے آپ کو بین الاقوامی شہرت عطا کی۔ آپ کا شعری مجموعہ تین حصوں میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی دوسری تصانیف میں "تاريخ آداب العرب" (دو حصے)، "تحت راية القرآن"، "رد على العقاد"، "وحي القلم" (تین حصے)، "ديوان النظرات"، "حديث القمر"، "المعركة" (طہ حسین کی بدنام زمانہ کتاب فی الشعر الجاہلی پر اسلامی تنقید) وغیرہ معروف ہیں۔ محمود ابوریہ نے "رسائل الرافعي" میں ادب، سیاست اور مردان سیاست کے بارے میں ان کی ذاتی تحریروں اور رایوں کو جمع کر دیا ہے۔ الزرکلی: الاعلام ۷ / ۲۳۵

(۱۹) اسماعیل صبری (۱۲۷۰۔۱۳۴۱ھ / ۱۸۵۴۔۱۹۲۳ء) اپنے دور کے مشہور و ممتاز شاعر تھے۔ اسلوب کی ندرت اور شعری رعنائی کی وجہ سے ممتاز تھے۔ قاہرہ میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد فرانس میں لاء کی ڈگری حاصل کی۔ مصری عدالتوں میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ تواضع اور خاکساری اور شرم و حیا ان کی امتیازی صفات تھیں۔ اخباروں اور کتابوں کے حاشیوں پر اپنے اشعار لکھ دیا کرتے تھے۔ اکثر اپنے قصیدے خود ہی لکھ کر پھاڑ دیا کرتے تھے۔ باضمیر ادیب تھے۔ لارڈ کرومر نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو راضی نہ ہوئے۔ لوگوں نے کہا کہ وہ آپ کو وزیر اعظم بنانا چاہتا ہے ان کا جواب تھا کہ میں اپنے ضمیر کا سودا کر کے وزیر اعظم نہیں بن سکتا۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ آپ کا شعری دیوان شائع ہو چکا ہے۔ الزرکلی: الاعلام ۱ / ۳۱۵

(۲۰) عبد الحلیم المصری (۱۳۰۴۔۱۳۴۱ھ / ۱۸۸۷۔۱۹۲۲ء) مصر کے نوخیز شاعر دمنہور کے گاؤں فیشا میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ عسکریہ سے وابستہ ہوئے۔ سوڈان میں ملازمت کی اور مستعفی ہوئے۔ زندگی کے آخری ایام میں احمد فؤاد سے قربت نصیب ہوئی۔ قاہرہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کا شعری مجموعہ تین چھوٹے حصوں میں طبع ہو چکا ہے۔ دو حصوں میں آپ کی تصنیف "الرحلة السلطانية" موجود ہے۔ الزرکلی: الاعلام ۳ / ۲۲۔۲۳

(۲۱) نقولا حداد (۱۲۸۹۔۱۳۷۳ھ / ۱۸۷۲۔۱۹۵۴ء) معاشرتی اور سماجی ناول نگار ہیں۔ صحافت سے بھی دلچسپی رہی۔ پیشہ کے اعتبار سے وہ مشہور کیمسٹ تھے جس کی تعلیم انہوں نے بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے حاصل کی تھی۔ پہلے صیدا سے جریدہ "المحبة" نکالا، پھر بیروت سے "الحكمة" جاری کیا۔ مصر کا سفر کیا اور وہاں سے ۱۹۰۷ء میں نیویارک گئے، وہاں سے واپس آکر "الأهرام"، "المحروسة"، "الرائد المصري" جیسے جرائد کی

ادارت میں کام کیا۔ قاہرہ سے ایک جریدہ "صیدلیة" بھی شائع کیا۔ اپنی بیوی روز انطون حداد کے ساتھ مل کر ۱۹۲۱ء میں مجلة "السیّدات" شائع کیا پھر اسی کا نام بدل کر "مجلة السیّدات والرجال" رکھ دیا۔ یہ تقریباً ربع صدی تک شائع ہوتا رہا۔ وفات سے کچھ پہلے مجلة "المقتطف" کی ادارت کی ذمہ داری بھی نبھائی۔ انگریزی سے ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ داستان گوئی اور علمی تصنیفات و تراجم کی تعداد تقریباً ساٹھ ہے۔ الزرکلی: الاعلام ۸/۴۵۔۴۶

(۲۲) رشید مصوبع (متوفی مابعد ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء) لبنانی شاعر ہیں جن کی شہرت مغرب میں بھی ہوئی۔ مصر میں ایک زمانہ تک قیام کیا پھر پیرس کا سفر کیا، وہاں سے واپسی کے بعد المغرب میں مستقل سکونت اختیار کی اور الدار البیضاء میں انتقال ہوا۔ آپ کے متعدد دیوان شائع ہو چکے ہیں جیسے "دیوان الأثر"، "دیوان غصن النقا"، "دیوان النخبة" اور "سحر البیان"۔ الزرکلی: الاعلام ۳/۲۲۔۲۳

(۲۳) نقولا رزق اللہ (۱۲۸۷۔ ۱۳۳۳ھ / ۱۸۷۰۔ ۱۹۱۵ء) ناول نگار اور ایک مترجم تھے۔ جریدہ "الاھرام" کے لکھنے والوں میں سے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں مجلة "الروایات الجدیدة" نکالا۔ مختلف ناولوں کے ترجمے کئے۔ الزرکلی: الاعلام ۸/۴۶۔

(۲۴) الجریدة، ۲۸/ ستمبر ۱۹۱۲ء، شمارہ ۱۶۸۷

(۲۵) الجریدة، ۹/ فروری ۱۹۰۸ء

(۲۶) الجریدة، ۳/ مارچ ۱۹۰۹ء

(۲۷) الجریدة، ۲۳/ نومبر ۱۹۰۸ء

(۲۸) الجریدة، ۳۰/ جولائی ۱۹۱۴ء

(۲۹) الجریدة، ۹/ جولائی ۱۹۰۸ء

(۳۰) الجریدة، ۲۱/ جنوری ۱۹۰۹ء

(۳۱) الجریدة، ۱۴/ اپریل ۱۹۱۲ء

(۳۲) الجریدة، ۳/ نومبر ۱۹۰۸ء

(۳۳) الجریدة، ۲۴/ دسمبر ۱۹۱۳ء

(۳۴) الجریدة، ۸/ فروری ۱۹۱۱ء

(۳۵) الجریدۃ ، یکم فروری ۱۹۰۸ء

(۳۶) الجریدۃ ، ۳۰/دسمبر ۱۹۱۱ء

(۳۷)الجریدۃ ، یکم دسمبر ۱۹۰۹ء

(۳۸) الجریدۃ ، ۲۵۔۲۶/اپریل ۱۹۰۸ء

(۳۹) الجریدۃ ، ۱۱/جون ۱۹۰۸ء

(۴۰) الجریدۃ ، ۱۳/جون ۱۹۰۸ء

(۴۱) الجریدۃ ، ۲۶/نومبر ۱۹۰۸ء

(۴۲) الجریدۃ ، ۱۴/مارچ ۱۹۰۹ء

(۴۳) نفس مصدر

(۴۴) الجریدۃ ، ۲۳/فروری ۱۹۰۹ء

(۴۵) احمد لطفی السید : صفحات مطویۃ، حوالہ بالا، ص ۴۴

(۴۶) نفس مصدر، ص ۴۵

(۴۷) الجریدۃ ، شمارہ نمبر ۴۵۴، ۲/ستمبر ۱۹۰۸ء

(۴۸) احمد لطفی السید : صفحات مطویۃ، حوالہ بالا، ص ۱۹۵

(۴۹) نفس مصدر، ص ۱۹۷

(۵۰) لطفی السید : المذکرات، مجلۃ المصور، ۲۲/ستمبر ۱۹۵۰ء

(۵۱)الجریدۃ ، ۵/جولائی، ۱۹۰۸ء

(۵۲) الجریدۃ ، ۳/جولائی ۱۹۰۸ء

(۵۳) الجریدۃ ، ۳۰/اگست ۱۹۰۸ء،بعنوان (علینا و علی الوزراء)

(۵۴) الجریدۃ ، ۱۲/نومبر ۱۹۰۸ء

(۵۵) الجریدۃ ، ۱۸/جنوری ۱۹۰۹ء

باب چہارم

افکار و نظریات

جامعہ مصریہ کا تصور
عالم عرب میں آزادی کا مسئلہ
نظریۂ عقلیت

جامعہ مصریہ کا تصور

مصر اور عالم عرب میں جن افکار و نظریات کے تئیں حمایت اور مخالفت پر معرکہ آرائیں ہوئیں اور جن پر عربی زبان میں تحریروں کے انبار لگ گئے ان میں ایک اہم نظریہ "اسلامی جامعہ" یعنی Pan Islamism کا ہے، اس نظریہ کی دور جدید میں بنیاد سید جمال الدین افغانی (۱) (۱۸۳۸ء۔۱۸۹۷ء) نے رکھی، ان کے بعد مصر میں جن شاعروں نے اس نظریہ کی حمایت اور ترجمانی کی ان میں شیخ علی عبدالنصر، عبداللہ فکری، احمد شوقی، حافظ ابراہیم، اسماعیل صبری اور احمد نسیم وغیرہ کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ اس نظریہ کی توضیح و تشریح کرنے والے ادیبوں صحافیوں اور مصنفوں میں عبداللہ الندیم، ابراہیم المویلحی، السید توفیق البکری (۲)، السید یوسف، سلیم تقلا (۳)، ولی الدین یکن (۴)، جرجی زیدان (۵) اور رشید رضا بڑے معروف نام ہیں۔

جمال الدین افغانی نے اتحاد عالم اسلامی کی جو تحریک برپا کی اس کا مقصد تمام اسلامی حکومتوں کو ایک خلافت کے جھنڈا تلے متحد و منظم کرنا تھا تاکہ وہ غیر ملکی تسلط سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ العروۃ الوثقی میں "اتحاد اسلامی" کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

> "مسلمان کبھی ایک پر جلال سلطنت کے ماتحت متحد تھے، چنانچہ فلسفہ اور علم و فضل میں ان کے کارنامے آج تک تمام مسلمانان عالم کے لئے باعث فخر ہیں، مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان تمام ممالک میں جو کبھی اسلامی رہ چکے ہیں، اسلامی حکومت کے قیام اور استقلال کے لئے مل کر کوشش کریں، انہیں کسی حالت میں بھی ان طاقتوں سے اسلامی ممالک پر حصول اقتدار کے لئے کوشاں ہیں اس وقت تک مصالحانہ رویہ اختیار کرنا مطلق جائز نہیں جب تک کہ وہ ممالک بلا شرکت غیر کاملاً مسلمانوں کے قبضے میں نہ آجائیں۔
>
> وہ سیاسی رشتہ جس نے مسلمانوں کو باہم جکڑ رکھا تھا اس وقت ہی سے ڈھیلا پڑنا شروع ہو گیا تھا جب سے عباسی خلفاء صرف نام کی خلافت پر قانع ہو گئے تھے، وہ علم اور مذہبی معاملات اور اجتہاد (آزادی رائے) سے بے بہرہ ہو گئے تھے"۔

اس جگہ اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ جمال الدین افغانی حب دین کو حب وطن کی جگہ دلوانا نہیں چاہتے تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی ممالک خود مختارانہ اور آزادانہ طور پر اپنے مشترکہ مقصد یعنی آزادی کے حصول کے لئے

کوشش کریں اور اس کوشش میں وہ اتحادیوں کی طرح ایک دوسرے کی مدد کریں، ترکی، ایران، برصغیر پاک و ہند اور مصر میں زندگی کی روح پھونکنے کے لئے انہوں نے اسلام کے احیاء کی کوشش کی، کیونکہ اسلام ہی نے مختلف اسلامی ممالک کی سیاسی اور معاشرتی زندگی پر نہایت گہرا اثر ڈالا تھا، بہر حال حب وطن جمال الدین افغانی کے نزدیک انسان کا ایک فطری جذبہ ہے، العروۃ الوثقی میں اس جذبے کی ضرورت واہمیت پر کئی موقعوں پر بحث کی گئی ہے۔

افغانی کا خیال یہ تھا کہ مغربی اقوام مشرقی ثقافت کی نشوونما روکنے بلکہ اس کے استیصال کے لئے مشرق میں جذبۂ حب وطن کو دبانے کے لئے قومی تعلیم کا گلہ گھونٹتی ہیں اور مشرقی ثقافت کے استیصال کے لئے عجیب و غریب طریقے اختیار کرتی ہیں، تقریباً انہی کے الفاظ میں ان طریقوں سے وہ مشرقی اقوام کو یہ بات باور کرانے پر آمادہ کرتی ہیں کہ ان کا وطن تمام خوبیوں اور کمالات سے عاری ہے، وہ انہیں ترغیب دلاتی ہیں کہ عربی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں میں کوئی قابل ذکر ادب موجود نہیں اور ان کی تاریخ میں عظمت و شان کا ایک واقعہ بھی موجود نہیں۔ وہ انہیں یہ یقین دلانا چاہتی ہیں کہ ایک مشرقی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی زبان کو سمجھنے سے منھ موڑ لے اور اس بات پر فخر کرے کہ وہ اپنی زبان میں اظہار خیال کی قدرت نہیں رکھتا اور انسانی ثقافت میں جو کچھ حاصل کر سکتا ہے وہ اس ملغوبے میں مضمر ہے جو اس نے اغیار سے حاصل کیا ہے۔

انہوں نے اہل مشرق کو یہ بتایا کہ جن لوگوں کی اپنی زبان نہ ہو ان میں قومیت کا صحیح تصور نہیں پیدا ہو سکتا، اور جس قوم کا اپنا ادبی سرمایہ نہ ہو اس کی زبان بھی نہیں ہوتی؛ نیز جس قوم کی اپنی تاریخ نہیں اس کی دنیا میں کوئی عزت نہیں ہو سکتی، اور جو لوگ اپنے وطن کے ورثے کو حاصل نہیں کر سکتے یا اپنے بزرگوں کے کارناموں کی قدر نہیں کر سکتے ان کی کوئی تاریخ نہیں ہو سکتی۔ (۶)

اتحاد اسلامی کی یہ دعوت مفتی محمد عبدہ اور رشید رضا سے آگے بڑھ کر عالم عرب اور عالم اسلام کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد میں مقبول ہوئی، مصر کے باہر کے قلم کاروں اور صحافیوں نے بھی اس کی ترویج واشاعت میں بھرپور حصہ لیا، چنانچہ فرح انطون (۷) نے ۱۸۹۷ء میں الجامعة العثمانية کے نام سے اسکندریہ سے ایک مجلّہ نکالا پھر فارس الشدیاق (۸)، شیخ ناصف الیازجی (۹) اور عبدالحمید الرافعی وغیرہ نے اس نظریہ کی علم برداری کی (۱۰)۔ مصر میں اس کے ایک نمایاں علم بردار مشہور قومی رہنما مصطفیٰ کامل بھی تھے، انہوں نے اپنی مشہور کتاب المسألة الشرقية میں خلافت عثمانی کی حمایت اور تائید میں دلائل دیئے یہ کتاب پہلی بار ۱۸۹۳ء میں شائع ہوئی کتاب کی مقبولیت بڑھی تو تین سال کے بعد ۱۸۹۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ وہ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

"تمام مصنفین اور سیاستداں اس مسئلے پر متفق ہیں کہ مشرقی مسئلہ یہ ہے کہ یوروپی ممالک اور سلطنت علیا کے درمیان کشمکش موجود ہے گویا یوروپ میں خود دولت علیا کا اصل مسئلہ مشرق ہے، مشرق و مغرب کے کچھ دوسرے مصنف کہتے ہیں کہ مشرقی مسئلہ اسلام اور نصرانیت کے درمیان جاری کشمکش ہے یعنی صلیبی جنگوں کا مسئلہ جس نے اسلام کو مستحکم کرنے والی مملکت اور عیسائی حکومتوں کے درمیان خلیج پیدا کردی ہے"۔(۱۱)

مصطفیٰ کامل سلطان عبدالحمید کی تعریف و توصیف اور ان کی تعظیم و تکریم اس طرح کرتے ہیں :

"وہ عظیم ترین سلطان جو آل عثمان کے تخت پر رونق افروز ہوا اور جس نے تمام مداخلت کاروں کی ناپاک کوششوں کو ناکام بنانے کے لئے اور مملکت سے ان کے وجود کو پاک کرنے کے لئے انتھک محنت کی وہ موجودہ سلطان کی ذات بابرکات ہے، ۱۸۷۷ء کی جنگ ہی سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ مداخلت کار ہی مملکت میں تمام مصیبتوں کی جڑ اور تمام آفتوں کی بنیاد ہیں چنانچہ آپ نے اپنی اعلیٰ حکمت کے ذریعہ ان کی قوتوں کو پارہ پارہ کردیا اور ایسے مردان کار کی تربیت کی جو مملکت کی شان اونچی کرسکیں اور اس کے مقام و مرتبہ میں اضافہ کرسکیں"۔(۱۲)

وہ عثمانی سلطنت کی حفاظت اور ترقی اور اسلامی اقوام کے دوران اس کے اثر و رسوخ کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں :

"حقیقت یہ ہے کہ دولت علیا کا باقی رہنا انسان کے لئے ضروری ہے اور اس کی بقاء میں مغربی اور مشرقی اقوام کی سلامتی مضمر ہے، ارباب سیاست اور مصنفین کی اکثریت یہ محسوس کرتی ہے کہ دولت علیا کی بقاء عام توازن کے لئے ضروری ہے اور اس کے زوال سے عظیم ترین خطرات پیدا ہوں گے اور آگ کی وہ لپٹیں اٹھیں گی جو مشرق و مغرب کو خاکستر کردیں گی اسلام کے نام پر قائم اس مملکت کا انہدام مسلمانوں میں خون ریز جنگوں اور باغیانہ انقلابات کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوگا جن کے سامنے صلیبی جنگیں طفلانہ جھگڑوں سے زیادہ اہمیت نہ رکھیں گی"۔(۱۳)

مصطفیٰ کامل خلافت عثمانی کے سکونت کے لئے انگریزوں کی سازشوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

"انگریز اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ مصر پر ان کا قبضہ سلطنت عثمانیہ سے ان کی عداوت کی ایک بڑی وجہ رہی ہے اور عثمانی سلطنت کسی صورت میں بھی مصر پر انگریزوں کے قبضہ

سے اتفاق نہیں کرے گی اسی لئے انگریزوں کی یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ عثمانی سلطنت کی بقا ان کے راستے میں ایک دائمی رکاوٹ ہے اور مصر پر ان کے قبضہ کی راہ میں تمام مشکلات و مصائب کی جڑ ہے اور مصر میں اگر باقی رہنا ہے اور وادیٔ نیل کو اپنے تصرف میں رکھنا ہے تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ عثمانی سلطنت کو زمیں بوس کر دیا جائے اور اسلامی خلافت کی باگ ڈور ایسے افراد کے ہاتھوں میں آجائے جو انگریزوں کے آلۂ کار ہوں اسی لئے برطانوی سیاست دانوں نے عربی خلافت کا سوشہ چھوڑا تاکہ عرب انگریزوں کی طرف مائل ہوں اور عثمانی ترکوں کے خلاف بغاوت کر دیں..... موجودہ سلطان کے خلاف انگریزوں کے غیظ و غضب کی ایک مخصوص وجہ ہے وہ یہ کہ سلطان معظم اسلامی خلافت کے پرچم تلے تمام مسلمانوں کو متحد دیکھنے کے شدید آرزو مند ہیں یہی وجہ ہے کہ قارئین سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ان چند گنے چنے افراد میں انگریز کیوں دلچسپی لے رہے ہیں جو سلطان معظم کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور انگریز ان کی مکمل پشت پناہی کر رہے ہیں"۔(۱۴)

مصطفیٰ کامل کی اس کتاب کی پہلی فصل کا خاتمہ عثمانی جھنڈے کے نیچے تمام مسلمانوں کو جمع کرنے کی دعوت پر ہوتا ہے:

"خلافت عثمانیہ کے خلاف انگریزوں کی دشمنی کے سلسلہ میں تمام عثمانیوں اور مسلمانوں پر جو فرض عائد ہوتا ہے وہ بالکل واضح ہے اس کا انکار وہی کر سکتے ہیں جو غدار ہوں یا خارجی عناصر سے ان کا تعلق ہو یا مداخلت کاروں کی صف میں وہ شامل ہوں، عثمانیوں کا فریضہ یہ ہے کہ سب سلطنت کے پرچم تلے مجتمع ہو جائیں، اپنے سلطان کا دفاع کریں خواہ اس عظیم مقصد کی راہ میں بہت سے قربان ہو جائیں تاکہ غلامی کی زندگی سے بچ کر حکومت کر سکیں۔ مسلمانوں کا فریضہ یہ ہے کہ سب اسلامی خلافت کے جھنڈے تلے اکھٹا ہو جائیں اور اپنی جانوں اور مالوں سے اسے مستحکم بنائیں، سلطنت کی حفاظت ہی میں ان کی بھی سلامتی اور شرف و کرامت مضمر ہے اور سلطنت کی شان و شوکت ہی میں ان کی بھی شان و شوکت اور عقیدۂ اسلامی کی بھی شوکت و رفعت پنہاں ہے"۔(۱۵)

عبداللہ الندیم نے مجلۃ الاستاد ۱۸۹۳ء میں ایک طویل مقالہ شائع کیا:

لوکنتم مثلنا لفعلتم فعلتنا

اس مقالہ میں وہ خلافت عثمانیہ کی تائید و حمایت کرتے ہیں لکھتے ہیں کہ :

"اگر عثمانی سلطنت عیسائیت کی علم بردار ہوتی تو چھوٹی بڑی تمام مملکتوں کے درمیان وہ دائمی زندگی کی مستحق قرار پاتی مگر معاملہ برعکس ہے یوروپ نے دین اسلام کے خاتمہ کے لئے ہر ممکن جدوجہد کر رکھی ہے اور مملکت عثمانیہ کے بہت سے سیدھے سادھے لوگ جو یوروپ کا نام سن کر کانپ اٹھتے ہیں عثمانی سلطنت کی مذمت کرتے ہیں، اس کی عاجزی و درماندگی کی تصویر کشی کرتے ہیں اور اس کی بے بصیرتی اور بد انتظامی پر تنقید کرتے ہیں اور اس کے احکام کو سنگ دلی سے تعبیر کرتے ہیں، اگر یہ انصاف سے کام لیں تو انہیں ماننا پڑے گا کہ یہ سب سے مستحکم حکومت، سب سے دور اندیش سلطنت اور باعظیمت اقتدار ہے یوروپ کی سرکش موجیں اسی پر چڑھائی کرتی ہیں کیونکہ امریکی ملکوں کے علاوہ اٹھارہ عیسائی حکومتوں کے درمیان یہ واحد اسلامی حکومت ہے جس کے پرچم تلے تمام طبقات قومیتیں اور مذاہب پھل پھول رہے ہیں اور جس کی سرپرستی میں بہت سی زبانیں پروان چڑھ رہی ہیں، فتنے یوروپ سے اٹھ رہے ہیں یا ان افراد کی جانب سے جو قومیت یا مذہب میں ان سے قریب تر ہیں، ہر ملک اپنی سرحدوں کی حفاظت یا اپنے مذہب کے تحفظ کے نام پر کسی نہ کسی قطعہ ارضی پر نظریں لگائے ہوئے ہے جبکہ نقل و حمل کے لئے ریلوے لائن کا وجود نہیں ہے اور اس کی زیادہ تر زمینیں ندیوں اور نہروں سے محروم ہیں یہ مملکت بس باران رحمت کے سہارے ہے بارش ہوگئی تو خوشحالی آگئی اور پانی نہیں برسا تو قحط آگیا اس طرح کی آزمائشیں کہیں اور ہوتیں تو یوروپ کی بڑی سے بڑی حکومت بھی ایک دو سال سے زیادہ ان آندھیوں کا مقابلہ نہ کر سکتی اور آخر میں ختم ہو جاتی"۔(۱۶)

دور جدید کے نثر نگار ہی نہیں شعرائے کرام نے بھی اپنے مختلف میلانات و رجحانات کے باوجود ترک خلیفہ کی مدح و ستائش کی۔ مسلمانوں پر اس کے احسان اور اعلائے کلمۃ اللہ کے اس کے جذبہ کو سراہا، شعراء کی اکثریت اس فکر کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے کہ خلیفہ تمام مسلمانوں کے مفادات کا حامل ہے، اس کی جنگ اسلام کی جنگ ہے، اس سے محبت و وفاداری اسلام سے محبت و وفاداری اور اس سے دشمنی اسلام سے دشمنی ہے یہ سارے شعراء خلافت کے جھنڈے تلے مسلمانوں کو متحد ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور انتشار و اختلاف سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں مثال کے طور پر شوقی کہتے ہیں :

رضى المسلمون والإسلام فرع عثمان دم فداك الدوام
إيه عبد الحميد جل زمان أنت فيه خليفة و إمام
عمر انت بيد أنک ظل للبرايا وعصمة وسلام
ما تتوجت بالخلافة حتى توج البائسون و الأيام
و لأنت الذى رعيّته الاسد ومسرى ظلالها الاجام
امة الترك والعراق وأهلو ه ولبنان والربى والخيام
عالم لم يكن لينظم لولا انک السلم وسطه والوئام (۱۷)

حافظ ابراہیم ۱۹۰۶ء میں سلطنت عثمانیہ کی تاسیس کے جشن زریں پر ایک پورا قصیدہ کہتے ہیں اور ترک خلیفہ کی حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں :

لقد مكن الرحمن فى الأرض دولة لعثمان لا تعفو ولا تتشعب
بناها فظنتها الدرارى منزلا لبدر الدجى تبنى و للسعد تنصب
وقام رجال بالإمامة بعده فزادوا على ذاك البناء وطنّبوا
وردوا على الإسلام عهد شبابه ومدوا له جاها يرجى و يرهب
اسود على البسفور تحمى عرينها وترعى نيام الشرق والغرب يرقب(۱۸

محرم آل عثمان کی تعریف میں اور خلافت اسلامیہ کی تائید میں قصیدہ خواں ہیں :

ياآل عثمان من ترك و من عرب و أى شعب يساوى الترك والعربا
...صونوا الهلال و زيدوا مجده علما لا مجد من بعده إن ضاع أو ذهبا
أبو الخلائف ذو النورين مورثنا ملک الهلال وهذا المجد والحسبا
يا تاج عثمان إن اليوم موعدنا فجدر العهد والق الحب والرغبا
لوضاع عهدك أو حام الرجاء بنا على سواك لقينا الحَيْن والعطيا (۱۹)

ایک دوسرے مقام پر وہ کہتے ہیں :

لولا بنو عثمان والسَّنن الذى شرعوا لما وضح السبيل الأقوم
سطعوا بآفاق الخلافة فانجلى عنها من الحدثان ليل مظلم

فهمو ولاة أمورها وكفاتها وهمو حماة ثغورها و همو همو
تعتز آنا بالسلام و تارة بالحرب يزخر فى نواحيها الدم
فبتلك يكفى تلك ذا شحنائه ويصان من كيد الخصوم ويعصم (۲۰)

وہ آگے کہتے ہیں

إنا بنو عثمان أعلام الورى والأرض تشرف فوقها الأعلام
إنا السنام إذا الأنام تفاخرت والناس فيهم منسم وسنام
إنا يسوس امورنا ويقيمها ملك بأمر إلهه قوّام
رحب الذراع كفى الذى نعنى به رأى له فى المشكلات حسام
عبد الحميد أتاح فى أيامه للملك ماذهبت به الأيام
لولا حزامته شدة بأسه ومضاؤه لتضعضع الإسلام
مازال يحمى حوضه مذ جاءه وكذاك يحمى غيله الضرغام
.....دم يا أمير المؤمنين فما لمن عاداك بين العالمين دوام
لا زلت ياركن الخلافة شامخاً تعنو لك الأعراب والأعجام(۲۱)

شاعر الکاشف ۱۹۰۰ء میں سلطان عبد الحمید کے جلوس کی شان میں ایک قصیدہ کہتے ہیں جس کے یہ اشعار بڑے مشہور ہیں :

يا ناصر الإسلام إن زماننا بك صارفى عز وفى استكبار
و معز كل مسالم لك خاضع و مذلّ كل معاند جبار
و معيد أدوار الشباب لموطن كم للحوادث فيه من أدوار(۲۲)

ایک دوسرے قصیدہ میں وہ سلطان کے ماموں کا مرثیہ کہتے ہیں اور سلطان کی تعلیم وتربیت اور اسلامی ذہن کی پرورش میں ماموں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے وہ مدح خواں ہیں :

وقد كنت المعين على صلاحى ومرشدى العظيم إلى الكمال
تعلمنى الرماية والقوافى وآداب الخطابة والجدال
وتلهمنى المعانى باهرات أسيل بهن كالسحر الحلال

وتوضح لی المسالک والمساعی فأبلغ کل ممتنع المنال
وتشربنی بعلمک حب دینی وقومی والخلیفة والهلال (۲۳)

ایک اور شاعر نسیم عید الفطر کے موقع پر سلطان عبد الحمید کو مبارکباد دیتے ہوئے کہتا ہے :

أقمت عرشک بین الحق والسدد فزاده الله تثبیتا إلی الأبد
.....فکیف نفزع فی الدنیا لطارئة وأنت تحمی ذمار الفازع الخضد
خلیفة الله یا ابن الغمر من نجب لله درك یوم الروع من عضد
جاهدت فی الملک تحمیه وتحفظه جهاد طه مع الأنصار فی أحد
والسیف یکتب آیَ الفتح محکمة علی البلاد بنفس من دم جسد
وقد أعدت إلی الإسلام نضرته حتی زهی بک واستذری إلی سند(۲۴)

ایک دوسرے قصیدہ میں وہ کہتا ہے :

وقد أعدت إلی الإسلام نضرته حتی أرتدی روضة بالیانع الخَضِل
وبت ترعی الرعایا فی مراقدها وصرت تحمی ذمار الفازع الوجل
وکان قبلک قلب السیف مضطربا فقرَّ بعدك قلب السیف فی الخلل
فلا برحت لهذا الدین تکلؤه حتی یعود إلی أیامه الأول (۲۵)

ایک شاعر عبد المطلب دستور عثمانی کے نفاذ پر سلطان عبد الحمید کی خدمت میں ہدیہ تبریک اس طرح پیش کرتا ہے :

یا عید حیٍّ و أنت خیر نهار عبد الحمید بدولة الأحرار
ملک أقام علی الخلافة منهم حرما وقاها صولة الأشرار
من بعد ما کاد الزمان یحلها بالجور دار مذلة وهوان
...عهد مضی ، لا عاد، کبَّل دولة الـ إسلام فی الأغلال والآصار
فرمت مقاتلها ید الأطماع من دول کلفن بحب الاستعمار
هذی تطالب بالدخول و هذه تحتال فی وطر من الأوطار
لولا أمیر المؤمنین یحوطها لرأیتها خبراً من الأخبار (۲۶)

ایک اور قصیدہ میں ۱۹۱۴ء میں مصر کے خلاف انگریزوں کی حمایت کے اعلان پر دو سو اشعار میں عثمانی خلافت کی حمایت کرتا ہے، اس قصیدہ کی ابتداء ترکی جھنڈے کی سلامی سے کرتا ہے:

هلال الهدى فى دارة المجد أشرق — و دونک ليل الغىّ بالرشد فامحق
و يا علم الأعلام كم خفقت قلو — ب قوم إلى مرأى حفافيک فاخفق (۲۷)

پھر وہ مصر کی بدحالی کی تصویر کشی کرتا ہے اس کے بعد قسطنطنیہ کے حلیفوں کا تذکرہ کرتا ہے اور دشمنوں کے حملوں کو ناکام بنانے کی دعا دیتا ہے:

فأبلغ بنى التاميز عنا وحلفهم — بباريس أنباء النذير المصدق
عشية يحدون الأساطيل شُرَّعا — على اليم تحبو فى الحديد المطبَّق
تشن على دار الخلافة غارة — من البحر إن تقرع بها الدهر يفرَق
تألفن بالعدوان يجرين باسمه — إلى غرض من مدحض الهون مزلق
فأقبلن فى شمل من البغى جامع — وعدن بشمل بالهوان مفرَّق
...ومن يتحرش بالردى يكرع الردى — زعافا ومن يستنبث النار يُحرَق(۲۸)

شاعر علی الغایاتی اپنے ایک قصیدہ میں ۱۹۰۸ء کے عثمانی دستور کی مناسبت سے سلطان عبدالحمید کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

أميرَ المؤمنين مضت قلوب — اليک يحثها الحب المكين
تؤمل أن تراك لها معيناً — وأنت لها على الدهر المعين
رأتک أمامها الأمل المرجىّ — وفيک لدائها البرء المبين
فيا أمل القلوب ، إليک مصر — تشير و بين جنبيها حنين
تحن إليک يا رب المعالى — وقد حلت بساحتها الشجون
رمتها الحادثات بشرّ قومٍ — لهم فى كل مظلمة شئون
قضت فى عصرهم مصر ولولا — رجاء فيک ما قرَّتْ عيون
فأعزز يا حمى الإسلام شعباً — بعزك لا يذل ولايهون (۲۹)

۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان چھڑی تو تمام مسلمانوں نے اپنے جذبات عثمانی خلافت کے ساتھ وابستہ کر دیئے اور

ادیبوں اور شاعروں نے اس موقع پر خلافت اسلامیہ کا بھر پور ساتھ دیا۔ شوقی نے اس موقع پر ایک شاندار قصیدہ کہا جس میں اسلام کے مٹتے ہوئے مجد و شرف کی اس نے دہائی دی اور مشرقی و مغربی یوروپ سے آل عثمان کی پسپائی پر نوحہ خوانی کی، اسی لئے اس قصیدہ کا نام انہوں نے الأندلس الجدیدۃ رکھا۔ وہ اس قصیدہ میں کہتے ہیں :

يا أخت أندلس عليك سلام — هوت الخلافة عنك والإسلام
نزل الهلال عن السماء فليتها — طويت و عمَّ العالمين ظلام
أزرى به و أزاله عن أوجه — قدر يحط البدر و هو تمام
جرحان تمضى الأمتان عليهما — هذا يسيل ، وذاك لا يلتام
بكما أصيب المسلمون ، وفيكما — دفن اليراع و غُيِّب الصمصام
لم يطو مأتمها ، وهذا مأتم — لبسوا السواد عليك فيه وقاموا
ما بين مصرعها و مصرعك انقضت — فيما نحب و نكره الأيام
خلت القرون كليلةً و تصرَّمت — دول الفتوح كأنها أحلام (۳۰)

خلافت اسلامیہ اور جامعہ اسلامیہ کے اس تصور کے علی الرغم مصر اور عالم اسلام میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو جامعہ اسلامیہ کی جگہ جامعہ مصریہ یعنی مصری قومیت کا علم بردار تھا۔ اس مکتب فکر کے اہم ترین اور سب سے پہلے قادر الکلام ترجمان احمد لطفی السید تھے جنہیں بجا طور پر جدید مصری قومیت کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ انہوں نے مصر کے سیاسی و سماجی حالات پر مدتوں غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ مصری فرانس انگلینڈ خلافت عثمانیہ اور دوسری تمام عالمی طاقتوں کا سہارا لینا چھوڑ دیں، وہ خود کفیل بنیں، آزادی و دستور کی لڑائی وہ خود لڑیں اور دوسروں کے اتحاد و اختلاف سے الگ ہو کر اپنے ملک کی پالیسی خود وضع کریں۔

استاد احمد لطفی السید نے الجریدہ میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا :

عليكم أنفسكم
(اپنی فکر کرو)

اس مقالہ میں انہوں نے ان مصریوں پر تنقید کی جو عثمانی بحریہ کی اعانت اور اس کے ایک نئے بیڑہ کی تشکیل کے لئے عوامی چندہ کر رہے تھے۔ انہوں نے اس مضمون میں یہ احساس دلایا کہ اگر اس عوامی جدوجہد کا مقصد ترکوں کا دفاع اور استحکام ہے تو مصر کا دفاع اور اس کا استحکام سب سے پہلے ضروری ہے اور اگر اس کا مقصد انگریزوں کو تکلیف پہنچانا

ہے تو انگریزوں کو سب سے زیادہ تکلیف اس بات سے ہو گی کہ قوم کے اندر علوم و معارف کو عام کرنے کیلئے انجمنیں بنائی جائیں اور صحیح اخبار و واقعات کو ان کے درمیان عام کیا جائے یہ کسی طرح درست نہیں ہے کہ ہم اپنے مصری تشخص کو عثمانی تشخص میں ضم کر دیں کیونکہ یہ رائے صحیح بھی نہیں ہے اور مصر کے مفادات سے ہم آہنگ بھی نہیں ہیں۔(۳۱)

ایک دوسرے مضمون میں جس کا عنوان تھا :

غرض الأمة هو الإستقلال

(قوم کا نصب العین آزادی ہے)

انہوں نے جامعہ اسلامیہ کے تصور پر تنقید کی :

"مصری قومیت کا اولین مفہوم مصری وطنیت (ہماری مراد مصری وطن ہے) کی تعیین اس کا تحفظ اور اس کے لئے اس طرح کی خودداری ہے جس طرح ایک ترک اپنے وطن کے لئے اور ایک انگریز اپنے وطن کیلئے خوددار ہوتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر درست نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو جامعہ اسلامیہ کے تصور کی بھینٹ چڑھا دیں جس کا مفہوم بعض لوگوں نے وسیع کر کے یہ بنا دیا ہے کہ مصر ہر مسلمان کا وطن ہے .... یہ بہت ضروری ہے کہ ہم اس قدیم غلط فہمی میں نہ پھنسیں جو ہمارے دماغوں کو وقتاً فوقتاً پراگندہ کرتی رہتی ہے۔ کبھی یہ خوشنما خیال ہمیں پریشان کرتا ہے کہ فرانس ہمارے ملک کو آزاد کرائے گا اور کبھی ہم اس خوش خیالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دولت علیا ہماری حمایت کرے گی، ان تمام جھوٹے خیالات سے قوم کو دور رکھنا ضروری ہے اور اپنے دلوں میں آزادی کے نظریہ کی تخم کاری واجب ہے"۔(۳۲)

ایک دوسرے مقام پر وہ کہتے ہیں کہ :

"اسی طرح ہم مصری اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں اور ہم کبھی گوارا نہیں کریں گے کہ ہم کسی اور ملک سے منسوب ہوں خواہ ہمارا آبائی رشتہ حجازیوں سے ہو یا بربروں سے ہو یا ترکوں سے اور شراکسہ سے ہو یا شام یا روم سے ہمارا کوئی تعلق ہو۔ مصر ایک پاکیزہ ملک ہے اور اس کی ایک عظیم الشان تہذیب ہے اس کے پاس جو قدرتی خزانے ہیں اور جو قدیم امتیاز اسے حاصل ہے اس کی بنا پر وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتا ہے"۔(۳۳)

ایک اور مقالہ میں استاد احمد لطفی السید اتحاد اسلامی کے علم برداروں کے دلائل کا محاسبہ کرتے ہیں اور عقلی اور

تاریخی اعتبار سے اس نظریہ کو پس ماندہ قرار دے کر نظریۂ قومیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔ فاضل مصنف کے مطابق سرزمین اسلام کو تمام مسلمانوں کا وطن قرار دینا ایک استعماری نظریہ ہے جس سے مسلمانوں نے غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے مسلمان اپنے قومی اور وطنی حقوق کے لئے نبرد آزما ہیں۔ اب یہ نظریہ زیادہ دنوں تک مؤثر نہیں رہ سکتا وہ لکھتے ہیں :

> "اب اس نظریہ کو باقی رہنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ یہ نظریہ اقوام اسلام کی موجودہ صورت حال اور ان کے اغراض و مقاصد سے میل نہیں کھاتا۔ اب اس نظریہ کی جگہ ایک ہی مذہب تمام مشرقی اقوام کے لئے قابل عمل رہ جاتا ہے اور وہ ہے وطنیت کا مسلک"۔(۳۴)

عالم عرب میں آزادی کا مسئلہ :

استاد احمد لطفی السید نے عالم عرب کے مختلف اور متضاد حالات میں آزادی اور حریت کے مسائل پر بڑی جرأت اور بے خوفی سے اظہار خیال کیا انہوں نے عالم اسلام میں حریت کی مشکلات سے قومی انداز میں بحث کی اور اس کے اصول و ضوابط طے کئے۔ آزادی کی قدر و قیمت اور اس کے فوائد و برکات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اس عمومی تجزیہ کے علاوہ فاضل مصنف نے آزادی کے مخصوص مسائل پر بھی قلم اٹھایا جیسے مختلف نظام ہائے حکومت میں آزادی کے موضوعات، سیاسی پارٹیاں اور آزادی اظہار رائے، حقوق عامہ اور قانون سازیہ، نظام تعلیم کی آزادی کے بعد عدلیہ کی آزادی، صحافت کی آزادی، تقریر اور خطابت کی آزادی، معاشرت کی آزادی اور دنیائے عرب میں افراد و اقوام کے درمیان آزادی کا مسئلہ وغیرہ۔ فاضل مصنف نے عالم عرب کے اپنے مشاہدات بھی بیان کئے۔ مشرق پر طاری ناامیدی اور مایوسی کی کیفیت کا تجزیہ کیا۔ ان ملکوں کی اخلاقیات کا ناقدانہ جائزہ لیا اور سیاسی و اقتصادی اداروں اور ان کے احوال پر تنقید کی، اور ان تمام مسائل کا نہایت گہرا تعلق آزادی و حریت کی بیش قیمت قدر سے قائم کیا۔

فاضل مصنف کے نزدیک آزادی انسانی زیست کا مقصد ہے۔ آزادی کے حصول کے لئے نوع انسانی نے بیش بہا قربانیاں دی ہیں۔ اس کی راہ میں عزیز ترین متاع کو بھینٹ چڑھا دیا ہے، جان و مال، عزت و آبرو، جاہ و منصب سب کچھ تیاگ دیا ہے۔ دور قدیم سے آج تک تمام روایات میں انسانوں نے اپنے کو آزاد کہلوانا اور آزاد اقوام کی جانب اپنے کو منسوب کرنا قابل فخر تصور کیا ہے اور غلامی کو ہمیشہ بدترین وصف شمار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی فضیلت کا ستون ہے، اخلاقیات کی جان ہے، ذمہ داریوں اور فرائض کا پہلا زینہ ہے، جس انسان کے سینے میں "آزادی کی آگ بجھ

چکی ہو اور اس کے عقلی و فکری رویوں میں آزادی کی چنگاریاں راکھ میں تبدیل ہو چکی ہوں اسے انسان نہیں کہا جاسکتا، اسے تو زندہ افراد کی فہرست میں رکھنا بھی مشکل ہے"۔(۳۵)

آزادی و حریت کے لئے انسان کے جذب و شوق اور اس کی وار فتگی کا سب سے بڑا ثبوت تاریخ انسانی کے تجربات و واقعات اور اس کے احوال و وقائع ہیں۔ پوری تاریخ علی الاعلان کہہ رہی ہے کہ آزادی ہی زندگی ہے بلکہ زندگی سے بھی کہیں زیادہ بیش قیمت ہے اور انسانی تجربات اور تاریخ کے مشاہدات کتابوں کی تحریروں، مصنفین کے بیانات اور ادیبوں اور شاعروں کی خیال آرائیوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں۔

فاضل مصنف کسی بھی قسم کی انقلابی تبدیلی کے مخالف عناصر کے اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں اور مصری قوم کو آزادی جیسی عظیم نعمت سے محروم کرنے کے لئے تراشے گئے حیلوں اور بہانوں پر تنقید کرتے ہیں :

"لوگ کہیں گے کہ یہ تو افرنگی تعلیمات و افکار ہیں اپنے یوروپین اساتذہ کی اندھی تقلید میں مصر کی ضرورت اور تقاضہ کو سامنے رکھ کر مصر کے قلم کاروں نے انہیں اختیار کر لیا ہے، حالانکہ فی الحقیقت آج ملک کو نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ صحافیوں کے دلوں میں ان افکار کے لئے کوئی جگہ ہے۔ قوم تو بے چاری سیدھی سادھی اور سادہ لوح ہے۔ وہ اللہ و رسول کی امان میں مست ہے اسے کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی، بس ضرورت اس کی ہے کہ یہ قلم کار اپنے قلم توڑ دیں اور یہ شعلہ بیان مقرر اپنی زبانوں پر تالے لگالیں تاکہ یہ لوگ قوم کی صاف ستھری زندگی کو گدلا نہ کریں اور اپنے خوابوں اور اپنی آرزوؤں کو قوم کے دماغ میں نہ اتاریں، اور قوم جس صورت حال سے دوچار ہے اس کو بدبختی پر محمول نہ کریں، یہ مصری مصنفین ہی ہیں جو اپنے جذبات اور اپنی تمناؤں کو قوم کے دلوں میں اتار رہے ہیں ..... ٹھیک ہے تم ہمارے حق میں ہر چیز کا انکار کر دو لیکن اس حقیقت کو تم کیسے جھٹلا سکتے ہو کہ ہم بھی انسان ہیں، ہمیں بھی آزادی سے لگاؤ ہے، ہم بھی ان اقوام کی صفوں میں شامل ہونے کی آرزو رکھتے ہیں جن کے عناصر تہذیب و ثقافت، مصری وحدت و قومیت کے لئے موجود عناصر سے زیادہ نہیں ہیں، تم ہماری تمام باتوں کا انکار کر سکتے ہو مگر اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتے کہ ہمیں بھی جینے کا حق ہے اور یہ زندگی آزادی کے بغیر بے معنی ہے"۔(۳۶)

اس طرح وہ اس اعتراض کا بھی جواب دیتے ہیں کہ آزادی سلب کر لینے میں موجودہ حکومت کا کوئی قصور نہیں ہے، خود قوم کو آزادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ موجودہ حکومت تو ہر وہ حق دینے کے لئے تیار ہے جس کو استعمال

کرنے کی قوم کے اندر صلاحیت ہو۔ فاضل مصنف کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک بے بنیاد دلیل اور محض مغالطہ ہے۔ موجودہ حکومت پچھلی حکومتوں کی محض توسیع ہے۔ ایک مظلوم قوم کے تئیں اس کی ذمہ داری اسی وقت پوری مانی جائے گی جب کہ وہ خود قوم کے تمام حقوق سے دست بردار ہو جائے۔ شخصی آزادی بلکہ عوامی آزادی کوئی بچوں کا کھلونا نہیں ہے کہ جب دل چاہا اس سے دل بہلالے اور جب دل چاہا اسے توڑ پھوڑ کے پھینک دے بلکہ "افراد اور اقوام دونوں کے لئے یہ فطری حقوق ہیں جن کے قریب کوئی عادل حکومت اپنی مصلحتوں کے تئیں نہیں پھٹک سکتی، اسے ہر حال میں رعایا کا مفاد ملحوظ رکھنا ہے، یہ فرد اور قوم دونوں کے لئے زندگی کی حیثیت رکھتا ہے"۔(۳۷)

فاضل مصنف مختلف نظام ہائے حکومت میں سے اسی نظام حکومت کو مصر اور عالم عرب کے لئے زیادہ مناسب اور قابل عمل تصور کرتے ہیں جس میں آزادی کی بھرپور ضمانت دی گئی ہو، گرچہ دور جدید میں اشتراکیت اور سوشلزم کا بڑا چرچہ ہے اور مختلف ملکوں میں مختلف انداز میں اسے نافذ کیا جارہا ہے۔ فاضل مصنف اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہر نظام حکومت کا بنیادی اصول قومی مفاد ہے اور تمام اصول و نظریات مفاد عامہ کے گرد منڈلاتے ہیں اگر ہم مصری قانون سازی کے لئے کسی نظام حکومت کو اختیار کرنے میں مفاد عامہ کو ترجیح دیں تو بغیر کسی تاخیر کے ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ ہمارے مناسب حال صرف اور صرف مذہب آزادی ہے :

> "آزادی کا مسلک یا آزادی کے علم برداروں کا نظریہ اپنی روح کے اعتبار سے اس بات کا متقاضی ہے کہ آزاد ممالک میں کسی گروہ کو یا کسی عرب ملک میں کسی حکومت کو اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ افراد کی آزادی اور ان کے مفادات کو کسی گروہ یا حکومت کی آزادی کی بھینٹ چڑھادیا جائے۔ اس نظریہ کی اصل اور فطرت کا تقاضا ہے کہ حکومت کو اتنی ہی قوت اور اقتدار حاصل ہو جو بربنائے ضرورت اسے حاصل ہونی چاہئے اور یہ انتظامیہ کے تین شعبہ ہیں، پولس کا شعبہ، عدلیہ اور دفاع وطن کا شعبہ، اس کے علاوہ جو دوسرے شعبے اور مفادات و مصالح ہیں ان میں افراد و قوم کو پورے حقوق اور اختیارات حاصل ہوں۔ حکومت کی خواہ کوئی شکل ہو اس اقتدار کی موجودگی کی وجہ محض ضرورت اور مصلحت ہے، اس لئے ضرورت و مصلحت کی حدود کے اندر ہی اسے محصور رکھا جائے اور افرادی اور قومی سرگرمیوں کے دوسرے دائروں میں دخل اندازی کی اسے اجازت نہ دی جائے کیونکہ حکومت اپنے تئیں جس حق کا بھی اضافہ کرے گی وہ افراد کے حقوق کو چھین کر ہی کرے گی اور جس اقتدار کو بھی حکومت استعمال کرے گی، اس سے افراد کی آزادی لا محالہ زد میں

آئے گی"۔(۳۸)

احمد لطفی السید ایک جمہوری حکومت میں سیاسی پارٹیوں کے اختلاف رائے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ مجلس قانون ساز میں جب اراکین کسی مسئلہ پر بحث و مباحثہ کے لئے بیٹھتے ہیں اور حکومت کی جانب سے یا کسی رکن پارلیمان کی طرف سے کوئی تجویز رکھی جاتی ہے تو اس میں اختلاف فکر و نظر کا ابھرنا ناگزیر ہے، کیونکہ انسانوں کی جس قدر تعداد ہوتی ہے اتنی ہی ان کے نظریات اور مختلف رائیں ہوتی ہیں۔ فکر و نظر کا یہ اختلاف در اصل لازمی نتیجہ ہے سیاسی پارٹیوں کے درمیان اختلاف کا، یا اراکین پارلیمان کی معلومات اور علمی سطح کے درمیان فرق کا، یا کم از کم مزاج کی تبدیلی اور طبیعتوں کا فرق اس فکری اختلاف پر منتج ہوتا ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی رکن پارلیمان کو کسی سیاسی مسلک سے کوئی وابستگی نہیں ہے تو یہ ایک ناممکن بات ہے۔ مختلف سیاسی پارٹیاں وجود ہی اس لئے پاتی ہیں کہ ان کے مفادات مختلف ہوتے ہیں، ان کی وفاداریوں میں فرق ہوتا ہے اور ان کے فکر و نظر میں تنوع ہوتا ہے اور حقیقت کی عمارت بحث و تمحیص، تردید و استفادہ اور کسر و انکسار پر کھڑی ہوتی ہے۔ اگر حکومت اختلاف و مخالفت کو برداشت نہیں کرنا چاہتی تو وہ ایسے اراکین کی تقرری پسند کرتی ہے جو صحیح اور غلط ہر تجویز پر صاد کر دیں۔ احمد لطفی السید کے نزدیک اس صورت میں قانون سازیہ کی تشکیل کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی اور حکومت بغیر کسی مشاورت اور اعلان کے رعایا کے معاملات کو جس طرح چاہے حل کرتی رہے۔(۳۹)

فاضل مصنف مصری اراکین پارلیمان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر ہم ان کے اندر سے پارٹی سیاست کی ترجمانی کو ختم کر دینا چاہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی دستوری اور قانونی مسئلہ پر ان کی رائے برجستہ ہوگی اور حکومت اور سیاست کے متعین افکار و نظریات سے ان کی کوئی وابستگی نہ ہوگی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ پارلیمان میں جو بھی قانون سازی ہوگی، وہ مردہ قانون سازی ہوگی، جس کے اندر نہ کوئی روح ہوگی، نہ اس کے اجزاء میں باہم کوئی ربط ہوگا اور ملک پر اس کا کوئی اچھا اثر بھی مرتب نہ ہوگا، اسی لئے فاضل مصنف اراکین پارلیمان کو مخاطب کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں کہ :

محترم اراکین پارلیمان!

"آج کی قوم ماضی کی قوم نہیں ہے، آپ حضرات نے خود ابھی تحریک انتخاب کا مشاہدہ کر لیا ہے اور نہایت قریب سے آپ کو اس کا علم ہو گیا ہے کہ تحریک انتخاب کے عوامل اب وہ نہیں رہے جو پرانے زمانہ میں تھے اور آپ حضرات کو منتخب کر کے اس کا جو نتیجہ سامنے آیا ہے وہ خود ایک

بڑی دلیل ہے کہ قوم کی آرزوؤں اور تمناؤں میں بڑی تبدیلی آچکی ہے اور اپنے اراکین پارلیمان سے اس کے مطالبے اب بہت بڑھ چکے ہیں۔ قوم آپ سے ایسا مطالبہ نہیں کرتی جو آپ کی طاقت اور صلاحیت سے باہر ہو، نہ وہ ان حالات سے چشم پوشی کرنا چاہتی ہے جن میں آج ملک گھرا ہوا ہے۔ قوم کا مطالبہ آپ سے صرف یہ ہے کہ آپ آزادی کی اس کے تمام معانی و تصورات سمیت حمایت کریں کیونکہ آج قوم کو سب سے زیادہ ضرورت اسی چیز کی ہے"۔(۴۰)

فاضل مصنف قانون سازی کے اختیارات کی تحدید کرتے ہوئے حقوق عامہ کی حفاظت پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ فاضل مصنف کے نزدیک وطن سے محبت کرنا اسی طرح کا جذبہ ہے جیسے آدمی افراد خاندان سے محبت کرتا ہے، یا جس طرح وہ دوسرے جذبات و احساسات رکھتا ہے، مگر ان سب کی اساس مصلحت اور منفعت پر ہے۔ منفعت ہی پر ہر احساس اور ہر عمل کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ متبادل منفعت ہی کی بنیاد پر انسانی تنظیم یا اجتماع تشکیل پاتا ہے۔ وہ فرد جسے انسانی اجتماع میں تاوان ہی سے دوچار ہونا پڑے اور اسے کسی منفعت کی امید نہ ہو، اس کی فطری آزادی پر بندش لگ جائے، خواہ معاشرہ اسے ناگزیر تصور کرے یا نہ کرے، وہ سلطان وقت یا وطن کا دفاع کرتے ہوئے جنگوں میں کود پڑے، ان تمام سیاسی چالوں کا کل پرزہ بن جائے جو حکومت وقت کی جانب سے چلی جائیں، پولس کے قواعد و ضوابط، معاشرہ کی تنظیمات اور حکومتی اداروں کے ضابطوں کی بجبر و اکراہ پابندی کرے، وہ ایک مستقل دباؤ کا شکار رہے اور اسے کھانے پینے اور پہننے کا ہوش نہ رہے بلکہ جمہور سے ہم آہنگ ہو کر سوچنے کے لئے وہ مجبور کر دیا جائے تو ایسا فرد جسے انسانی اجتماع میں ان تنگیوں اور نقصانات کا سامنا کرنا پڑے اور ان کے مقابلے میں مادی و معنوی مصالح و مفادات سے بالکلیہ وہ محروم رہے تو انسانی معاشرہ میں منسلک رہنے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ فاضل مصنف کے بقول تاریخ کا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ ایسے ہی معاشرہ کے خلاف انتقامی جذبہ پرورش پاتا ہے اور اسی طرح کے اجتماع سے انقلاب کے شعلے جنم لیتے ہیں۔(۴۱)

احمد لطفی السید ان بنیادی انسانی حقوق سے بحث کرتے ہیں جو کسی بھی انسانی معاشرہ کے ہر فرد کو ملنے چاہئیں یعنی انفرادی آزادی اپنے مکمل مفہوم میں ہر فرد کو حاصل ہو، اسے فکر و ضمیر اور عقیدہ و مذہب کی پوری آزادی ہو، اظہار رائے اور تحریر و تقریر کی آزادی حاصل رہے اور تعلیم و تربیت کی آزادی ان حدود میں حاصل ہو جو دوسرے انسانوں کے لئے غیر مضر ہو، کسی بھی قانون بنانے والی حکومت یا فرد کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کوئی ایسا قانون بنائے جو انسانوں کی بنیادی آزادی سلب کر لے۔ احمد لطفی السید نے قانون کے سامنے مساوات کے حق پر تفصیل سے بحث کی

ہے اور انہوں نے ۱۲۸۱ھ کے اُس فوجی قانون کو حق مساوات کے خلاف قرار دیا ہے جس کے مطابق کسی مصری فوجی کو اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود یوزباشی کے رتبہ سے آگے ترقی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اسی طرح انہوں نے انفرادی ملکیت کے حق سے بھی بحث کی ہے۔ فرد کے ساتھ معاشرہ کی عمومی اور اجتماعی آزادی کا تصور بھی فاضل مصنف نے ابھارا ہے۔

فاضل مصنف نے نظام تعلیم کی آزادی پر گفتگو کرتے ہوئے مصر میں دستوری تغیرات سے پہلے سلطنت عثمانیہ کے نظام تعلیم کا جمہوریہ فرانس کے نظام تعلیم سے تقابل کیا اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایک مطلق العنان خود مختار حکومت اور ایک جمہوری حکومت کے تعلیمی نظاموں میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے، وہ دونوں نظام ہائے حکومت کے تعلیمی نظام سے مختلف مثالیں نقل کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "سرکاری تعلیم پر ہمیشہ حکومت کی پالیسی اور سیاست کی چھاپ رہتی ہے اور تعلیم پر جب بھی حکومت کا اقتدار حاوی ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ ضرر رساں ثابت ہوتی ہے"۔ (۴۲)

فاضل مصنف نے سرکاری نظام تعلیم کے مخصوص مقصد اور نصب العین کی نشان دہی کی ہے حتیٰ کہ وہ مغربی حکومتیں جنہوں نے تعلیم کی سرپرستی کی انہوں نے عوام کے مفادات و مصالح کو پیش نظر رکھنے کے بجائے اپنے ہدف کو ہمیشہ ترجیح دی۔ انہوں نے لارڈ کرومر اور لارڈ کرزن کی تعلیمی پالیسی نقل کی ہے کہ دونوں کہا کرتے تھے :

"مشرق کے تعلیمی نظام کو یوروپ کے تعلیمی نظام کے مقاصد تک وسیع کرنا درست نہ ہوگا بلکہ ایک متعین حد پر رک جانا اور وہاں قدغن کھڑی کر دینا ناگزیر ہوگا"۔

فاضل مصنف کہتے ہیں کہ بلاشبہ اس "متعین حد" سے مراد وہ حد ہے جہاں پہنچ کر ایک مشرقی طالب علم مغرب کی مزاحمت کرنے کے قابل نہ رہے۔ (۴۳)

احمد لطفی السید سرکاری نظام تعلیم پر تنقید کرنے کے باوجود حریت اور نام نہاد آزادی کے علمبرداروں (Lib-erals) کے اس نظریہ سے متفق نہیں ہیں کہ حکومت کا کام عدلیہ اور پولس کے ذریعہ اندرون ملک امن عامہ کو قائم رکھنا اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے، البتہ وہ اس نظریہ کے علم بردار ہیں کہ آزاد تعلیم سرکاری تعلیم سے زیادہ نفع بخش ہوتی ہے اور یہ کہ سیاست کی چھاؤں تلے علم کبھی ترقی نہیں کر سکتا اور والدین اپنے بچوں کی راست تربیت بہتر طریقہ سے کر سکتے ہیں البتہ حکومت کا کام یہ ہے کہ امن وامان اور حقوق و آداب کے تحفظ کے لئے ضروری کارروائی کرے۔ (۴۴)

"ہمارے حقوق عدلیہ کی آزادی کے مرہون ہیں اگر عدلیہ آزاد اور خود مختار نہ ہو تو ہمارے مفادات صفر ہیں اور ہماری آزادی محض ہوائی ہے" فاضل مصنف اس نقطۂ نظر کی وکالت کرتے ہوئے مغربی مفکرین جان لاک (۴۵) اور مون ٹیسکو (۴۶) کے افکار و نظریات سے استدلال کرتے ہیں۔ اور عدلیہ قانون سازیہ اور انتظامیہ کے تینوں شعبوں کے درمیان تفریق کی ترجمانی کرتے ہیں تاکہ حکومت ظلم و جبر نہ کر سکے اور انسانوں کے فطری اور قانونی حقوق محفوظ رہ سکیں۔ یہ تینوں اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں ہوں یا ایک گروہ کے ہاتھ میں، ان سے مطلق العنان اور بے لگام حکومت ہی وجود میں آتی ہے جس سے ہر دور اور ہر ملک میں انسانیت کو کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ ایسی حکومت انسانوں کی فطرت ان کے مزاج اور ان کے اخلاق و عادات تک کو مسخ کر دیتی ہے۔ (۴۷)

عدلیہ کی آزادی پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہوئے فاضل مصنف مغربی مفکر دوکروک کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ :

"عدالتی اختیارات انتظامی اختیارات کا نصف حصہ ہیں"

اسی لئے عدلیہ کی خود مختاری فاضل مصنف کے نزدیک سب سے پیچیدہ عقدہ اور سب سے نازک مسئلہ ہے، کیونکہ عدل و انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والے انتظامیہ کے کسی حد تک زیر اثر رہتے ہیں۔ انتظامیہ کا یہ اثر کہیں کم ہوتا ہے اور کہیں زیادہ، اس کا اثر مختلف ملکوں میں مختلف ہو سکتا ہے مگر حکومت کے زیر اثر ہونے کا کوئی انکار نہیں کر سکتا کیونکہ حکومت ہی ان کی تقرری کرتی اور انہیں ترقی دیتی ہے اور ایک غیر موزوں جگہ سے کسی پسندیدہ جگہ کی طرف ان کی منتقلی کا کام بھی حکومت ہی کرتی ہے گرچہ ان تمام امور میں ججوں کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے مگر سماجی و مادی ترقی اور تنخواہوں میں اضافہ انسان کی ایک فطری خواہش ہے اور یہی خواہش بسا اوقات عدل و انصاف کے تقاضوں کو مجروح کرتی ہے۔ (۴۸)

صحافت کی آزادی کو احمد لطفی السید کسی بھی جمہوری حکومت کے لئے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ کثیر آبادی والے ملکوں میں بغیر صحافت کے رائے عامہ کی تشکیل ناممکن ہے یہاں تک کہ کسی چھوٹے ملک میں بھی رائے عامہ اسی وقت منظم اور بار آور ہو سکتی ہے جبکہ اسے روزانہ کے واقعات کا علم ہو اور بدلتے ہوئے رجحانات سے بھرپور واقفیت ہو۔ فاضل مصنف کے بقول "صحافت خود ایک طاقت ور ترین حکومت ہے کیونکہ یہ وہ حکومت ہے جو حکومت کے ڈنڈا اور قانون کے بل پر نہیں بلکہ عقیدہ و ضمیر کی طاقت کے ذریعہ عوام الناس پر حکومت کرتی ہے"۔ (۴۹)

فاضل مصنف نے صحافت کی آزادی پر ہونے والے اعتراضات اور مختلف حلقوں سے اٹھائے جانے والے

شکوک وشبہات کی تردید اور قوت وجبروت کی حکومت کے بجائے اعتقاد وترسیل، افہام وتفہیم، ارتباط وتعامل کی حکومت کے لئے صحافت کی آزادی کو ضروری قرار دیا ہے۔ فاضل مصنف کے نزدیک آزادیٔ صحافت خالص شخصی اور انفرادی آزادی ہے جس نے ترقی کر کے ایک ایسا اجتماعی اور معاشرتی نظام تشکیل دے دیا ہے جو ترقی یافتہ ملکوں کے لئے ناگزیر بن گیا ہے۔

احمد لطفی السید اجتماع اور معاشرت کی آزادی کو فکری و نظری آزادی اور آزادیٔ صحافت کا ناگزیر حصہ قرار دیتے ہیں۔ انسان جس طرح فکر میں عقیدہ میں، تحریر و تقریر میں آزاد ہے اسی طرح اجتماعیت میں بھی آزاد ہے :

"اجتماع کی آزادی انسان کے اندر ودیعت کردہ ایک طبیعی صفت ہے یہ انفرادی آزادی کا ایک اہم مظہر ہے، اس کے نتائج بڑے دور رس ہیں تہذیب و ثقافت کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ آزادی اہم تر ہوتی چلی جاتی ہے"۔(۵۰)

اجتماع کی آزادی ظلم و جبر کے خلاف دوسری آزادیوں کے مقابلے میں مضبوط ترین حربہ اور مؤثر ترین ہتھیار ہے کیونکہ اجتماع فرد سے زیادہ طاقت ور، طویل العمر اور ہمہ گیر اثر رکھنے والا ادارہ ہے، اور زمانے کے انقلابات اس پر مشکل ہی سے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

تاریخ کا مطالعہ بھی اسی حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ خود مختار اور مطلق العنان حکومتوں نے خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، کبھی انجمنوں کی تشکیل اور تنظیموں کے قیام کی پشت پناہی نہیں کی ہے الّا یہ کہ ان حکومتوں کا مقصد ان کی آواز دبانا اور ان کے ناخن اکھاڑ لینا رہا ہو تاکہ ان کی صلاحیت اور قوت مفلوج ہو جائے اور غلامی سے آزادی کی طرف لے جانے کی ان کی صلاحیت معطل ہو کر رہ جائے۔ اس طرح کی تمام حکومتیں تمام تنظیموں اور انجمنوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتی ہیں اور ان کے رابطۂ عامہ کو کبھی اتنا مضبوط اور مستحکم نہیں ہونے دیتیں کہ وہ کسی وقت ان کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کر سکیں۔ اسی لئے فاضل مصنف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ اجتماعی ادارے اور تنظیمیں قوت کا اصل سرچشمہ ہیں اور ظلم واستبداد کے خلاف مضبوط ڈھال اور حقوق انسانی کے تحفظ کا نہایت مضبوط وسیلہ ہیں۔(۵۱)

احمد لطفی السید نے مختلف سیاسی نظریات اور اداروں کا تقابل کرتے ہوئے سرمایہ داری، اشرافیہ، سوشلزم اور اشتراکیت سے بحث کی ہے اور ایک منفرد طرز حکومت اصول حریت کی پاسداری کو بھی قرار دیا ہے۔ اسی طرز حکومت کو وہ تمام عالم عرب میں نافذ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ قانون سازی میں اراکین پارلیمان کو اسی اصول کو پیش نظر رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ تحقیق و تفتیش کے جملہ اداروں کو اسی اصول کی پابندی کرنے کی وصیت کرتے ہیں۔ کیونکہ :

"مسلک حریت عام طور سے پوری دنیا میں اور خاص طور سے عالم عرب میں سب سے زیادہ منفعت بخش مسلک اور نظریہ ہے۔ اس میں فرد اور جماعت، عوام اور حکومت دونوں کے مفادات کے درمیان باہم سازگاری پائی جاتی ہے۔ فرد کے مفادات کی رعایت اس طرح ہے کہ مسلک حریت پر کاربند سیاسی نظام، انفرادی آزادی کے تمام مظاہر کی ضمانت فراہم کرتا ہے خواہ کام کرنے یا نہ کرنے کی آزادی ہو، فکر و نظر کی آزادی ہو، تحریر و تقریر اور تعلیم کی آزادی ہو، ان تمام آزادیوں کی یہ حکومت کفیل ہوتی ہے بشرطیکہ دوسروں کو نقصان نہ پہنچے اور کوئی نہایت ہنگامی صورت حال درپیش نہ ہو..... حکومت کے مفادات کا تحفظ اس طرح ہوتا ہے کہ مسلک حریت افراد کو طاقت ور اور مؤثر بناتا ہے اور حکومت کے سائے میں افراد ایسے بڑے بڑے کارنامے اور خدمات انجام دیتے ہیں جن کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا اور اس کی وجہ سے حکومت کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف آزادیٔ رائے کی وجہ سے ایک مطلق العنان اور خودسر حکومت کے نتائج اور نقصانات سے بھی وہ محفوظ رہتی ہے"۔(۵۲)

احمد لطفی السید نے عربوں کی اخلاقیات پر گفتگو کرتے ہوئے آزادی و حریت کے تصورات پر بہت زور دیا ہے۔ انہوں نے عالم عرب کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر طرف مطلق العنانی اور آمریت کا راج ہے اور اس کے نتیجے میں قومی سطح پر مایوسی و ناامیدی اور پست ہمتی پوری ملت کی صلاحیتوں کو گھن کی طرح کھا رہی ہے۔ اس مُزمن مرض کا علاج آزادی اور اس کے تصورات کے نفاذ کے سوا کچھ نہیں۔ نئی نسل حریت و استقلال کے سائے میں پروان چڑھے گی تو اس کے اندر خودداری غیرت اور اجتماعی شعور کے جذبات پیدا ہوں گے اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا۔ آمرانہ طرز حکومت میں اقدار و تصورات بھی اپنا معنی کھو دیتے ہیں۔ اس کے برعکس انسانوں کو آزادی حاصل ہو تو یہ اقدار و افکار اپنے عروج پر پہنچ جاتے ہیں۔(۵۳)

حقیقت یہ ہے کہ مصری استعمار کے دور سے لے کر عہد جدید تک مصر میں ایسے شاعروں، خطیبوں، قلم کاروں اور مفکروں کی کمی نہیں جنہوں نے آزادی کا نغمہ گایا اور اس کے حصول کے لئے ہر طرح کی قربانی دی۔ مگر شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ الجریدہ کے صفحات میں اس کے فاضل مدیر نے آزادی کے حق میں جو دلائل دیئے اور اس کے اثبات کے لئے جو زور بیان اور اسلوب نگارش استعمال کیا وہ بڑا ممتاز اور منفرد ہے۔ آزادی کے موضوع پر اتنی مؤثر تحریر احمد لطفی السید ہی کے قلم سے نکل سکتی تھی:

"آزادی ہماری زندگی کے لئے لازمی خوراک ہے۔ اگر ہماری زندگی روٹی اور پانی ہی سے کامیاب ہوتی تو آج ہم مستی کی زندگی گزار رہے ہوتے بلکہ اس سے کہیں زیادہ مطمئن اور خوش حال ہوتے۔ ہماری حقیقی خوراک جس کے بل پر ہم زندہ رہتے ہیں اور جس کی خاطر ہم زندگی کو عزیز رکھتے ہیں محض شکم سیری نہیں ہے بلکہ یہ خوراک عقل و قلب کا اطمینان ہے۔ اور ہمارے عقل و قلب اسی وقت مطمئن ہو سکتے ہیں جبکہ انہیں آزادی کی نعمت میسر ہو۔ ہم جب آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس سے ہمارے پیش نظر کچھ بہت زیادہ چیزیں نہیں ہوتیں۔ ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ ہم پر مردنی طاری نہ ہو۔ اس سے زیادہ صابر و شاکر مخلوق اور کون ہو سکتی ہے جو حیات اور وسائل حیات پر قناعت کرتی ہو۔ اسی طرح کسی زندہ مخلوق کے لئے سب سے کم تر درجہ کی شرافت اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ وہ زندگی سے اپنا حصہ وصول کرے.... حیرت ہے ان لوگوں پر جو زندگی اور آزادی کو دو الگ الگ چیزیں سمجھتے ہیں اور انہیں اس پر اطمینان نہیں ہوتا کہ آزادی ہی زندگی کا اولین عنصر ہے۔ اور اگر آزادی نہ ہو تو زندگی بے معنی ہے"۔(۵۴)

احمد لطفی السید حریت کے دلدادہ اور عاشق تھے۔ وہ ہر طبقہ، ہر جماعت، ہر پارٹی، ہر پیشہ اور ہر کام میں آزادی کو نافذ دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی نگاہ میں آزادی کے سب سے زیادہ مستحق اہل علم اور دانشور تھے۔ اسی لئے وہ ارباب علم پر یوروپ کی نقالی کو حرام تصور کرتے تھے اور خود اعتمادی پیدا کرنے اور اجتہاد و تجدد کی راہ اختیار کرنے کی انہیں دعوت دیتے تھے۔ اسی طرح وہ صحافیوں اور ادیبوں کو حکومت وقت سے چمٹے رہنے پر نکیر کرتے تھے:

"میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں بیسویں صدی کے کسی قلم کار کے لئے یہ ناگزیر نہیں ہے کہ وہ کسی سید کا لقمہ بنے اور محض اس کی خوشنودی کے لئے قلم اٹھائے.... اے صحافیو! یہ شکست خوردہ اور مظلوم امت کسی سلطان اور بادشاہ کے مقابلہ میں تمہاری جنبش قلم کی زیادہ محتاج ہے!"۔(۵۵)

نظریۂ عقلیت:

مصر میں جدید فکری بیداری کو عبداللطیف حمزہ نے چھ مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ یہ مراحل مصر اور عالم عرب کے مختلف فکری دھارے تھے جو ارباب علم و دانش کی توجہ کا مرکز بنے:

۱۔ روشن خیالی کا دور یعنی فرانسیسیوں کا حملہ، محمد علی کا ظہور اور ملک میں جدید علمی ترقیات کا دور۔

۲۔ دستور سازی کا دور یعنی ۱۸۷۶ء میں جب سلطان عبدالحمید کے زمانے میں مصری پارلیمنٹ قائم ہوئی اور اس کے بعد ۱۸۸۲ء میں عرابی انقلاب برپا ہوا۔

۳۔ مزاحمت کا دور۔ ایک وہ دور جب مصریوں نے ترکوں سے نجات حاصل کی اور دوسرا وہ دور جب انگریزی استعمار یہاں سے پسپائی پر مجبور ہوا۔

۴۔ عرب قومیت کا دور یعنی وہ دور جبکہ مصطفیٰ کامل کی قیادت میں سیاست داں، علماء، دانشور اور صحافی قومی تحریک آزادی کے پرچم تلے جمع ہوئی۔

۵۔ جامعہ اسلامیہ کے بعد جامعہ مصریہ کا دور جس میں عرب اتحاد کے نغمے الاپے گئے۔

۶۔ عقلیت کا دور (۵۶)

دور عقلیت کے ترجمان اور نقیب احمد لطفی السید ہیں۔ مصر میں ایک دور وہ تھا جب یونانی اور یوروپی تہذیب کی سختی سے مخالفت کی گئی اور ارباب علم و دانش کو ان تہذیبوں کی پیروی کرنے میں سراسر خسارہ اور نقصان نظر آیا۔ اس نقطۂ نظر کی ایک جھلک ہم کو محمد المویلحی (۱۸۴۶۔۱۹۰۶ء) کی تصنیف حدیث عیسیٰ بن ہشام میں نظر آتی ہے۔ یہ مصری قصہ یوروپی تہذیب کو یکسر مضطرب کر دینے کی دعوت دیتا ہے اور مصریوں نے مغربی تہذیب کی جو نقالی شروع کر دی تھی اس پر بھرپور وار کرتا ہے، مگر ۱۹۲۷ء میں جب اسی کتاب کا چوتھا ایڈیشن منظر عام پر آیا تو فاضل مصنف نے "الرحلة الثانية" کا اضافہ کیا۔ اس اضافہ میں قصہ کا ہیرو فرانس کا سفر کرتا ہے جہاں وہ اپنے مشرقی فلسفی دوست کے ساتھ مغربی تہذیب کے نقوش اور اس کے محاسن و فضائل کا بچشم خود مشاہدہ کرتا ہے۔ مصر واپس ہونے کے بعد وہ اپنے ہم وطنوں کو یوروپی تہذیب اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ قصہ کا یہ اضافہ اشارہ کرتا ہے کہ اب مصریوں کے اندر مغربی تہذیب کے تئیں سوچ میں تبدیلی آچکی ہے اور وہ اسے بالکل ہی مسترد کر دینے کے بجائے اس کی منفعت بخش چیزوں کو اختیار کرنے کے لئے آمادہ اور تیار ہیں۔ یعنی وہ اس نئی تہذیب کے ایسے پہلوؤں کو اپنانے پر آمادہ ہیں جو مصری زندگی کے لئے ترقی کا ذریعہ ثابت ہوں۔ اس دوسرے اور قدرے معتدل نقطۂ نظر کی ترجمانی سب سے پہلے ہمیں علی مبارک (۱۸۲۴۔۱۸۹۳ء) کے مشہور قصہ علم الدین میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد خذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول کی پیروی کرتے ہوئے متعدد ادیبوں، قلم کاروں، صحافیوں، عالموں اور دانشوروں نے مغربی تہذیب سے اخذ و استفادہ پر زور دیا جن میں احمد لطفی السید کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

عبد اللطیف حمزہ کے مطابق عقلیت پسندی کے اس رجحان کی تخم ریزی میں احمد لطفی السید کے یہاں مختلف اسباب و عوامل کار فرما نظر آتے ہیں جن میں فاضل مصنف کی اپنی ثقافت ان کے نفسی مزاج کے ساتھ مصر میں جاری سیاسی تجربات اور ملکی و قومی آزمائشوں کا بھی دخل ہے۔(۵۷)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احمد لطفی السید کے یہاں اسلامی ثقافت کے ساتھ یونانی اور جدید مغربی ثقافت کی بھی زبردست چھاپ موجود ہے۔ انہوں نے مسلمان فلاسفہ اور دانشوروں کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ یونانی ثقافت سے بھی وہ پوری طرح متأثر تھے اور اسی لئے ارسطو کی متعدد کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ مغربی تہذیب اور اس کے علوم وفنون سے بھی وہ پوری طرح سیراب ہو چکے تھے۔ عبد اللطیف حمزہ گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے خود فاضل مصنف کو ایک بار کہتے ہوئے سنا:

> "میں قدیم فلاسفہ ارسطو سے جس قدر متأثر ہوں اس سے کہیں زیادہ جرمن فلسفی کانٹ سے، فرانسیسی مصنفین والیٹر اور روسو سے اور نظریہ افادیت کے بانی اسٹوارٹ مل سے متأثر اور مرعوب ہوں۔ البتہ والیٹر نے میرا زیادہ وقت برباد کیا کیونکہ میں نے اس کی کتاب Diction-aire Philosophique کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا تھا۔ یہ ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیانی وقفہ کی بات ہے۔ ڈارون اور ٹالسٹائی کو میں نے طالب علمی کے زمانہ میں پڑھا تھا، بقیہ جو دوسرے فلسفی ہیں جیسے نانٹ، سینک، اسپینسر اور گستاؤلیبان تو میں نے پارلیمان کی رکنیت کے زمانہ میں ان کی تحریروں کو پڑھا، یہ سب اس وقت کا معاملہ ہے جب کہ میں صحافت کے میدان سے ابھی وابستہ نہ ہوا تھا"۔(۵۸)

یہ درست ہے کہ عقلیت کے میدان میں دوسرے مفکرین اور دانشور ایسے ہیں جو احمد لطفی السید سے بہت پہلے اس نظریہ کی ترجمانی کر چکے ہیں جیسے اسلامیات کے میدان میں محمد عبدہ کی عقلی تعبیرات و تفسیرات بہت ممتاز ہیں اور معاشرتی مسائل میں عبد اللہ الندیم اور علی مبارک کی خدمات بڑی قابل قدر ہیں مگر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فاضل مصنف نے الجریدہ کے صفحات پر نظریہ عقلیت کی جو ترجمانی کی ہے اور اس کے زلف و گیسو جس طرح سنوارے ہیں اس میں وہ نہایت ممتاز نظر آتے ہیں۔

حواشی و تعلیقات

(۱) سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸۔ ۱۸۹۷ء) کا شمار عالم اسلامی کی ممتاز ترین شخصیات میں ہوتا ہے، عالم اسلام میں بیداری اور وحدت اسلامی کے لئے آپ نے پوری زندگی وقف کر دی، مصر، ایران، ہندوستان، افغانستان، لندن، پیرس اور روس وغیرہ متعدد ممالک کے سفر کئے، غیر ملکی تسلط کے خلاف آواز اٹھائی اور ملک بدر کئے جاتے رہے۔ افغانی مشرق جدید کی تاریخ میں آزادۂ ایشیا کے پہلے مجاہد تھے۔ جن کے بصیرت نے ایک اسلامی بلاک کی ضرورت محسوس کی، انہوں نے تقلید جامد کے بر عکس اجتہاد کی راہ اپنائی اور مسلم ممالک میں مذہبی و سیاسی بیداری کی روح پھونک دی، تفصیل کے لئے دیکھئے، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، جلد ۷۔

(۲) محمد توفیق البکری (۱۲۸۷۔ ۱۳۵۱ھ / ۱۸۷۰۔ ۱۹۳۲ء) اپنے دور کے ایک عظیم شاعر اور ادیب تھے۔ ولادت اور وفات قاہرہ میں ہوئی۔ ۱۳۰۹ھ میں نقابۃ الاشراف کے سربراہ ہوئے اور مجلس شوری کے دائمی رکن متعین کئے گئے۔ دوبارہ یوروپ کا سفر کیا۔ فرانسیسی، ترکی اور انگریزی زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ خدیو عباس کے دور میں گردش زمانہ کے شکار ہوئے، اور ایک طویل مدت اسپتال میں گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ انہیں خدیو کی طرف سے ہمیشہ قتل کی سازش کے بروئے کار آنے کا خدشہ لگا رہتا تھا، پوری زندگی اسی بے چینی میں گزر گئی۔ آپ کی تصنیفات میں "أراجيز العرب"، "بيت الصديق"، "بيت السادات الوفائية"، "مستقبل للاسلام"، "فحول البلاغة" بہت مشہور ہیں، سلطان عبد الحمید نے جب جنگ یونان میں فتح حاصل کی تو ایک طویل قصیدے میں اسے مبارکباد دی جس کی وجہ سے آپ کو بڑی شہرت ملی۔ الزرکلی: الأعلام ۶ / ۶۵۔ ۶۶

(۳) سلیم تقلا (۱۲۶۵۔ ۱۳۱۰ھ / ۱۸۴۹۔ ۱۸۹۲ء) مشہور اخبار الأہرام کے بانی لبنان میں پیدا ہوئے۔ اپنے گاؤں کفر شیمہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر بیروت کے المدرسۃ الوطنیۃ میں تعلیم کی تکمیل کی۔ "مدخل الطلاب إلى فردوس لغة الأعراب" کتاب تصنیف کی۔ ۱۸۷۴ء میں اسکندریہ کا سفر کیا۔ عرابی انقلاب کے زمانہ میں اس کی حمایت نہ کرنے کی وجہ سے عوامی عتاب کا بھی شکار ہوئے۔ ان کا پریس جلا دیا گیا۔ وہاں سے بھاگ کر شام پہنچے پھر قاہرہ واپس آئے اور دوبارہ الأہرام جاری کیا، زندگی کے آخری ایام لبنان میں گزارے اور وہیں وفات ہوئی۔ الزرکلی: الأعلام ۳ / ۱۱۷۔ ۱۱۸۔

(۴) ولی الدین یکن (۱۲۹۰۔ ۱۳۳۹ھ / ۱۸۷۳۔ ۱۹۲۱ء) ترکی الاصل شاعر اور ادیب تھے۔ استنبول میں

پیدا ہوئے، والدین کے ساتھ بچپن ہی میں قاہرہ آگئے اور چھ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے، چچا نے پرورش کی، اخبارات و جرائد میں برابر مضامین لکھتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں سلطان عبد الحمید نے انہیں سیواس ملک بدر کر دیا اور ۱۹۰۸ء تک وہیں مقیم رہے، پھر مصر واپس آئے اور دو جلدوں میں اپنی جلاوطنی کی داستان المعلوم و المجہول کی اشاعت کی، آپ کا شعری مجموعہ بھی طبع ہو چکا ہے، ترکی اور فرانسیسی زبانوں میں مہارت حاصل تھی، الزرکلی: الأعلام ۸ / ۱۱۸۔

(۵) جرجی بن حبیب زیدان (۱۲۷۸۔ ۱۳۳۲ھ / ۱۸۶۱۔ ۱۹۱۴ء) مصر سے مجلّہ الہلال کو جاری کیا، کثیر التصانیف ادیب ہیں، ولادت اور تعلیم بیروت میں ہوئی، مصر منتقل ہوئے اور بیس سال تک الہلال نکالتے رہے، قاہرہ میں آپ کی وفات ہوئی، آپ کی کتابوں میں "تاریخ مصر الحدیث" (دو حصے)، "تاریخ التمدن الاسلامی" (پانچ حصے)، "تاریخ العرب قبل الاسلام"، "تراجم مشاهیر الشرق" (دو حصے)، "آداب اللغة العربية" (چار حصے) اور "تاریخ اللغة العربية" وغیرہ بڑی معروف ہیں۔ الزرکلی: الأعلام ۲ / ۱۱۷

(۶) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ج ۷، ص ۳۷۹۔ طبع اول ۱۹۷۱ء۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، حسین شاہد رزاقی، سید جمال الدین افغانی حیات و افکار، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۶۵۔ ۱۸۷

(۷) فرح انطون (۱۲۹۱۔ ۱۳۴۰ھ / ۱۸۷۴۔ ۱۹۲۲ء) مشہور صحافی اور محقق طرابلس میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی، ۱۸۹۷ء میں اسکندریہ آگئے اور مجلّہ "الجامعة" نکالا، چھے ماہ تک "صدی الاهرام" کی ادارت بھی کی، اپنی چچازاد روز انطون حداد کے لئے مجلۃ "السیدات" بھی شائع کیا، ۱۹۰۷ء میں امریکہ منتقل ہو گئے اور وہاں سے الجامعۃ کے نام سے ایک جریدہ نکالا، پھر مصر واپس آگئے اور مختلف مجلّات و جرائد کی ادارت میں شرکت کرتے رہے، قاہرہ میں انتقال ہوا، آپ کی تصنیفات میں مجلّہ الجامعۃ کی چھ جلدیں، ابن رشد و فلسفتہ، تاریخ المسیح (فرانسیسی سے ترجمہ) اور تقریباً ۲۵ ناول قابل ذکر ہیں، الزرکلی، الأعلام ۵ / ۱۴۱

(۸) احمد فارس الشدیاق (۱۲۱۹۔ ۱۳۰۴ھ / ۱۸۰۴۔ ۱۸۸۷ء) لبنان کے ادیب اور قلم کار تھے۔ مصر کا سفر کیا اور وہاں کے علماء سے ادب کا علم حاصل کیا، یوروپ کے مختلف ملکوں کے اسفار کئے، بیتونیسیا پہنچے تو آبائی مذہب عیسائیت کو ترک کر کے مسلمان ہو گئے، وہاں سے استنبول گئے اور کئی سال تک وہاں مقیم رہے، ۱۲۷۷ھ میں "الجوائب" جریدہ نکالا، وہیں آپ کی وفات ہو گئی، آپ کی تصنیفات میں "کنز الرغائب فی منتخبات الجوائب" (سات جلدیں)، "سر اللیال فی القلب والابدال" (علم لغت پر دو حصے)، "الواسطة فی

احوال مالطة" ، "كشف المخبا عن فنون أوربا" ، "الجاسوس من القاموس" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آپ کا ایک دیوان بھی ہے، جس میں بائیس ہزار اشعار ہیں، محمد احمد خلف اللہ نے آپ کی زندگی اور خدمات پر "احمد فارس الشدياق و آراء ه اللغوية والادبية" تحریر کیا ہے، الزرکلی، الأعلام ۱/ ۱۹۳

(۹) شیخ ناصیف الیازجی (۱۲۱۴۔ ۱۲۸۷ھ / ۱۸۰۰۔ ۱۸۷۱ء) اپنے زمانہ کے x شاعر تھے، لبنان کے گاؤں کفر شیمہ میں پیدا ہوئے اور بیروت میں وفات پائی، بارہ سال تک امیر بشیر الشہابی کی ملازمت کی پھر تدریس و تالیف کے کاموں کے لئے یکسو ہو گئے، مقامات کے طرز پر " مجمع البحرين" تصنیف کی، عربی زبان کے قواعد پر "فصيل الخطاب" علم صرف پر "الجواهر الفرد" علم نحو میں "نار القرى فى شرح جوف الفرا" آپ کی قابل ذکر تصانیف ہیں، النبذۃ الاولی، نفحۃ الریحان اور ثالث القمرین کے نام سے آپ کے تین دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ الزرکلی، الأعلام ۷/ ۳۵۰۔۳۵۱

(۱۰) انیس المقدسی: الاتجاهات الادبية فى العالم العربى الحديث، ص ۲۰، بیروت، الطبعة الأولى ۱۹۵۲ء

(۱۱) مصطفیٰ کامل: المسئلۃ الشرقیۃ، ص ۵

(۱۲) نفس مصدر، ص ۱۰

(۱۳) نفس مصدر، ص ۱۳۔۱۴

(۱۴) نفس مصدر، ص ۱۹۔۲۱

(۱۵) نفس مصدر، ص ۲۳

(۱۶) سلافۃ الندیم، ج ۲، الطبعة الأولى ۱۳۹۱ھ / ۱۹۰۱ء، مطبعة هندية، ص ۶۱

(۱۷) الدیوان، ج ۱، ص ۲۹۶

(۱۸) الدیوان، ج ۲، ص ۱۷

(۱۹) الدیوان، ج ۲، ص ۴

(۲۰) الدیوان، ج ۲، ص ۴۳

(۲۱) الدیوان، ج ۱، ص ۲۳

(۲۲) الدیوان، ج ۱، ص ۸

(۲۳)الدیوان، ج۱، ص ۱۴۷

(۲۴)الدیوان، ج۱، ص ۱۶

(۲۵)الدیوان، ج۱، ص ۱۲۹

(۲۶)دیوان عبدالمطلب، الطبعة الأولی ، مطبعة الاعتماد مصر ، ص ۹۳۔۹۴

(۲۷)الدیوان، ج۱، ص ۱۵۹۔۱۷۴

(۲۸)الدیوان، ص ۱۵۹۔۱۷۴

(۲۹)وطنیتی ، ص ۵۵

(۳۰)الدیوان، ج۱، ص ۲۸۷۔۲۹۵

(۳۱)الجریدة، شمارہ نمبر ۷۶، ۷/ ستمبر ۱۹۰۹ء

(۳۲)الجریدة، شمارہ نمبر ۱۶۱۷، ۲/ دسمبر ۱۹۱۲ء

(۳۳)الجریدة، ۹/ جنوری ۱۹۱۳ء

(۳۴)الجریدة، ۱۶/ جنوری ۱۹۱۳ء

(۳۵)احمد لطفی السید، مشکلة الحریات فی العالم العربی، دار الروائع، بیروت، ۱۹۵۹، ص ۹

(۳۶)نفس مصدر، ص ۱۰۔۱۱

(۳۷)نفس مصدر، ص ۱۳

(۳۸)نفس مصدر، ص ۲۱

(۳۹)نفس مصدر، ص ۳۱۔۳۲

(۴۰)نفس مصدر، ص ۳۴

(۴۱)نفس مصدر، ص ۳۷۔۳۸

(۴۲)نفس مصدر، ص ۴۸

(۴۳)نفس مصدر، ص ۴۹

(۴۴)نفس مصدر، ص ۵۳۔۵۴

(۴۵)جان لاک (John Locke)(۱۶۳۲۔۱۷۰۴ء)انگریز سیاسی فلسفی اور ماہر تعلیم تھے۔ جدید علوم

کی الہیاتی بنیادیں فراہم کیں۔ انگلینڈ اور فرانس میں عقلیت اور روشن خیالی کے دور کا آغاز کیا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دستور سازی کی تحریک پیدا کی۔ آج بھی مغرب کی زندگی اور فکر پر ان کے زبردست اثرات ہیں۔ ۱۶۶۵ء میں بیرونی ممالک میں سفارت کاری کے تجربات حاصل کئے، پھر ۱۶۶۷ء میں لارڈ ایشلے کے طبی مشیر بنے اور مختلف سائنس دانوں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ ۱۶۶۸ء میں رائل سوسائٹی کے رکن منتخب ہوئے اور اسی دور میں لبرل افکار و خیالات سے متاثر ہوئے۔ ۱۶۷۵ء میں ضیق النفس کے شکار ہوئے، اور علاج کے لئے فرانس کا رخ کیا، وہاں سول انجنیئرنگ میں دلچسپی لی اور اس میدان میں ہونے والی تحقیقات کا گہرا مطالعہ کیا۔ ۱۶۸۹ء میں اپنی مشہور تصنیف The Essay Concerning Human Understanding شائع کرائی اور مختلف فلسفیانہ مضامین پر مقالے لکھے۔ ۱۶۸۳ء سے ۱۶۸۹ء تک انہیں ہالینڈ میں رہنا پڑا، ۱۶۸۵ء میں وہ باغی قرار دیئے گئے، مگر ۱۶۸۹ء میں انہیں انگلینڈ واپسی کا موقع مل گیا۔ آخری عمر میں تصنیف و تالیف کے لئے یکسو ہو گئے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد ۷، ص ۴۳۵

(۴۶) مون ٹیسکو Montesquieu (۱۶۸۹۔۱۷۵۵ء) فرانسیسی سیاست دان اور فلسفی جن کی مشہور زمانہ کتاب "The Spirit of Laws" علم سیاست کے میدان میں شاہ کار تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۷۰۰ء میں گاؤں سے باہر اسکول بھیجے گئے جو پیرس کے قریب ایک آبادی میں واقع تھا، وہیں انہیں روشن خیالی اور جدت فکر کی تعلیم ملی۔ ۱۷۰۵ء میں یونیورسٹی آف بورڈکس کی لاء فیکلٹی میں داخل ہوئے اور تین سال کے بعد وہاں سے وکالت میں گریجویشن مکمل کیا۔ ۱۷۱۵ء میں شادی کی اور شادی میں جہیز میں ایک بڑی رقم موصول ہوئی۔ یہ رقم انہوں نے علمی اسفار میں خرچ کی۔ ۱۷۲۲ء میں اپنی کتاب Persian letters شائع کی جس میں پیرس کی تہذیب کی رنگا رنگی اور خوبصورتی کا حسین مرقع پیش کیا گیا تھا۔ ایک ماہر قانون اور وکیل کی حیثیت سے انہوں نے بڑا نام پیدا کیا۔ انگلینڈ پہنچ کر احباب اور قدر دانوں کا حلقہ کافی وسیع کیا۔ رائل سوسائٹی کے فیلو منتخب کئے گئے، وہاں پارلیمانی مباحثوں اور سیاسی جرائد پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ فری میسن سے وابستہ ہو گئے، انگلینڈ میں ان کا قیام ان کی ذہنی ساخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے قانون اور سیاست کے مختلف پہلوؤں پر مختلف کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۷۳۴ء میں ان کی ایک اور مشہور کتاب "Reflections on the Causes of the Grandeur and Declension of the Romans" شائع ہوئی۔ ۱۷۴۷ء میں ان کی مشہور زمانہ کتاب "روح قوانین" کا فرانسیسی ایڈیشن شائع ہوا۔ دو سال بعد اس کا انگریزی ایڈیشن بھی منظر عام پر آگیا۔ یہ کتاب ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ حکومت کی درجہ بندی اور ان کے درمیان اختیارات کی تقسیم، اعمال و فرائض

کی حد بندی اور جمہوری اقدار کی تشکیل ان کا اصل کارنامہ ہے، انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، جلد ۸، ص ۲۸۳۔۲۸۵

(۴۷) احمد لطفی السید: مشکلۃ الحریات، حوالہ بالا، ص ۵۹

(۴۸) نفس مصدر، ص ۶۰

(۴۹) نفس مصدر، ص ۶۸

(۵۰) نفس مصدر، ص ۸۱

(۵۱) نفس مصدر، ص ۸۳

(۵۲) نفس مصدر، ص ۹۰۔۹۳

(۵۳) نفس مصدر، ص ۱۱۸

(۵۴) مجلّہ المصور، ۱۷/ نومبر ۱۹۵۰ء

(۵۵) مقالہ "الحق الصراح"، الجریدہ، ۱۴/ مئی ۱۹۰۷ء

(۵۶) عبداللطیف حمزہ، ادب المقالة الصحفية فی مصر، الجزء السادس، حوالہ بالا، ص ۳۲۔۳۴

(۵۷) نفس مصدر، ص ۳۶

(۵۸) نفس مصدر، ص ۳۶۔۳۷

باب پنجم

ادب اور اسلوب کلام

ادبی موضوعات و مسائل

تاریخ و تنقید نگاری

اسلوب نگارش

ادبی موضوعات اور مسائل

مارچ ۱۹۰۷ء میں الجریدہ آسمان صحافت پر نمودار ہوا تو ملک میں مضمون نگاری اور مقالہ نگاری کی صحافت کی ابتداء ہو چکی تھی تنقید نگاری کا میدان کسی نمایاں مصری ادیب کی جولان گاہ سے تقریباً خالی تھا۔ الجریدہ کے عنفوان شباب ہی میں عربی ادب کی تاریخ کی ترتیب و تدوین اور مدارس و جامعات میں اس کی تدریس کا آغاز ہو گیا اور صنف تنقید نگاری نے بھی اپنی راہیں بنانی شروع کر دیں اور ایسے ادیب اور نقاد منظر عام پر آنے لگے جنہوں نے ان دونوں صنفوں میں اپنی وقیع خدمات کا آغاز کر دیا، مگر جس وقت الجریدہ کی ابتداء ہو رہی تھی اس وقت ان دونوں ادبی اصناف کے میدان تقریباً خالی پڑے تھے، البتہ مقالہ نگاری کی صنف میں متعدد ادیب اور قلم کار میدان صحافت میں اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ اس صنف میں الجریدہ کے پلیٹ فارم سے مختلف ادیبوں اور شاعروں اور مقالہ نگاروں نے اپنی ادبی خدمات سے مصر کو اور عالم عرب کو متعارف کرایا جن کی ایک طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔ ان ادیبوں میں مصری بھی تھے اور غیر مصری بھی، مرد بھی تھے اور خواتین بھی، جیسے عبدالرحمٰن شکری، احمد کاشف (۱)، عبدالحلیم المصری، احمد زکی ابو شادی، احمد شوقی، اسمٰعیل صبری، مصطفیٰ صادق رافعی، طٰہٰ حسین، عبدالعزیز صبری، امام العبد، عباس محمود العقاد، احمد نسیم، رشید مصوبع، نقولا رزق اللہ، ایلیا ابو ماضی (۲) احمد محرم، محمد عبدالمطلب (۳)، ابراہیم شہاب الدین، ابراہیم عبد القادر المازنی (۴)، حسن الغایاتی، فؤاد الخطیب (۵)، محمود عمار، حافظ ابراہیم، علی شوقی، رمزی نظیم، حسین شفیق المصری (۶)، مرسی شاکر الطنطاوی، مراد فرج وغیرہ وہ اہم ترین شعراء ہیں جنہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ مصر اور عالم عرب میں عوامی بیداری کی روح پھونکی۔ وہ مصنفین اور قلم کار جنہوں نے اپنے مضامین و مقالات کے ذریعے الجریدہ کے معیار کو آگے بڑھایا ان میں مندرجہ ذیل نام بڑے اہم ہیں، عبدالرحمن شکری، عبد الحمید حمدی (جریدۃ السفور والے)، عبدالحمید الزہراوی، عبد العزیز البشری (۷)، یوسف البستانی، محمد السباعی، عبد السلام ذہنی، ابراہیم رمزی، محمد حسین ہیکل، طہ حسین، ابراہیم المازنی، عزیز خانکی، نقولا الحداد، بہجت وہبی، عبد القادر حمزہ، توفیق دیاب، مصطفی عبد الرازق، سلامہ موسی وغیرہ، خواتین قلم کاروں میں لبیبۃ ہاشم (مجلۃ

فتاة الشرق) ،نبوية موسى (۸) ، باحثةالبادية (۹) (بنت حفنى ناصف) قابل ذکر ہیں۔

صاحب الجریدہ کے قلم سے مختلف موضوعات پر جو ادبی تخلیقات وجود میں آئی ہیں وہ خود بڑی قیمتی ہیں۔ احمد لطفی السید نے مظاہر فطرت، فکری مسائل اور مصری ماحول کے تعلق سے جو مقالے تحریر کئے ہیں وہ عربی ادب کے ارتقاء میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں، مثال کے طور پر ربیع الحیاۃ کے موضوع پر ایک مقالہ تحریر کیا جب کہ ایک دوسرے مقالہ کا موضوع زھرالربیع تھا،ربیع الحیاۃ مقالہ میں احمد لطفی السید نے انشاء پردازی کا جو کمال دکھایا ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو :(۱۰)

"رأيت صباح اليوم أزهار الربيع على أكمل ما تكون : إما فى أكمامها، و آثار الصحة بادية عليها ، و أما زهية قد مزقت أكمامها وسفرت عن حجابها بين بين ۰ لاهن سافرات خالعات العذار ، و لاهن متخذات شعوراً من الأكمام و الأفنان ۰ سفرن فكلهن قرة للعين ، ولذة للشم ، مبعث لحركات العواطف ، لا أعرف عن طريق اليقين الوجه فى جمال هذه الزهور ۰ ولكنها فى الواقع جميلة ۰ كذلك لا أعرف الصلة الخفية بين رؤية الأزهار و شمها و بين آيات الحب ، جلت حكمة الله أن تتناولها عقولنا ، ولكن الاستقرار دل على أن هذا النوع الإنسانى ، منذ نشأ إلى اليوم يتعشق الزهر ، و لا يطبب له مجلس لهو إلا إذا كان للزهر فيه المقام الأول، منثوراً أو منظوماً ، صحباً أو أشتاتاً ، بل كلنا يود أن يكون له بستان فيه زهر ۰ ومن لم يجد هرع وقت فراغه إلى الحدائق العمومية ۰ ومن لم يجد من الفلاحين أعجبه كثيرا أن يقيم وقت أنسه على قرب من زهر الفول ۰ ومن لم يجد اتخذ له صورة بستان ، أو خيال بستان من الزهر فى آنية من الفخار ، يضع فيها القرنفل والورد فى شبابيك داره ۰ بل أصبح من القضايا البديهية أن الدلالة الوضعية على رقى أمة عنايتها بالزهر و استمتاعها به الخ"

(میں نے آج صبح موسم بہار کے پھولوں کو ان کے جوبن پر دیکھا یا تو وہ اپنے غلافوں میں بند تھے، اور ان کی صحت اور جوانی پھوٹی پڑ رہی تھی، یا وہ کھل چکے تھے ان کے غلاف تار تار ہو چکے تھے اور بے حجابانہ اٹکھیلیاں کر رہے تھے، مگر یہ بالکل ہی بے پردہ نہ تھے کہ بدن پر ایک ہلکی سی تار بھی نہ ہو اور نہ آستین اور دامن کی گرہوں میں بالکل پابہ زنجیر تھے۔ پھولوں کا نمود آنکھوں کی ٹھنڈک اور باعث لذت و فرحت تھا یہ جذبات و عواطف کو برانگیختہ کر رہے تھے۔ میں ان پھولوں کے حسن و جمال کی ظاہری شکل کو پوری قطعیت اور یقین سے بیان نہیں کر سکتا مگر فی الحقیقت وہ بڑے خوبصورت تھے۔ پھولوں کی دل فریبی ان کی خوشبو اور محبت کو نشانیوں کے درمیان مخفی تعلقات کا بھی مجھے علم نہیں، بس حکمت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ ہماری عقلیں اسے سمجھ سکیں۔ البتہ استقلال بتاتا ہے کہ نوع انسانی اپنی ابتدا سے لے کر آج تک پھولوں کی دلدادہ رہی ہے اور کوئی بھی تفریحی مجلس یا تقریب اسے بھلی نہیں لگتی جب تک کہ اس میں پھولوں کو خاص مقام حاصل نہ ہو۔ خواہ پھولوں کو لٹایا جائے یا ہار بنا کر انہیں پہنایا جائے بلکہ ہم سب کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش ہمارے پاس کوئی باغ ہوتا جس میں پھولوں کی بہار ہوتی، اور جو شخص اتنا وقت نہیں پاتا ہے کہ خود باغ لگا سکے وہ پبلک گارڈن کی طرف بھاگتا ہے۔ اور کسانوں میں سے جن لوگوں کو وقت نہیں ملتا وہ پھولوں کے پاس تھوڑا سا وقت گزارنے کو بھی بڑا دل پسند خیال کرتے ہیں اور جنہیں اتنی بھی فرصت نہیں ملتی وہ گملوں میں پودے لگا کر کسی باغ کی خیال آرائی سے دل بہلاتے ہیں ایسے لوگ کھڑکیوں پر یا دروازے کے قریب گلاب اور لونگ کے پودے لٹکا لیتے ہیں بلکہ اب تو یہ بات قطعیت کی حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ کسی قوم کی ترقی کی ظاہری علامت یہ ہے کہ وہ پھولوں سے کتنی دلچسپی لیتی ہے اور ان سے کس قدر لطف اندوز ہوتی ہے الخ)

زهر الربيع کے عنوان سے انہوں نے جو انشاء پردازی کی ہے اس کا ایک نمونہ حسب ذیل ہے :(۱۱)

"ليس كل الحياة شقاء للسعي إلى مال ينفق أو يدخر ، و إلى مبارأة في رفعة المناصب ، بل الحياة أيضا استمتاع بجمال الطبيعة ، فكرة خفيفة الوزن تافهة القيمة عند أهل الوقار ! فإن الحال قد تبدلت إلى صرف النظر عن جمال

الطبيعة ، و نعيم الحياة الانسانية إلى أحسن أطراف هذه الحياة ۰ الحرص على الخدمة فى الحكومة ، والحرص على فقد الحرية فى كل شئ ؛ حتى فى الملذات البريئة ، حتى فى الاشتغال بتربية ملكة الجمال ۰ حتى فى العناية بغرس الأشجار ، و توليد الأزهار ، الحرص على فقد الصراحة فى كل شئ حتى فى الأعمال الشخصية اريد ..... كل ما خلقت تابع لقانون التطور ، حتى المعانى والأفكار .....ها نحن أولاء أمام الربيع ۰ أزهار تبتسم أنفاسها ، و تأخذ بأبصارنا ألوانها و تحرك جدتها عواطف الحنان فى قلوبنا ، كأنها بعض أبنائنا ، إن مرآها و ريّاها ينقلان نفوسنا من عالم الشقاء إلى عالم النعيم ، ومن أرض الحقيقة الواقعة إلى سماء الخيال الجميل الخ ۰ علموا أبناءكم حب الجمال ، نموا فى نفوسكم ملكته ، ليعلموا أن الحياة ليست جحيم الهموم ۰ و لكن لمحات من النعيم ، إن حب الجمال يرفع النفس إلى لذائذ أطهر طبعا، و أسعد أثرا ، وابقى فى العواطف نتيجة من كل ما عداه من لذائذ الحياة ۰ و إن أبسط موضوع لتعرف الجمال ، والمران به : أزهار الربيع" ۰

(زندگی بس اس دوڑ دھوپ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والی نامرادی ہی کا نام نہیں ہے کہ انسان مال جمع کرنے یا خرچ کرنے کے لئے حاصل کرنے کی دوڑ بھاگ کرے اور بلند عہدوں اور مناصب کے لئے مسابقت میں لگا رہے بلکہ زندگی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان فطرت کی خوبصورتی و رعنائی سے لطف اندوز ہو۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو سنجیدہ لوگوں کے نزدیک بالکل بے وزن اور بے قیمت ہے۔ فطرت کی رعنائی اور انسانی زندگی کی نعمت اور دل ربائی سے نظریں بچا کر اب لوگ اس زندگی کے خوبصورت تر پہلوؤں کی جانب دیکھنے لگے ہیں۔ اب لوگ حکومت کی ملازمت ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے اور ہر چیز میں آزادی سے محرومی ہی کو ترجیح دینے لگے ، یہاں تک کہ صاف ستھری تفریحات، قوت حسن و جمال کی نشو و نما یہاں تک کہ شجر کاری اور نرسری لگانے کے نجی عمل اور

مصروفیات میں بھی آزادی سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہر چیز میں یہاں تک کہ ذاتی کاموں میں بھی صراحت اور کھلے پن سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جن کے تمام اعضاء و جوارح تبدیلی کے قانون کے تابع ہیں، یہاں تک کہ افکار و معانی کی دنیا میں بھی وہ مقلد محض ہیں..... آج ہم لوگ موسم بہار کی رعنائیوں کا سامنا کر رہے ہیں ہر چہار جانب پھولوں کی مسکراہٹ ہے، ان کے رنگ ہماری نگاہوں کو فرحت بخش رہے ہیں، ان کی تازگی ہمارے دلوں میں جذبات محبت کو حرکت دے رہی ہے جیسے وہ ہماری اولاد ہوں۔ ان کی دل فریبی خوش منظری اور تازگی ہمیں بدبختی کی دنیا سے نکال کر نعمت اور خوش حالی کی دنیا میں پہنچا رہی ہے۔ ہم حقیقت کی تلخیوں سے خوبصورت اور دل فریب خیال کی دنیا میں سفر کر رہے ہیں.....اپنے بچوں کو خوبصورتی سے محبت کرنا سیکھاؤ۔ اپنے دلوں میں رعنائی سے دلچسپی کی پرورش کرو، تاکہ معلوم ہو کہ یہ زندگی غم والم کے تھپیڑوں ہی کا نام نہیں ہے بلکہ نعمت و خوشحالی کے فرحت بخش جھونکوں سے بھی عبارت ہے۔ خوبصورتی سے محبت انسان کو ایسی لذتوں سے آشنا کرتی ہے جن کی فطرت میں پاکیزگی ہوتی ہے، جن کے اثرات بڑے مبارک ہوتے ہیں اور دنیا کی تمام لذتوں سے کہیں زیادہ جذبات و احساسات کو جھنجھوڑتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جمال اور رعنائی سے آگاہی کے لئے سب سے بڑا اور وسیع موضوع موسم بہار کے پھول ہیں)

احمد لطفی السید نے دوسرا اہم موضوع جس کے تحت متعدد مقالات و مضامین تحریر کئے الریف المصری (مصری کسان) ہے۔ مصر کے قلم کاروں اور صحافیوں میں آپ کو یہ سبقت حاصل ہے کہ سب سے پہلے آپ نے کسان کے مسائل اور اس کی ضروریات اس کے احترام و تکریم اور پوری قوم پر اسے ترجیح دینے کی جانب تعلیم یافتہ طبقہ کو متوجہ کیا۔ لطفی السید کے ایسے مضامین کی تعداد بہت ہے جن میں مصری کسانوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ یہاں نمونہ کے طور پر ان کے ایک مضمون کے چند اقتباسات دیئے جا رہے ہیں۔ مضمون کا عنوان ہے جنی القطن (۱۲)(روئی کی کاشت) اس مضمون میں فاضل مصنف انشاء پردازی کا کمال اس طرح دکھاتے ہیں:

"ليس أجمل من العمل إلا جنى ثمراته ، وما أسعد صباح الجنائين ، يتنادون فيجتمعون ، و يتفقد بعضهم بعضاً ثم يسيرون ، يمشون فى طلعة الشمس جماعات جماعات مستبشرين : رجالا ، ونساء و فتيانا و فتيات ، و

صبيانا ، وصبيات ۰ يأخذون معهم مواشيهم ، تأكل تحت أعينهم من حشيش الأرض ، تتبعهم كلابهم ايضاً ، فنكاد العائلة لا تتخلف فى البيت إلا من يصلح لهم الطعام ۰

ترى الأطفال و قد خفت من الفرح جسومهم الصغيرة فهى تنط من هنا إلى هنا ، و تثب ، و تتلفت ۰ يضحكون من لاشئ ، يغنون طربين بأنهم تركوا المألوف من تفرق العائلة بكرة النهار ۰ كل إلى عمله بعيدا عن الآخر، تسنح هذه العادة يوم جنى القطن ۰ إذ يذهب جميع افراد العائلة بجملتهم إلى المزرعة ، يتسابقون فى الجنى و تتبارى فتياتهم فى الغناء ۰ و بتنافسهم فى إجادة النكتة الجميلة يضحك الجميع !

إن هذا المنظر الجميل لأولئك الرفقات المستبشرة لا يدع مجالا للشك فى أن جنى القطن هو موسم سعادة الزارعين" ۰

(کسان کا سب سے خوبصورت کام پھلوں کو توڑنا اور پھلوں کے توڑنے والوں کی صبح کتنی خوشگوار ہوتی ہے ! صبح ہی ایک دوسرے کو آوازیں دیتے ہیں ، ایک جگہ جمع ہوتے ہیں ، ایک دوسرے کو تلاش کرتے ہیں پھر چل پڑتے ہیں۔ سورج نکلتے ہی گروہ در گروہ ہشاش بشاش نکل کھڑے ہوتے ہیں ، مرد ، عورت ، دوشیزائیں ، نوجوان لڑکے ، لڑکیاں سب مل کر ہاو ہو کرتے ہیں۔ اپنے ساتھ مویشیاں لیتے ہیں جو زمین پر پڑے ہوئے پتے اور گھاس بھوس چر چگ لیتے ہیں۔ ان کے پیچھے کتوں کی قطار بھی ہوتی ہے۔ گھر میں خاندان کا وہی فرد بچتا ہے جسے کھانا بنانا ہوتا ہے۔

بچے خوشی کے مارے ہلکے پھلکے نظر آتے ہیں ادھر ادھر کودتے پھاندتے ہیں بلاوجہ قہقہہ لگاتے ہیں۔ مستی میں گاتے ہیں کہ صبح صبح ہی گھر بار کو چھوڑ دیا ہے۔ ہر ایک دوسرے سے دور اپنے کام میں مگن ہے۔ یہ معمول روئی کاشت کرنے کے دن عروج پر پہنچ جاتا ہے جب کہ خاندان کے سارے افراد کھیتوں میں جا پہنچتے ہیں وہ بڑھ بڑھ کر پھلی توڑتے ہیں۔ لڑکیاں گانے میں مقابلہ کرتی ہیں اور خوبصورت آواز کو سریلی بنانے کی مقابلہ آرائی میں سارے لوگوں کا قہقہہ ابل پڑتا ہے۔

ہشاش بشاش ٹولیوں کا یہ دل فریب منظر بلاشبہہ یہ ثابت کرتا ہے کہ روئی کی پھلی توڑنے کا موسم کسانوں کی خوش حالی اور فرحت بخشی کا موسم ہے)۔

جن فکری اور معنوی مضامین پر احمد لطفی السید نے قلم اٹھائے ہیں وہ بڑے متنوع اور ہمہ رنگ ہیں فکر و خیال کی ہر وادی میں فاضل مصنف نے سفر کیا ہے اور اپنے معاون قلم کاروں کے ساتھ تقریباً ہر میدان سے متعلق موضوعات پر تحریریں چھوڑی ہیں۔ یہ تحریریں عظیم فکری اور ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کا ایک مقالہ الصداقة (۱۳) کے موضوع پر ہے جس میں مصنف نے بڑے نادر اور انوکھے پیرائے میں دوستی کے متعلق اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔

ان کا دوسرا مقالہ الرجل السعید (۱۴) کے موضوع پر ہے جس میں خوش حال اور مطمئن شخص کی عکاسی کی گئی ہے۔ خوش حالی کے موضوع پر مصنف نے بڑے خوبصورت خیالات ظاہر کئے ہیں، ذیل کی عبارت بطور مثال ملاحظہ ہو:

"فالرجل السعيد هو من يعرف أن يرضى بحاله . فليست السعادة هى النزوة ، ولا الاستمتاع بها . وليست هى الجاه ، ولا آثاره . وليست هى الحب ، لا لذاته . وليست هى العلم ، ولا نوره ، ولا منافعه . وليست هى النباهة ، ولا كبرياؤها . وليست هى الخمول ، ولا انزواؤه ، وتعطيله . وليست هى الحكم . و لا قدرته ، وليست هى الجمال ، ولا شفاعته . وليست هى الظروف ، ولا خفته . وبعيد أن تكون هى العقل و حسابه ، إن لم تكن هى الخيال و أوهامه . ليست السعادة شيئاً من ذلك ، ولا هى كل ذلك ، بل السعادة ظن السعيد أنه سعيد!" .

(خوش بخت اور خوش حال شخص وہ ہے جو راضی برضا رہنا جانتا ہو۔ خوش حالی کسی خواہش نفس کے وجود میں آنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا نام نہیں ہے، خوش حالی جاہ و منصب اور اس کے نتائج کو بھی نہیں کہتے، نہ خوش حالی محبت اور خود پسندی سے عبارت ہے، علم اس کی روشنی اور اس کے فوائد بھی خوش حالی کے ترجمان نہیں ہیں۔ نہ خوش حالی نام ہے، اعجاب نفس

اور گھمنڈ کا۔ نہ خوش حالی آتی ہے گمنامی، بے کاری اور پژمردگی سے خوش حالی کا محرک حکومت اور اس کی طاقت بھی نہیں ہے، نہ خوش حالی حسن و جمال اور اس کی سفارش سے وجود میں آتی ہے۔ حالات اور ان کی آسانی کے نتیجہ میں بھی خوش حالی وجود پذیر نہیں ہوتی اور عقل اور اس کے حسابات سے تو خوش حالی آ ہی نہیں سکتی اور نہ خیال اور اوھام کے نتیجہ میں خوش حالی پیدا ہوتی ہے، در حقیقت ان میں سے کسی چیز کا نام خوش حالی نہیں ہے، بلکہ خوش حالی یہ ہے کہ ایک خوش حال شخص اپنے کو خوش حال تصور کرے)۔

لطفی السید کا ایک تیسرا مقالہ "اول العام" (۱۵) کے موضوع پر ہے۔ جس میں ان کی انشاء پردازی اور فکری گہرائی نمایاں ہے وہ لکھتے ہیں:

أول العام

"بالناس فی الجدید رغبة، وإلیه شوق . نفرح بالعام الجدید، والشهر الجدید . کان حاضرنا یثقل علینا حمله . نرغب فی الفرار منه إلی غیره . أو لأن النفوس شیقة إلی معرفة ما یکنه المستقبل فی الصحائف المطویة وراء حجب الغیب، وفی ظرف الزمان نستبطئ الحاضر، ونستعجل المستقبل . وهو الذی نرجو أن یحقق فیه کل امرئ آماله و أمانیه . و ما أول العام إلا باب هذه المسافة الزمنیة . لذلك کان استقباله عندنا عیداً من الأعیاد الخ" .

(لوگ ہر نئی چیز میں دل چسپی لیتے اور وار فتگی کے ساتھ اسے دیکھتے ہیں۔ ہم نئے سال اور نئے مہینہ پر خوشیاں مناتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا حال ہمیں بوجھل بنائے ہوئے ہے جس سے ہم فرار حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں یا اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان غیب کے پردہ میں چھپے ہوئے حالات و واقعات پر مشتمل مستقبل سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے پریشان اور مضطرب ہوتا ہے۔ زمانہ کے پس منظر میں ہم حال کو پیچھے چھوڑنا چاہتے ہیں اور مستقبل کی طرف لپکنے کے آرزو مند ہوتے ہیں کیوں کہ مستقبل میں ہر شخص اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کو حقیقت کے روپ میں جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔ سال کا پہلا دن اس زمانی مسافت کو کھولنے کا دروازہ ہے۔ اسی لئے

ہمارے نزدیک اس کا استقبال کسی جشن کی طرح ہوتا ہے الخ)

تاریخ و تنقید نگاری

احمد لطفی السید نے ادب عربی کی تاریخ اور تنقید نگاری کے مسائل اور مباحث بھی الجریدہ کے صفحات میں اٹھائے اور مصطفیٰ صادق رافعی اور ڈاکٹر طہ حسین کے دونوں گروہوں کے مقالات اور مباحثے اس میں شائع کئے۔ مدارس وجامعات میں عربی ادب کی تاریخ کی تدریس کا مسئلہ سامنے آیا تو مصطفیٰ صادق رافعی نے الجریدہ، ۱۱/ مارچ ۱۹۰۸ء کے شمارہ میں ایک مقالہ شائع کیا اور جب ان کی مشہور زمانہ کتاب تاریخ آداب العرب منظر عام پر آئی تو جامعات میں ادب کی تدریس کے مسئلہ پر علمی معرکہ آرائی الجریدۃ میں شروع ہو گئی۔ ایک طرف رافعی اور ان کے حامیوں نے اپنے مضامین شائع کرائے تو دوسری طرف طہ حسین، محمد حسین ھیکل اور دوسرے تجدد پسند ادیب بھی میدان صحافت میں اتر آئے۔ ۴/ مئی ۱۹۱۱ء کے الجریدہ میں "غیور علی الادب" کے نام سے ایک مضمون نگار نے اس بحث کا آغاز کیا جس میں اطالوی مستشرق کا روئلو نللینو کے طرز تدریس پر تنقید کی۔ ۶/ مئی ۱۹۱۱ء کے شمارہ میں طہ حسین نے "الآداب العربیۃ بالجامعۃ" کے عنوان سے اپنے مقالہ میں حفنی ناصف اور مستشرقین کے منہاج تدریس کا دفاع کیا۔ ۸/ مئی ۱۹۱۱ء کے شمارہ میں "غیور علی الادب" کے لقب والے مضمون نگار نے پھر ایک مقالہ لکھا اور عربوں کی تاریخ ادب کی مدح سرائی کی اور مستشرقین پر تنقید کی۔

۴/ مارچ ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں احمد لطفی السید نے خود مصطفیٰ صادق رافعی کی کتاب پر ایک مقالہ تحریر کیا اور اس کتاب کے مباحث اور منہاج تحریر کو سراہا، اس مقالہ میں فاضل ناقد نے رافعی کے نفس مضمون پر متبحرانہ نظر کی تحسین کی اور ان کے اسلوب نگارش کو متأخر عرب ادیبوں کے عجمی اثرات اور آمیزوں سے محفوظ قرار دیا اور انہیں ایسا محسوس ہوا کہ مشہور عربی ادیب المبرد (۱۶) کی تحریریں پڑھ رہے ہوں۔

> (ادب کو بعض کم نظر محض تفریح طبع کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور افسانوں اور ناولوں کو وقت گزاری کا وسیلہ قرار دیتے ہیں جبکہ در حقیقت ادب یہ نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ادب اور تاریخ ادب امت کی تشکیل میں قوی ترین عنصر کا کام کرتے ہیں۔ ادب کسی قوم کے ماضی کو اس کے حال سے جوڑتا ہے اس کی ماہیت کی تعیین کرتا ہے اور دوسری اقوام سے ممتاز و منفرد کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں قوم کا تشخص، استمرار و تسلسل کا حامل بنتا ہے اور افراد قوم کے درمیان اتحاد و یگانگت کا

دائرہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے اور ان کے درمیان باہمی تعاون کے جذبات و روابط مستحکم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مزید بر آں ادب انسان کے جذبات میں نرمی اس کے ذوق میں رعنائی پیدا کرتا ہے اور افکار و جذبات کی خوبصورت ترجمانی پر انسان کو قادر بناتا ہے۔ عوام کو حسن التفات پر آمادہ کرتا اور ادیب کے نظریہ کو قبول عام عطا کرتا ہے۔(۱۷)

مصطفیٰ صادق رافعی کی کتاب پر تبصرہ شائع ہی ہوا تھا کہ مختلف ادیب اور قلم کار میدان میں کود پڑے، پھر تو خود طہ حسین نے "نحن والرافعی" کے موضوع پر مقالات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا جو الجریدہ ۱۳، ۱۸، ۲۰/ جنوری ۱۹۱۳ء کے شماروں میں شائع ہوا۔ یہی مرحلہ ہے جب طہ حسین اپنے مخصوص رجحانات کی وجہ سے اور عربی ادب اور تنقید نگاری کے میدان میں اپنے منفرد خیالات کی وجہ سے مشہور ہوئے، الجریدہ ۵، ۶، ۷/ نومبر ۱۹۱۱ء کے شماروں میں ان کے مقالات کا ایک نیا سلسلہ "هل تسترد اللغة مجدها القديم" کے عنوان سے طبع ہوا۔ اس کے بعد الجریدہ کے شمارہ ۳۱/ اکتوبر ۱۹۱۱ء میں منشأ الفتن الاسلامية، یکم نومبر ۱۹۱۱ء کے شمارہ میں الآداب العربية في ايام بني العباس، ۲۶/ اپریل ۱۹۱۳ء اور ۱۰/ مئی ۱۹۱۴ء کے شماروں میں "في اللغة" کے عنوان سے اور ۱۹، ۲۱، ۲۶، ۲۹/ جنوری اور ۲۴، ۷، ۸/ فروری، ۸/ مارچ ۱۹۱۴ء کے شماروں میں "حياة الادب" کے عنوان سے مقالات شائع ہوتے رہے، ان میں ۲۵/ جنوری ۱۹۱۴ء کے الجریدہ میں شائع ہونے والے مضمون "الجامعة والنهضة" کے مباحث پر مصر اور عالم عرب میں سب سے زیادہ رد و قدح ہوئی۔

مصطفیٰ صادق رافعی کی کتاب شائع ہونے کے بعد جرجی زیدان کی تصنیف "تاريخ آداب اللغة العربية" اور شیخ احمد سکندری کی تخلیق "تاريخ آداب اللغة" بھی منظر عام پر آئی مگر مصطفیٰ صادق رافعی کی تصنیف پر حمایت و مخالفت اور تعریف و تنقید میں ادیبوں اور قلم کاروں نے جس گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اس نے بعد کی تمام تحریروں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ عربی ادب میں تاریخ ادب عربی اور تنقید نگاری کے میدانوں میں شہرۂ آفاق ادیبوں، صحافیوں اور قلم کاروں نے جو مسائل اٹھائے اور اپنی وقیع تحریریں چھوڑیں اور ادب عربی کو نئے موضوعات اور نئے مسائل سے جس طرح مالا مال کیا اس میں سب سے بڑا حصہ احمد لطفی السید کے رسالہ الجریدہ کا ہے، جس نے ان ادبی اور علمی موضوعات پر ادیبوں اور محققین کو اظہار خیال کی دعوت دی اور ان کے افکار و نظریات کو مصری عوام تک پہنچایا۔

اسلوب نگارش

مصر اور عالم عرب کے جدید ادب صحافت اور افکار و نظریات پر جن ادیبوں، مفکرین اور صحافیوں کا زبردست اثر پایا جاتا ہے اور جن کی شخصیت اور فکر نے رجحان سازی کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے ان میں احمد لطفی السید کا نام نمایاں ہے۔ استاد علی یوسف کو جدید مصری صحافت کا نقیب اول قرار دیا جاتا ہے اور مصطفیٰ کامل عرب قومیت اور وطنیت کے پیغمبر مانے جاتے ہیں اسی طرح احمد لطفی السید کو عالم عرب میں تصور جامعہ اور نظریۂ عقلیت کا اولین علم بردار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایک دور وہ تھا جب رفاعہ طہطاوی نے مغربی تہذیب کو من و عن اختیار کرنے کی دعوت بڑے اخلاص اور دردمندی سے دی تھی، اسی طرح زیر بحث مفکر نے عقل انسانی کے احترام اور حریت فکر کی بھرپور ترجمانی کی۔ ان کے حق میں عقلی دلائل دیئے، ان پر وارد ہونے والے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ کیا اور معاشرہ میں انہیں نافذ دیکھنے کے لئے عمر بھر ریاضت و مجاہدہ کیا، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں پر تعقل، وقار و متانت، تدریج و تفکیر اور ابتکار و تجدد کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

میدان صحافت میں اخبار اللواء کے فاضل مدیر اور قائد تحریک قومی مصطفیٰ کامل پاشا کے اسلوب اور زیر بحث مفکر کے اسلوب میں اسی وجہ سے نمایاں فرق ہے، اللواء نے اپنی شعلہ بار اور ہنگامہ خیز تحریروں کے ذریعہ معاشرہ میں ہلچل پیدا کی اور مصری عوام کو انگریزی استعمار کے خلاف تن من دھن قربان کر دینے پر آمادہ کیا، جبکہ احمد لطفی السید نے اپنی سنجیدہ اور دانشورانہ گفتگو سے دماغوں کو اپیل کیا اور مخالفین کو قائل کرنے کی کوشش کی اسی طرح المؤید کے مدیر استاد علی یوسف کا اسلوب بھی صاحب ممدوح کے اسلوب سے مختلف نوعیت کا ہے۔ المؤید کے مدیر علماء ازہر کی ادبی و دینی ثقافت کے وارث اور امین تھے، جس میں کسی خارجی ثقافت کی کوئی آمیزش نہ تھی۔ جب کہ احمد لطفی السید نے علم و فن کے تمام سرچشموں سے فیض حاصل کیا تھا۔ انہوں نے قدیم یونانی ثقافت اور جدید مغربی تہذیب کا بھرپور مطالعہ کیا تھا اور بڑی حد تک ان سے متأثر تھے۔ اسی لئے ان کے اسلوب پر مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

مصباح الشرق کے مدیر ابراہیم المویلحی کا اسلوب بھی زیر بحث فاضل مفکر کے اسلوب سے مختلف ہے۔ مویلحی نے جس اسلوب کی نمائندگی کی ہے اس میں الفاظ کی تراش خراش اور اظہار کے نت نئے زاویوں پر بڑی توجہ دی جاتی تھی۔ اس اسلوب میں نکتہ آفرینی بلاغت اور قافیہ بندی کی رعایت ہمیشہ کی جاتی تھی جبکہ احمد لطفی السید نے جو صحافتی انداز اختیار کیا اور جس ادبی مقالہ کی علم برداری کی ہے اس میں وضاحت و صراحت سہولت اور عام فہمی اور آزادیٔ اظہار اور عقلی انداز فکر کو نمایاں مقام دیا گیا ہے گویا دور جدید میں مقالہ نگاری اور صحافت کا جو عام معیار بن گیا ہے اس کی جانب احمد لطفی السید نے پیش رفت کی ہے۔

احمد لطفی السید کی تمام تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے اندر مندرجہ ذیل خصوصیات نمایاں نظر آتی ہیں ان خصوصیات پر تفصیلی گفتگو عبد اللطیف حمزہ نے کی ہے :

۱۔ حقیقت پسندی۔ وہ ملکی اور قومی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اشتعال جذباتیت، ہیجان انگیزی اور شعلہ بار طرز تکلم سے پرہیز کرتے ہیں۔ خیالی دنیا کی سیر کرنے کے بجائے حقائق کو ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور مثالیت کے بجائے حقیقت پسندی کے نصب العین کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔ قومی اور بین الاقوامی واقعات اور سرکاری اور غیر سرکاری بیانات پر دھیمے انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور قاری کو عقلی دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۲۔ منطقی استدلال۔ انہوں نے قدیم منطق اور جدید فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کے اثرات ان کی تحریروں میں بھی موجود ہیں۔ منطق کے بہت سے الفاظ اور اصطلاحات ایسے ہیں جن کا صاحب ممدوح نے بکثرت استعمال کیا ہے جیسے جوہر، عرض، کیف و کم، قیاس منطقی، دوران منطقی وغیرہ۔ وہ گفتگو کرتے ہوئے مقدمات ترتیب دیتے ہیں اور پھر نتیجہ نکالتے ہیں۔ تحلیل و تجزیہ کرتے ہیں، دلائل و شواہد کے انبار لگا دیتے ہیں اور بعینہٖ وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں جو ایک منطقی اور متکلم گفتگو کرتے ہوئے اختیار کرتا ہے۔

۳۔ عبارت آرائی سے گریز۔ وہ اتنے ہی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جس سے مدعا واضح ہو جائے۔ الفاظ کی تکرار، مترادفات کا استعمال اور صفات و تراکیب پر زور ان کے یہاں نہیں ملتا اور یہ سائنسی زبان کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ یہ اسلوب دوسرے ادیبوں اور صحافیوں کے یہاں بھی ملتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ احمد لطفی السید کی تحریروں کی تلخیص کرنا بہت مشکل ہے اور ان کے افکار و نظریات کو محدود اور مختصر الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں ہے۔ طول کلامی سے انہوں نے اسی وقت کام لیا ہے جب کہ وہ کسی مسئلہ کی تشریح کر رہے ہوں یا نئی فکر اور نظریہ کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ اسی لئے ان کی تحریروں پر خطابت کا رنگ کم ہی محسوس ہوتا ہے۔

۴۔ فاضل مصنف اپنی تحریروں میں اس بات کا خیال بہت کم کرتے ہیں کہ حروف ربط کے ذریعہ دو جملوں کو جوڑا جائے وہ مفہوم و معنی کی ترسیل میں اس قدر مصروف نظر آتے ہیں کہ انہیں جملوں کے درمیان ربط و تعلق کو واضح کرنے والے حروف کا احساس نہیں رہتا۔ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی مغربی ادیب کا کوئی مضمون پڑھ رہا ہے، جہاں جملوں کا دروبست نظریات و مفاہیم کے سامنے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ فاضل مصنف نظریہ و تصور کی تفہیم میں قاری کو اپنے ساتھ دوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور اسے اس نظریہ میں اتنا مصروف کر دیتے ہیں کہ جملوں کے فصل و

وصل کا ہوش وہ کھو بیٹھتا ہے۔

۵۔ معلوماتی اسلوب۔ یعنی ایسا اسلوب جس سے ادیب کی وسعت مطالعہ اور تنوع معلومات کا اظہار ہوتا ہو۔ فاضل مدیر کی تحریروں میں عربی ادب اور فکر کے حوالے تو کم ملتے ہیں لیکن یونانی اور مغربی مفکرین کی تحریروں کے اقتباسات جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ اسپینسر، مون ٹیسکو، جان جاک روسو، مکیاویلی (۱۸) اور ٹالسٹائی (۱۹) وغیرہ فلاسفہ کی تحریروں سے انہوں نے بہت استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح ارسطو وافلاطون اور دوسرے یونانی فلاسفہ کے نظریات سے بھی ان کی تحریریں مزین نظر آتی ہیں۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کسی فلسفی یا مفکر کی رائے اسی وقت نقل کرتے ہیں کہ جب کہ وہ اس کے موافق ہوں۔

۶۔ فاضل مصنف نے جابجا مقامی الفاظ اور مصری ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں، کہیں کہیں مغربی اور یوروپی الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جیسے "فابریقة"، "ماکینة"، "مودة"، "أوتوموبیل"، "بنطلون"، اسی طرح انگریزی زبان کی مخصوص اصطلاحات جن سے تعلیم یافتہ طبقہ ہی روشناس ہوتا ہے، بھی بکثرت استعمال ہوئی ہیں جیسے "اللیبر الیزم" (Liberalism) اور "البانسلامیزم" (Pan islamism) خالص مصری ترکیبوں کے لئے ان کے مندرجہ ذیل جملے دیکھئے:

"لم تبرهن حكومتنا الاستبدادية إلى الآن على أنها تريد مساعدتنا على وقتنا الاجتماعي والاقتصادي الخ" اس جملہ میں "مساعدتنا على وقتنا" خالص مصری ترکیب ہے۔ اسی طرح "مذهب الحرية مذهب مؤلف من طبائع الانسان، فهو أحسن ضمان للحكومة وللأمة في وقت معاً، أما المذاهب الأخرى فالاعتماد فيها على القوة والاكراه، وهيهات أن يحب المرء الحكومة بالنبوت" میں النبوت کا استعمال خالص مصری ترکیب ہے۔

۷۔ احمد لطفی السید کی تحریروں میں طنز ومزاح کے عناصر بھی ملتے ہیں مگر اس مزاح میں استہزاء تضحیک اور تنقیص کا عنصر شامل نہیں ہے۔ نہ وہ مخاطب کی انا اور اس کی عزت نفس پر ضرب لگاتے ہیں بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں کسی فکر یا نظریہ کو نشانہ بنا کر اس طرح تنقید کرتے ہیں کہ پڑھنے والا بے ساختہ مسکرا اٹھے، مگر فاضل مصنف کا کمال یہ ہے کہ وہ قاری کی اس مسکراہٹ کو قہقہہ میں تبدیل ہونے کا موقع نہیں دیتے۔ اپنے ایک مقالہ "نحن والاستقلال" (آزادی اور ہمارا موقف) میں کہتے ہیں:

"فهل نحن الآن من هذا الاستقلال المطلوب على تقديم في طريقه ؟

ومن أی مرحلة نحن من مراحله ؟ أم نحن نتقدم فی طریق الاستقلال خطوات واسعة ولکن إلی الوراء " (۲۰)

کیا مطلوبہ آزادی کی راہ میں ہم ترقی کی راہ پر گامزن ہیں ؟ اور ہم آزادی کے کسی مرحلہ میں اس وقت کھڑے ہیں ؟ یا راہ حریت میں ہم نے بڑے لمبے لمبے قدم اٹھائے ہیں مگر آگے کی طرف نہیں بلکہ پیچھے کی طرف!

ایک دوسرے مقام پر لارڈ کرومر پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے "الانجلیز فی مصر" (مصر میں انگریزوں کا وجود) اس مقالہ کا اختتام وہ اس طرح کرتے ہیں :

"إن صح قول هیجو أن اللورد عالم بالقراء ة والکتابة بقوة القانون ، لایصح أن یکون اللورد عالما بالشریعة الإسلامیة بقوة القانون أیضاً " (۲۱)

(اگر ہیوگو کی یہ بات صحیح ہے کہ لارڈ قانون کے بل پر پڑھا لکھا ہوتا ہے تو یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی کہ لارڈ قانون کے بل پر شریعت اسلامیہ کا بھی عالم ہو)۔

موجودہ نظام تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک مقالہ تحریر کرتے ہیں جس کا عنوان ہے :

سبیلنا الی الحکم الذاتی (۲۲)

اس میں وہ موجودہ نظام تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

"ولا یغلو الذی یقول إن التعلیم الحاضر.....علی ما هو علیه ..... لا یوصل إلی شئ من سعادة الأمة ۰ واذا کان لا بد من معدات لتلاشی الوحدة القومیة و نقد الاستقلال کان التعلیم الحاضر خیر المعدات لتلك النتائج" ۰

(اگر کوئی یہ بات کہتا ہے تو مبالغہ نہیں کرتا ہے کہ موجودہ تعلیم اپنی موجودہ صورت میں قوم کے لئے خوش حالی کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ اگر قومی وحدت کو پژمردہ بنانے اور روح آزادی کو دبانے والے عناصر ناگزیر ہیں تو بلاشبہ موجودہ تعلیم ان نتائج کے حصول کے لئے سب سے موزوں ہے)

حکومت نے مصری پارلیمنٹ کو سلامی دینے کے لئے ایسے حالات میں توپ چلانے کا حکم دیا جبکہ اس نے کسی باقاعدہ دستور کو نافذ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ فاضل مصنف حکومت کے اس حکم پر اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہتے ہیں :

"ألا يكون الأمر أن الحكومة ، تعبت فى اقناعنا بمحبتها الدستور ، وأنه لا يمنعنا منه إلا عدم أهليتنا له ، فأطلقت المدافع ، لا حبا فى دستور الترك ولكن لتصم آذاننا و أسماعنا بأنها دستورية بالقوة لا بالفعل ، إن كانت هذه فكرتها فنعمت الفكرة ، لأنها تدل على حذق و مهارة لم يظهر إلا نقيضهما يوم الاحتفال بالمحمل الخ" (۲۳)

(کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حکومت ہمارے مطالبہ دستور کو تسلیم کرنے اور اس سلسلہ میں ہمیں مطمئن کرنے کے لئے تھک کر چور ہو چکی ہے اور وہ ہمیں کوئی دستور اس لئے نہیں دے رہی ہے کہ ہمارے اندر اس کی اہلیت نہیں ہے یہ توپ چلائے گئے ہیں اس لئے نہیں کہ ترکی دستور سے ہمیں محبت ہے ، بلکہ ان کا مقصد ہماری سماعت اور ہمارے کانوں کو یہ ہتھوڑا مارنا ہے کہ یہ دستوری حکومت بالفعل نہیں بلکہ بالقوۃ ہے ۔ اگر یہ حکومت کا نقطۂ نظر ہے تو بہت خوب ہے کیوں کہ اس سے اس مہارت اور چالاکی کا پتہ چلتا ہے جس کی عین ضد یوم جشن کو رونما ہوئی ہے ۔)

۸۔ فاضل مصنف کا اسلوب بڑا پاکیزہ دل نشین اور ان کے الفاظ شرافت اور متانت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوتے ہیں یہاں تک کہ حکومت پر یا اہل مغرب پر تنقید کرتے ہوئے بھی قلم کی عفت اور اسلوب کی شرافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اور عربی زبان وادب کے تئیں منصوبہ بند سازش کرنے والے افراد اور ادارے بھی جب ان کی تنقیدوں کا نشانہ بنتے ہیں تو ان کی ذاتی شخصیت زیر بحث نہیں آتی ، نہ ان کی عزت نفس کو کوئی ٹھیس پہنچائی جاتی ہے اور نہ ان کے مقام و مرتبہ اور حیثیت کو چیلنج کیا جاتا ہے ۔ احمد لطفی السید نے الفاظ اور جملوں کے استعمال میں حد درجہ احتیاط اور پاکیزگیٔ نفس کو ملحوظ رکھا ، وہ فکر پر تحقیق کرتے ہیں اور کسی نظریہ اور نقطۂ نظر کا مذاق اڑاتے ہیں ، مگر لب ولہجہ نہایت شریفانہ ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر انہوں نے لارڈ کرومر ، سر ایلڈون گورسٹ وغیرہ کی تحریروں پر پھبتی کسی ہے بطور خاص کرومر کی کتاب "جدید مصر" پر تنقید کرتے ہوئے مغربی افکار و نظریات اور ان کے مفکرین روسو وغیرہ سے استدلال کرتے ہوئے صاف ستھری گفتگو کی ہے اور گالی گلوج ، بدگوئی ، طنز و تعریض ، بھونڈے الفاظ ، غیر معیاری ترکیبوں اور سوقیانہ طرز کلام کو قریب نہیں آنے دیا ہے ۔

۹۔ فاضل مصنف نے جس طرح آزادیٔ فکر اور انفرادی شخصیت کے ارتقاء کی حمایت اور وکالت کی ہے اور

فکر و نظر کی غلامی کو بدترین غلامی قرار دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے مفکرین قلم کاروں اور فلسفیوں سے استفادہ کرتے ہوئے بھی وہ خود اپنی ترجمانی کرتے ہیں۔ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں اور کسی دوسری فکر اور کسی بڑے سے بڑے نظریہ سے مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کے بعض جملے تو آج تک مصری سیاست دانوں اور صحافیوں کی زبانوں پر رائج ہیں مثال کے طور پر ۱۹۳۶ء کے انگریز مصری معاہدہ پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ "بأنها معاهدة قد استنفذت أغراضها"

اس جملہ کا استعمال مصری صحافی اور سیاستداں آج تک مستقل کرتے رہے ہیں۔ یہاں احمد لطفی السید کے بعض وہ جملے نقل کئے جاتے ہیں جو خود ان کے تخلیقی ذہن اور نادر اسلوب کی پیداوار ہیں مثال کے طور پر درج ذیل اقتباسات دیکھئے:

"إن خير الحكومات مالا يكون فيها للحاكم مصلحة فى الحكم مطلقاً و إن خير الحكم و مصلحته كلها راجعة فى جميع أجزائها إلى المحكومين من غير أن يكون للحكام أنفسهم أدنى منفعة" .

(بہترین حکومت وہ ہے جس میں حاکم وقت کا اپنا کوئی مفاد سرے سے کار فرمانہ ہو، حکومت کی بہتری اور اس کی تمام تر مصلحت اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ رعایا ہی سے وابستہ ہے، خود حکمرانوں کا اپنا ذاتی مفاد اس میں کار فرمانہ ہونا چاہئے)

"حكومة كل أمة ليست إلا عرضاً من أعراض هذه الأمة . فلا وجود للحكومة الاستبدادية إلا إذا كانت الأمة تروج للاستبداد . ولا شك أن بقاء الباطل إنما هو فى غفلة الحق عنه" .

(ہر قوم کے اندر جو حکومت وجود میں آتی ہے وہ اسی قوم کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ کوئی مطلق العنان حکومت اسی وقت ظہور میں آتی ہے جب کہ قوم مطلق العنانی کو رواج دے رہی ہو۔ بلا شبہ باطل اسی وقت اپنا وجود منواتا ہے جب حق غافل ہو چکا ہو)۔

"الحكومة الاستبدادية الصريحة العداء للدستور تستمد قوتها دائماً من ضعف الرأى العام ، ومن نتائج مجهوداتها كل يوم لخنق حرية الأفراد ،

وإبعادهم عن العلم بما لهم من الحقوق السياسية . وهى بذلك لا تتفق و الرأى العام إلا فى أمة لا يعرف الفرد فيها لوجوده معنى ، ولا لحياته قيمة ، إلا بالإضافة إلى شخص الحاكم المستبد".

(دستور سازی کی علانیہ مخالفت کرنے والی مطلق العنان حکومت ہمیشہ رائے عامہ کی کمزوری سے، آزادی کا گلا گھونٹنے والے اقدامات کے نتائج سے اور عوام کو سیاسی حقوق کے علم سے دور رکھ کر قوت اور استحکام حاصل کرتی ہے۔ ایسی حکومت رائے عامہ سے ہم آہنگ اسی قوم میں ہو سکتی ہے جس میں فرد اپنے وجود کے مفہوم سے نا آشنا ہو، اسے اپنی زندگی کی قیمت معلوم نہ ہو، اور خود مختار حاکم کی شخصیت سے وابستگی کے بغیر اپنی زندگی بے قیمت معلوم ہو)۔

"عندنا أن كل حق بنى على القوة لا يسمى حقاً مطلقاً ، إذ القوة تنافى الحق ، بل تناهضة و تهدمه . فلا يصح أن يكون الهادم للشئ موجداً له"۔

(میرے نزدیک ہر وہ حق جس کی بنیاد محض قوت ہو سرے سے حق نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ کیوں کہ قوت حق کی نفی کرتی ہے، بلکہ اس کی مخالفت کرتی اور اس کو منہدم کر دیتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی چیز کو منہدم کرنے والی اس کو وجود بھی عطا کرے)۔

"إن الذى يريد بناء البيت بناء متيناً ، و يرى شيئاً من الصعوبة أو الإبطاء فى نقل الاحجار الكثيرة إليه لا يسوغ له فى سبيل سرعة الحصول على اتمامه أن يطحن تلك الأحجار ، فيحيلها إلى رمل يسهل نقله . لأنه بعد ذلك لا يمكنه أن يبنى بناء متينا بتلك الأحجار المطحونة . ومثل هذا البانى كمثل الاحتلال البريطانى الذى يستسهل أمامه عاطفة التحكم فى المصريين فى سبيل إصلاح بلادهم ، و تأهيلهم للحكم الذاتى . لإنه متى أصلح مصر ..... أى أصلح أرضها و حالها الاقتصادى والمالى والحربى ..... والتفت إلى أشخاص يسلمهم هذه المصالح لم يجد أحدا ، إلا غير الأكفاء المدربين الذين تجردوا

بعمله عن الصلاحية للاستقلال" ۰ (۲٤)

(جو شخص مضبوط و مستحکم عمارت بنانا چاہتا ہو، اور اسے پتھروں کے نقل و حمل میں دشواری محسوس ہو رہی ہو یا اس عمل میں تاخیر ہو رہی ہو، اس کے لئے عمارت کو جلد مکمل کرنے کا آسان اور تیز رفتار طریقہ یہ نہیں ہے کہ ان پتھروں کو پیس کر ریت بنادے تاکہ اسے ڈھونے میں آسانی ہو۔ کیوں کہ ان پسے ہوئے پتھروں سے مضبوط عمارت کی تعمیر کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔ عمارت بنانے والے کی یہ مثال برطانوی استعمار کی ہے جو ملک کی اصلاح کے لئے اور اپنے ذاتی اقتدار کے لئے اسے ہموار کرنے کی خاطر مصریوں پر بالادستی اور مطلق العنانی کو مسلط کرنا چاہتا ہے کیوں کہ جب مصر کی اصلاح ہو جائے گی یعنی اس کی مٹی زرخیز ہو جائے گی اور اس کی معاشی، مالی اور عسکری صورت حال کی اصلاح ہو جائے گی اور وہ ایسے افراد کی طرف متوجہ ہوگا جن کو یہ مفادات راس آئیں گے تو اسے وہ تربیت یافتہ باصلاحیت لوگ نہیں مل سکیں گے جو ملک کی آزادی کی صلاحیت کے حامل ہوں)۔

۱۰۔ فاضل مصنف کا اسلوب دانشورانہ اور فلسفیانہ بھی ہے اور ادبی تراوٹ اور نغمگی سے مالا مال بھی یہ دونوں اضداد ان کی تحریروں میں جمع ہیں جب وہ ملک کی قومی تحریک، آزادیٔ رائے، تعقل اور جامعہ مصریہ کے مسائل پر گفتگو کرتے ہیں تو ایک فلسفی کی طرح صاف، واضح اور دوٹوک گفتگو کرتے ہیں اور حقیقت نگاری پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ مگر دوسری طرف ان کا سیاسی نقطۂ نظر نظریۂ افادیت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس پالیسی اور طریقۂ کار کی حمایت کرتے ہیں جس میں قوم کا مفاد کارفرما ہو، اور تیسری طرف مصر کی عوامی زبان اور ترکیبوں کا بھرپور استعمال بھی کرتے ہیں اور جب وہ تنقید کرتے ہوئے مثالوں اور تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں تو ایک انشاء پرداز بن جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے اسلوب میں جامعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی عبارت شیرینی اور نغمگی سے خالی نہیں رہتی، نہ قاری کو خشکی اور خشونت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تحریر کے جمال اور اس کے حسن اور رعنائی و زیبائی سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔ اسلوب کی اس جامعیت نے لطفی السید کو ممتاز اور منفرد بنادیا ہے۔

احمد لطفی السید کے مخصوص مزاج اور منفرد طرز فکر کی عکاسی کرنے والے اسلوب کا زیادہ خوبصورت اظہار ان تحریروں میں ہوتا ہے جن میں وہ معاشرہ یا حکومت کی گرفت کرتے ہیں، مثال کے طور پر ان کا یہ مضمون بڑا دلچسپ ہے۔

الدستور و الوزارة (٢٥)

"الوزارة فى الحكم المطلق بقاؤها موقوف على رضى السلطة عنها ۔ و نجاحها موقوف على رضى الأمة عنها ۔ وإن وزارة فضلت البقاء فى كراسيها على النجاح فى أعمالها ، واكتفت برضى السلطة عن رضى الأمة لا تستحق اسمها ۔ ولكن وزارة وقفت بين رضى القوتين ۔ وعملت لمصلحة الطرفين ۔ حتى اذا رأت أن التوفيق بين رضى الأمة ، وبين رضى السلطة اصبح مستحيلا عليها مالت إلى أصلها ، ونزلت عن دست حكومتها ، وانضمت إلى امتها ۔ تلك هى الوزارة التى من شأنها أن تخفف ويلات الحكم المطلق ، وأن تأتى بالمنافع الممكنة من الحكومة المطلقة التى قل أن تنفع الأمة نفعا يعتد به" ۔

دستور اور حکومت

(کسی مطلق العنان حکومت میں وزارت کی بقا اقتدار کی خوشنودی پر منحصر ہے اور اس کی کامرانی قوم کی رضامندی پر موقوف ہے۔ وہ وزارت جو اپنی سرگرمیوں کے طفیل کامیابی حاصل کرنے پر کرسی سے چمٹے رہنے کو ترجیح دیتی ہے اور قوم کو خوش کرنے کے بجائے اقتدار کی کاسہ لیسی کو کافی سمجھتی ہے اسے وزارت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ وہ وزارت جو اقتدار کے دونوں سرچشموں کے درمیان کام کرتی ہے اور دونوں کے مفاد کو پیش نظر رکھتی ہے اور جب اسے محسوس ہوتا ہے کہ قوم کو اور اقتدار کو ایک ساتھ خوش رکھنا ممکن نہیں ہے تو وہ اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ حکومت کی جی حضوری سے دست بردار ہو جاتی ہے اور اپنی قوم سے وابستگی کو ترجیح دیتی ہے، وہی ایسی وزارت ہے جو ایک مطلق العنان حکومت کے نقصانات کو کم کر سکتی ہے اور مطلق العنان حکومت جس سے قوم کو فائدہ پہنچنے کی امید کم ہوتی ہے، سے ممکنہ فوائد حاصل کر سکتی ہے)۔

اس اقتباس میں احمد لطفی السید کا منطقی اور استدلالی اسلوب بالکل واضح ہے۔ بڑے پیچیدہ سیاسی تصورات کو سادہ الفاظ میں آپ نے بیان کر دیا ہے۔ اس اسلوب میں قوت اور وضاحت بھی ہے، صراحت اور راست بازی بھی، عقل

واستدلال کا استعمال بھی ہے اور آسان الفاظ اور سادہ اور عام فہم ترکیبوں کا استعمال بھی۔

کہا جاتا ہے کہ ادب حسن کلام اور تاثیر کلام کا نام ہے۔ احمد لطفی السید ایک ادیب کی حیثیت سے مصر اور عالم عرب میں اس لئے ہر دل عزیز ٹھہرے کہ آپ نے مؤثر، دل کش اور جاندار اسلوب میں خالص ادب کے مسائل سے بحث کی۔ انشاء پردازی اور تاریخ ادب اور تنقید نگاری کے میدانوں میں بغیر کسی تعصّب اور جانب داری کے اپنے قلم کے جوہر دکھائے اور بطور خاص ان سلگتے مسائل پر قلم اٹھایا جن سے مصری معاشرہ پوری طرح دوچار تھا۔ قومی جنگ آزادی میں ادیبوں، دانشوروں اور عوام کی شرکت، حریّت فکر کی پاسبانی ونگہبانی، تعقل اور تفلسُف اور دانشوری کا تحفظ، استعمار کے خلاف قلمی جہاد ان تمام نازک مسائل میں ان کا قلم مصروف جہاد تھا اور انہوں نے زندگی کی آخری سانس تک باطل کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ اسی لئے آج بھی جدید مصر کی تعمیر میں ان کی خدمات کو احترام و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

حواشی و تعلیقات

(۱) احمد کاشف (۱۲۹۵۔۱۳۶۷ھ / ۱۸۷۸۔۱۹۴۸ء) مصر کے معروف شاعر اصلاً قوقاز سے تعلق رکھتے تھے۔ پیدائش اور وفات مصر میں ہوئی۔ فوٹو گرافی سے بہت دل چسپی تھی پھر موسیقی کی طرف مائل ہوئے اور اس میں اپنے آلام و مصائب سے راحت کا سامان تلاش کرنے لگے۔ ان پر عرب خلافت کے قیام کا الزام لگایا گیا۔ چنانچہ خدیو عباس حلمی سے ان کی شکایت کی گئی مگر انھوں نے خدیو کو راضی کر لیا اور اس طرح افواہوں اور الزامات سے بچ گئے۔ آپ کا شعری مجموعہ دو حصوں میں طبع ہو چکا ہے۔ الزرکلی: الأعلام ۱ / ۱۲۴

(۲) ایلیا ابو ماضی (۱۳۰۶۔۱۳۷۷ھ / ۱۸۸۹۔۱۹۵۷ء) نامور مہجری شاعر اور اس کی اہم تنظیم "الرابطة القلمية" کے رکن رکین تھے، لبنان کے گاؤں المحیدثة میں پیدا ہوئے۔ سکونت اسکندریہ میں اختیار کی۔ شعر و شاعری اور ادب سے والہانہ لگاؤ تھا۔ ۱۹۱۱ء میں امریکہ کا رخت سفر باندھا، اور پانچ سال تک سنسناتی میں رہائش اختیار کی۔ ۱۹۱۶ء میں نیویارک پہنچے وہاں جریدہ "مرآة الغرب" میں کام کیا، پھر ۱۹۲۹ء میں بروکلن سے ہفت روزہ اور اس کے بعد روزنامہ "السمير" جاری کیا۔ آپ کی تصانیف میں "تذكار الماضي"، "ديوان أبي ماضي"، "الجداول"، "الخمائل" (شعری مجموعے) معروف ہیں۔ الزرکلی: الأعلام ۲ / ۳۵

(۳) محمد عبد المطلب ۱۲۸۸۔۱۳۵۰ھ / ۱۸۷۱۔۱۹۳۱ء) مصر کے نامور شاعر قبیلہ جہینہ سے تعلق رکھنے والے ایک ممتاز خطیب باصونہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ جامع الازہر میں تعلیم حاصل کی۔ قومی جنگ آزادی میں اپنی شاعری، مقالہ نگاری اور تقریروں کے ذریعہ حصہ لیا۔ قاہرہ میں وفات ہوئی۔ آپ کا شعری مجموعہ طبع ہو چکا ہے۔ دوسری تصانیف میں تین حصوں میں "تاريخ آداب اللغة العربية"، "كتاب الجولتين في آداب الدولتين الاموية و العباسية"، "اعجاز القرآن"، "وروايتا الزباء"، "وليلى العفيفة" ابھی تک مخطوطات کی شکل میں ہیں۔ الزرکلی: الأعلام ۶ / ۲۴۷

(۴) ابراہیم عبد القادر المازنی (۱۳۰۸۔۱۳۶۸ء / ۱۸۹۰۔۱۹۴۹ء) مصر کے متجدد ادیب اور بڑے انشاء پرداز اور صاحب طرز قلم کار تھے۔ پیدائش اور وفات قاہرہ میں ہوئی۔ مدرسۃ المعلمین سے فراغت حاصل کی اور پیشہ تدریس میں لگ گئے، پھر صحافت میں داخل ہوئے۔ انگریزی سے عربی میں ترجمہ کرنے میں بڑے ماہر تھے۔ شاعری کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی اور مغربی ادب کی نقالی کرتے ہوئے آزاد شاعری کو رواج دیا۔ نثر نگاری کی طرف متوجہ

ہوئے تو عربی اور انگریزی ادب کو کھنگال ڈالا۔ اُمین رافعی کے ساتھ جریدہ "الاخبار" میں اور عبدالقادر حمزہ کے ساتھ "البلاغ" میں کام کیا۔ کچھ دنوں تک مجلّہ "الأسبوع" نکالا۔ مصری ہفت روزے اور ماہنامہ جرائد ان کے مضامین سے بھرے رہتے تھے۔ المجمع العلمی العربی دمشق اور مجمع اللغة العربية قاهره کے رکن تھے۔ آپ کا شعری مجموعہ دو حصوں میں طبع ہو چکا ہے۔ دوسری کتابوں میں "حصاد الهشيم" (مجموعہ مقالات)، "ابراهيم الكاتب" (دو حصوں میں ناول)، "قبض الريح"، "صندوق الدنيا"، "رحلة الحجاز"، "بشار بن برد" شائع ہو چکی ہیں۔ انگریزی ادب سے ترجمہ کردہ "مختارات من القصص الانجليزى" در اصل انگریزی افسانوں کا انتخاب ہے۔ الزرکلی: الأعلام ۱/ ۷۲

(۵) فؤاد الخطیب (۱۲۹۶۔۱۳۷۶ھ / ۱۸۷۹۔۱۹۵۷ء) المجمع العلمی العربی دمشق کے رکن اور شاعر بیروت کے قریب شحیم گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں جامعہ امریکہ بیروت میں تعلیم کی تکمیل کی۔ یافا کا سفر کیا اور وہاں آرتھوڈوکس کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے، اور "قواعد اللغة العربية" کتاب تصنیف کی۔ خرطوم کے گارڈن کالج میں تدریس کی دعوت ملی تو ۱۹۰۹ء میں سوڈان آگئے۔ ۱۹۱۰ء میں اپنے دیوان کا پہلا حصہ شائع کیا۔ ۱۹۱۲ء میں "فتح الاندلس" منظوم ڈرامہ شائع کرایا، ۱۹۱۶ء میں حجاز میں بدامنی پھیلی تو متعدد قصائد کہے۔ مکہ کے اخبار "القبلة" کی ادارت کی پھر ۱۹۱۹ء میں دمشق چلے آئے مگر فرانسیسی تسلط کے بعد دوبارہ مکہ چلے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں حجاز سے ملک حسین کے نکلنے کے بعد مشرقی اردن کا رخ کیا اور وہاں کے امیر عبداللہ بن حسین نے پاشا کا لقب دے کر انہیں اپنے مشیروں میں شامل کر لیا۔ ۱۹۳۹ء کے اواخر تک عمان میں مقیم رہے۔ بعد میں ۱۹۴۵ء میں ریاض میں بھی آپ کا قیام رہا۔ ۱۹۴۷ء میں شیخ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود نے انہیں وزیر بنایا اور اس کے بعد افغانستان میں اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ وہیں ان کی وفات ہوئی۔ تصنیفات میں "نظرات فی تاريخ الجاهلية" ابھی تک مخطوطہ کی شکل میں ہے۔ الزرکلی: الأعلام، جلد ۵ / ۱۶۰

(۶) حسین شفیق المصری (۱۲۹۹۔۱۳۶۷ھ / ۱۸۸۲۔۱۹۴۸ء) جدید مصر کے ایک بڑے شاعر اور ادیب ہیں جنہوں نے نئے اسلوب میں ادب اور سیاست دونوں کے مسائل سے بحث کی۔ مختلف اخبارات و جرائد میں مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ "السيف" اور "الأيام" جرائد بھی نکالے۔ شعر گوئی پر کمال تھا۔ طنز و مزاح آپ کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ چالیس سال تک قلمی جہاد کیا۔ شعری مجموعہ شائع ہو چکا۔ دوسری تصنیفات میں "الحاج درويش و أم اسماعيل" (عوامی ناول) معروف ہے۔ "نجيب الريحانى" گروپ کے لئے مختلف ڈرامے لکھے جیسے

"آنست"، "أفوتك ليه" اور "ريا و سكينة"۔ الزرکلی: الأعلام ۲/۲۳۹

(۷) عبد العزیز البشری (۱۳۰۳۔ ۱۳۶۲ھ / ۱۸۸۶۔ ۱۹۴۳ء) نامور مصری ادیب نے قاہرہ میں پیدائش اور وفات پائی۔ ازہر میں تعلیم حاصل کی۔ شرعی عدالت میں جج بھی رہے۔ عمر کے آخری مرحلہ میں المجمع اللغوی کے منتظم ڈائرکٹر رہے۔ مرنجامرنج، خوش طبع اور شریف النفس انسان تھے۔ نوجوانی میں شاعری کی پھر اسے ترک کر کے نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے اور عربی ادب میں اپنے توسّع، خوش طبعی اور سلامتیٔ فکر کی وجہ سے صاف طرز اسلوب کے حامل قرار پائے۔ اپنی کتاب "فی المرآة" میں ان تمام مقالات کو جمع کر دیا ہے جو انہوں نے اس موضوع کے تحت وقتاً فوقتاً لکھے تھے، دوسری تصنیفات میں "المختار" (دو حصے)، "قطوف" (دو حصے) اور "التربية الوطنية" شائع ہو چکی ہیں۔ الزرکلی: الأعلام ۴/۱۸

(۸) نبوية موسیٰ (۱۳۰۷۔ ۱۳۷۰ھ / ۱۸۹۰۔ ۱۹۵۱ء) مصر کی نامور عالمہ و فاضلہ اور ماہر تعلیم و تربیت سرکاری اسکولوں میں سینئر استاد اور اولین مصری خاتون جو وزارۃ المعارف انسپکٹر کے عہدہ پر پہنچی انہوں نے تعلیم نسواں نصابات کا تنقیدی جائزہ لیا اور وزیر المعارف سے سخت کلامی کی، چنانچہ ملازمت سے الگ کر دی گئیں۔ اب انہوں نے یکسو ہو کر اسکندریہ اور قاہرہ میں تعلیم نسواں کے لئے مدارس بنات الاشراف قائم کئے۔ ۱۹۳۷ء میں ہفت روزہ "الفتاة" نکالا اور نئی نسل کی مربیہ قرار پائیں۔ وفات اور تجہیز و تکفین اسکندریہ میں ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں اپنا شعری مجموعہ مرتب کیا، جس کے مقدمہ میں انہوں نے صراحت کی کہ: "میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو شاعری کرتے اور قصائد کہتے ہیں۔ وہ لوگ تو شعر و شاعری کے لئے یکسو ہوتے ہیں۔ میں بنیادی طور پر ایک معلّمہ ہوں۔ اس پیشہ سے محبت نے مجھے تمام فنون جمیلہ سے دور کر رکھا ہے۔ میں نے جب بھی کوئی شعر کہا اسی تعلیم کے مقصد کو سامنے رکھ کر کسی ضرورت کے تحت ہی کہا ہے، چنانچہ شاید ہی میرا کوئی قصیدہ تعلیم نسواں کے ذکر سے خالی ہو، اگر میں کسی کی تعریف کرتی ہوں تو اسی تعلیم کی وجہ سے، اور اگر کوئی شکوہ کرتی ہوں تو یہی تعلیم پیش نظر رہتی ہے۔" آپ کی ایک تصنیف "المرأة و العمل" شائع ہو چکی ہے جس میں آپ نے مصری خواتین کو ملازمت کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ الزرکلی: الأعلام ۸/۷۔۸

(۹) باحثہ بادیہ (۱۳۰۴۔ ۱۳۳۷ھ / ۱۸۸۶۔ ۱۹۱۸ء) کا اصل نام ملک بنت حفنی ناصف ہے۔ مصر کی معروف قلم کار، شاعر، ادیب اور تحریک نسواں کی علم بردار رہی ہیں۔ پیدائش اور وفات قاہرہ میں ہوئی۔ مصری اسکولوں میں تعلیم حاصل کی اور ۱۳۲۱ھ میں ڈپلوما کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں

مہارت پیدا کی اور تدریس کے پیشہ سے منسلک ہو گئیں، پھر عبدالستار الباسل سے شادی کی۔ "الجریدہ" میں متعدد مقالات شائع ہوئے، جنہیں بعد میں انہوں نے دو حصوں میں "النسائیات" کے نام سے جمع کر دیا۔ پہلا حصہ تو شائع ہو گیا مگر دوسرا حصہ شائع نہ ہو سکا۔ ایک کتاب "حقوق النساء" کی تصنیف کا آغاز کیا تھا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی وفات پا گئیں۔ الزرکلی: الأعلام ۷ / ۲۸۷۔۲۸۸

(۱۰) الجریدۃ، ۱۵/ اپریل ۱۹۱۲ء

(۱۱) الجریدۃ، ۱۱/ اپریل ۱۹۱۴ء

(۱۲) الجریدۃ، ۳/ اکتوبر ۱۹۱۳ء

(۱۳) الجریدۃ، ۶/ جولائی ۱۹۱۴ء

(۱۴) الجریدۃ، ۱۱/ جنوری ۱۹۱۴ء

(۱۵) الجریدۃ، ۲۹/ نومبر ۱۹۱۳ء

(۱۶) محمد بن یزید المبرد (۲۱۰۔۲۸۶ھ / ۸۲۶۔۸۹۹ء) اپنے دور کے بغداد کے عربی زبان و ادب کے امام مانے جاتے ہیں۔ بصرہ میں پیدائش ہوئی اور وفات بغداد میں ہوئی۔ آپ کی مشہور تصانیف میں "الکامل"، "المذکر والمؤنث"، "التعازی والمراثی"، "شرح لامیۃ العرب"، "إعراب القرآن" وغیرہ بہت معروف ہیں۔ الأعلام ۷ / ۱۴۴

(۱۷) الجریدۃ، ۴/ مارچ ۱۹۱۴ء

(۱۸) مکیاولی (Machiavelli) (۱۴۶۹۔۱۵۲۷ء) مشہور اطالوی مصنف، سیاست داں اور علم سیاست کے بنیادی نظریہ کار جن کی تصنیف The Prince نے انہیں بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت عطا کی۔ ان کا تعلق ایک دولت مند اور باعزت گھرانے سے تھا۔ ان کے والد ایک ماہر قانون تھے لیکن خاندان میں سب سے زیادہ غربت اور مفلسی کا شکار تھے۔ ۱۴۹۸ء میں فلورنس جمہوریہ کے اندر ۲۹ سال کی عمر میں سکنڈ چانس لری کے سربراہ مقرر کئے گئے۔ ۱۵۰۰ء میں وہ فرانسیسی دربار میں جمہوریہ کے سفیر بن کر گئے اور ایک طاقت ور حکمراں کے تحت مضبوط حکومت کے قیام پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس کے بعد مکیاولی نے جمہوریہ کے اندر مختلف سیاسی مناصب پر کام کیا۔ بنیادی طور پر وہ ایک وفادار اور محبِ وطن شہری تھے۔ وہ ایک عظیم مصنف، مفکر اور شاعر تھے۔ اطالوی دب میں ان کی شاعری کی قدر و قیمت مسلم ہے، چنانچہ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے، مختصر کہانیاں آج بھی بڑی مقبول ہیں۔ علم سیاست کے میدان میں ان کے

نظریات پر سخت تنقیدیں ہوئی ہیں اور فرانس میں انہیں ابن الوقتی اور مفاد پرستی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ عملی سیاست میں کسی ضابطۂ اخلاق کی پابندی نہ کرنا اور مفادات کی پالیسی اختیار کرنا مکیاویلی کے نظریات کی دین سمجھا جاتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، ج ۷ / ۶۲۷۔۶۲۹

(۱۹) لیو ٹالسٹائی Leo, Tolstoy (۱۸۲۸۔ ۱۹۱۰ء) مشہور روسی مصنف اور عالمی ادب کے بہت بڑے ناول نگار صوبہ تولا کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور وفات ریازان صوبہ کے علاقہ استاپوو میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کازان یونیورسٹی میں ہوئی، مگر تعلیم چھوڑ کر ۱۸۴۷ء میں اپنے گاؤں واپس آگئے۔ ۱۸۵۱ء میں کاکیشیا میں اپنے بھائی نیکولائی کے ساتھ رہے۔ اس کے ایک سال بعد فوج میں بھرتی ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء میں فرانس، سوئیزرلینڈ اور جرمنی کا دورہ کیا۔ واپسی پر کسان کے بچوں کے لئے ایک اسکول کھولا۔ ۱۸۵۵۔۱۸۵۶ء میں ایک کہانی کار کی حیثیت سے معروف ہوگئے۔ ۱۸۶۳ء میں مشہور ناول The Cossacks شائع کی۔ ۱۸۶۵۔۱۸۶۹ء میں ان کی مشہور ناول War and Peace نے روسی ناول نگار کی حیثیت سے انہیں شہرت کے بام عروج پر پہنچایا، ان کی دوسری ناول Anna Karanina ۱۸۷۵۔۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی جس کی کہانی ایک شادی شدہ عورت کے گرد تیار ہوتی ہے جو شوہر سے جدائی کے بعد سخت ذہنی اور نفسیاتی کرب سے دوچار ہوتی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں اپنے نئے ناول A Confession میں زندگی کی حقیقت اور مفہوم کی تلاش میں روحانی بحران کا پتا چلاتے ہیں، اور سماجی اصلاح کے لئے اپنے کو وقف کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں What is Art? ناول میں وہ آرٹ اور فنون لطیفہ سے مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا کام لیتے ہیں، ۱۸۹۹ء میں اپنے ناول Ressurection میں سماجی مسائل کو موضوع بحث بناتے ہیں اور ۱۸۸۸ء کے ناول The Power of Darkness میں بھی وہ سماج کے سلگتے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک رات کو یکایک ٹالسٹائی نے گھر چھوڑ دیا اور چند دنوں کے بعد دور دراز کے ایک ریلوے جنکشن پر ان کی لاش ملی۔ انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا، ج ۱۱ / ۸۳۳

(۲۰) الجریدۃ، ۸ / اپریل ۱۹۰۸ء

(۲۱) الجریدۃ، ۱۴ / اپریل ۱۹۰۸ء

(۲۲) الجریدۃ، ۱۵ / ستمبر ۱۹۰۷ء

(۲۳) احمد لطفی السید: صفحات مطویۃ، ص ۵۰

(۲۴) ان حوالوں کے لئے دیکھئے، عبداللطیف حمزہ، حوالہ بالا، ص ۲۰۷۔۲۰۹

(۲۵) الجریدۃ، ۳ / ستمبر ۱۹۰۸ء

اختتامیہ

مصر اور عالم عرب میں سیاسی، علمی اور تہذیبی بیداری کا آغاز مصر پر نپولین کے حملہ سے ہوتا ہے۔ عرب مسلم تہذیب کا تصادم فرانسیسی تہذیب سے ہوا تو مغربی فکر، سیاست، علمی فتوحات اور تہذیبی ترقیات سے عرب براہ راست آشنا ہوئے اور صدیوں سے سوئے ہوئے عربوں نے انگڑائی لی۔ محمد علی پاشا کا دور حکومت اس اعتبار سے بڑا ممتاز ہے کہ اس نے فرانسیسی علوم و فنون اور تہذیب و معاشرہ سے نہ صرف عربوں کو روشناس کرایا بلکہ ان افکار و نظریات اور تصورات اور اداروں کو در آمد بھی کیا۔ عربی زبان میں مغربی علوم و فنون کے تراجم کے انبار لگا دیئے۔ عربوں کی نئی نسل فرانس اور یوروپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے وطن واپس آئی تو روشن خیالی، وسیع المشربی اور تعقل و تفکر کی نئی روایات اس نے قائم کیں، اور مصری علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جو بالآخر قومی تحریک آزادی اور اس کے نتیجہ میں خود مختار حکومت اور معاشرہ کا قیام و استحکام عمل میں آیا۔

جدید مصر اور جدید عالم عرب کی تشکیل و تعمیر میں جن ممتاز ادیبوں، سیاست دانوں، صحافیوں اور قلم کاروں نے بھر پور حصہ لیا ہے ان میں احمد لطفی السید (۱۸۷۲۔ ۱۹۶۳ء) کا نام بڑا ممتاز ہے۔ آپ نے عنفوان شباب ہی میں مصطفیٰ کامل، محمد فرید، سعید الشیمی یاور الخذیو، لبیب محرم وغیرہ کے ساتھ مل کر قومی شعور کو بیدار کرنے کے لئے ایک سیاسی جماعت "الحزب الوطنی" قائم کی۔ مصریوں کے اندر سیاسی شعور بیدار کرنے کے لئے اور انگریزی استعمار اور خدیو حکومت کے سامنے قومی آرزوؤں اور تمناؤں کی بے باک ترجمانی کے لئے ۱۹۰۷ء میں مشہور عالم اخبار الجریدۃ کو جاری کیا اور اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اس اخبار کے منصۂ شہود پر آتے ہی سیاسی حلقوں میں ہل چل مچ گئی، چنانچہ چند ماہ بعد ہی ایک دوسری سیاسی جماعت "حزب الأمة" قائم کی اور احمد لطفی السید اس کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ سیاست کی خار زار وادی میں قدم رکھا اور اس راہ کی تمام مشکلات و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا، مگر عربی علم و ادب کی خدمت اور سرپرستی سے دست کش نہ ہوئے، چنانچہ عربی زبان و ادب کے فروغ کے لئے ۱۹۱۶ء میں عدلی یکن، حسین رشدی، یعقوب صروف، اسماعیل عاصم ایڈوکیٹ، حفنی ناصف، عاصف برکات، شیخ الازہر محمد ابو الفضل الجیزاوی، شیخ عبد الرحمٰن قراعہ، شیخ محمد بخیت، شیخ سکندری اور حلمی عیسیٰ پاشا جیسے ارباب علم و دانش اور اصحاب اہتمام و انتظام کے مشورہ اور تعاون سے ایک اکیڈیمی "مجمع اللغة العربية" کے نام سے قائم کی، اور خود اس کے ڈائرکٹر رہے۔ ۱۹۶۳ء میں احمد لطفی السید قاہرہ میں انتقال کر گئے، مگر مصر اور عالم عرب کے ہر طبقہ اور حلقہ پر اپنے لافانی نقوش

چھوڑ گئے۔ احمد لطفی السید نے اپنی خود نوشت میں جن ارباب علم و فضل کا بڑی عقیدت و محبت سے تذکرہ کیا ہے ان میں حسن عاصم، مصطفیٰ کامل، قاسم امین، فتحی زغلول اور عبدالعزیز فہمی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت بڑی ہمہ جہت، تہہ دار اور رنگارنگ تھی اور مختلف مکاتب فکر سے افادہ واستفادہ کے روابط قائم کر رکھے تھے، اسی لئے ان کی شخصیت میں ہمیں بڑا تنوع نظر آتا ہے۔

احمد لطفی السید کا سب سے بڑا علمی اور ادبی کارنامہ اخبار الجریدہ کی اشاعت ہے۔ ۹ر مارچ ۱۹۰۷ء کو اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو فاضل مدیر نے پوری طرح وضاحت کر دی کہ اس اخبار کا شعار اعتدال توازن اور میانہ روی ہے اور اس کا مقصد قوم کے اندر صحت مند ترقی کے اسباب و عوامل کو فراہم کرنا ہے۔ انہوں نے صراحت کی کہ یہ اخبار حکومت اور قوم کے تئیں ناصح اور خیر خواہ کا کردار ادا کرے گا، فرد اور حکومت دونوں کی سرگرمیوں پر حسن ظن سے کام لیتے ہوئے پوری آزادی سے تنقید کرے گا، مگر افراد کی ذاتی زندگی اور ان کی پرائیوٹ سرگرمیوں کو نشانہ نہیں بنائے گا۔ فاضل مدیر نے اسی شمارہ میں یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ اخبار مصری مفادات کا دفاع کرے گا۔ قوم کی مادی حالت اور اخلاقیات کی نگہبانی بھی کرے گا اور اسے ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کی جدوجہد کرے گا۔ انہوں نے پوری طرح اعلان کیا کہ تشدد اشتعال، جذباتیت اور ہیجان انگیزی سے یہ اخبار کنارہ کش رہے گا، اور متانت، تدریج اور مفاہمانہ اسلوب کو ترجیح دے گا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ فاضل مدیر نے مصر کے ہر مکتب فکر کے قلم کاروں اور صحافیوں کا تعاون حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ الجریدہ میں مستقل لکھنے والے صحافیوں میں یوسف البستانی، نجیب شاہین، عبدالحمید الزھراوی، سید رشید رضا، عبدالقادر حمزہ، محمد السباعی، عبدالحمید حمدی، ابراہیم رمزی، احمد زکی، عبدالرحمٰن شکری، عبدالسلام ذہنی، طہ حسین، مصطفیٰ عبدالرازق، محمد حسین ہیکل، توفیق دیاب، عباس محمود العقاد، حافظ ابراہیم، مصطفیٰ صادق الرافعی، مراد فرج، اسماعیل صبری، عبدالحلیم مصری، نقولا الحداد، رشید مصوبع اور نقولا رزق اللہ وغیرہ کے اسمائے گرامی ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہ وہ نام ہیں جو مصری صحافت، علم وادب اور تحقیق و تدقیق کے میدانوں میں روشن ستاروں کی طرح جگ مگ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ کہنہ مشق ادیب، مفکر اور مصنف ہیں جنہوں نے جدید مصری معاشرہ کی تعمیر کی، اور بعض شخصیات وہ ہیں جنہوں نے آگے چل کر مصری علم وادب اور شاعری کو اپنی خدمات و عطیات سے مالا مال کیا۔

الجریدہ کے صفحات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے صنف مقالہ نگاری کی راہ میں نئی قندیلیں روشن کیں اور اپنی تحریروں کے ذریعہ قومی تحریک آزادی کی زبردست حمایت کی۔ تعلیم و تربیت کے میدان میں اس

اخبار نے نئی نسل کی جو رہنمائی کی اس میں تین بنیادی نکات کو بطور خاص پیش نظر رکھا اور انہیں اپنے لئے مشعل راہ بنایا۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے خیر پسند ہے، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ تعلیم اور تربیت کے ذریعے عقل اور جسم دونوں کی متوازن رہنمائی کی جائے، اور تیسرا نکتہ یہ ہے کہ مختلف افراد کے درمیان اتحاد و یگانگت کو فروغ دینا اور قومی وحدت کی شاہراہ کی تعمیر کرنا اصل مطمح نظر ہے۔ معاشرت کے میدان میں الجریدہ نے سماج میں کارفرما مختلف عوامل اور نظریات سے تعرض کیا اور سماجی عیوب اور نقائص پر بھرپور تنقید کی۔ انتظامیہ، عدلیہ اور قانون سازیہ کی اخلاقیات کا بھی جائزہ لیا اور ان کے لئے انفرادی و اجتماعی قواعد و ضوابط کی تعیین پر بھی زور دیا۔

مصری عورت کے مسائل پر استاد احمد لطفی السید نے الجریدہ کے صفحات میں متعدد مقالے تحریر کئے اور ان کی اخلاقی، نفسیاتی اور روحانی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا۔ مجموعی اعتبار سے وہ عورتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف شمشیر برہنہ نظر آتے ہیں، اور مصر میں تحریک نسواں کے علم برداروں کی حمایت کرتے ہیں۔ فاضل مدیر کی نگاہ میں مشہور مصنف قاسم امین نے مصری عورت کو قید خانہ سے رہائی دلائی ہے اور اس کی خاندانی اور ازدواجی زندگی کی ظلمتوں کا پردہ چاک کیا ہے، مگر احمد لطفی السید کی نگاہ میں قاسم امین کی یہ جدوجہد دراصل دین اسلام کی ترجمانی ہے، دلچسپ بات یہ ہے فاضل مصنف خواتین کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے بڑے متوازن نظر آتے ہیں اور حقوق نسواں کی ترجمانی کرتے ہوئے قرآن کریم کی آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات محل نظر ہے کہ قاسم امین نے ۱۸۹۸ء میں جب تحریر المرأۃ تصنیف کی تو اسلام اور مسلمانوں کے کلاسیکی تصور پر بہت زیادہ تنقید نہیں کی، لیکن جب اس کتاب کی مخالفت میں علمائے ازہر متحرک اور منظم ہو گئے اور پورے ملک میں ان کے خلاف مضامین و مقالات اور کتابیں شائع ہونے لگیں تو انہوں نے اپنی اگلی تصنیف المرأۃ الجدیدۃ میں عورتوں کی آزادی کے حق میں دلائل دینے کے ساتھ قرآن و سنت کے نظریات پر کھلی تنقید بھی کی، اور اسلام کی حدود آزادی کو ناکافی قرار دیتے ہوئے مغربی تصور آزادی کی بڑی ڈھٹائی سے وکالت کی اور قرآن و سنت اور اجماع امت کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا۔ سیاست کے میدان میں الجریدہ کے ذریعہ فاضل مدیر نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف جہاد کیا اور قومی حکومت کی تشکیل کے مطالبہ کی بھرپور حمایت کی اور یہی الجریدہ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

احمد لطفی السید نے مصری قومیت کے حق میں دلائل کے انبار لگائے اور "جامعۃ اسلامیہ" کی جگہ "جامعہ مصریہ" کا تصور دیا۔ دوسرے مصری ادیبوں، شاعروں اور علماء کے برعکس انہوں نے اتحاد اسلامی کے نظریہ پر کھل کر تنقید کی اور اسے استعمار کی ایک چال قرار دیا۔ مصر کے اندر آزادی کی جدوجہد میں عوام کو شریک کرنے

کے لئے انہوں نے الجریدہ کے صفحات پر جو مقالے تحریر کئے ان میں مصریوں کو قومیت اور وطنیت کے تصورات سے سرشار کیا، اور اپنی اس تحریک میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ نہ صرف خلافت عثمانیہ کی بھرپور مخالفت کی بلکہ اسلام کے عالم گیر اصولوں اور قرآن کے تصور "أمة واحدة" کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا۔

یہ صحیح ہے کہ قوم قومیت اور قوم پرستی کے الفاظ ان دنوں عالم عرب کے جدید دانشوروں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے اور تجدد زدہ طبقہ مغرب کی نقالی میں سُر میں سُر ملا رہا تھا؛ مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جن کے ذہنوں میں ان اصطلاحات کا کوئی صحیح تصور موجود رہا ہو بلکہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جو ان جدید مغربی تصورات کے باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو سمجھتے ہوں۔ اسی لئے ان اصطلاحات کے استعمال میں بلکہ قومی اور اجتماعی خیالات اور سرگرمیوں میں سخت غلطیاں رونما ہوئیں۔ ایک گروہ نے مسلمانوں کے لئے (قوم) کا لفظ استعمال کیا مگر اسے پتا نہیں تھا کہ اس جماعت پر (قوم) یا (امت) کے الفاظ کا اطلاق کن معنوں میں ہوتا ہے اور اسلام کی قومیت کس نوعیت کی ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے مسلمانوں کو بھی اسی معنی میں ایک "قوم" سمجھا جیسے جرمن ایک "قوم" ہیں یا فرانسیسی ایک "قوم" ہیں اور اس غلط فہمی نے ان کے اخلاقی اور اجتماعی طرز عمل اور سیاسی پالیسی کو اسلامی نقطۂ نظر سے غلط اور تباہ کن بنا دیا۔ دوسرے گروہ نے قومیت اور قوم پرستی کے بارے میں اسلام کے اصولوں کو بالکل ہی بھلا دیا۔ اس نے غیر مسلموں کی طرح مسلم قوم پرستی یا عرب قوم پرستی جیسے نعرے دیئے اور قرآن کے بالکل خلاف اس نظریہ کو قبول کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے میں ذرا بھی جھجھک محسوس نہ کی۔

احمد لطفی السید اگر "جامعہ مصریہ" کے نظریہ کے ذریعہ مصری باشندوں میں آزادی کی تڑپ، خودداری کا شعور، دفاع کا جذبہ اور غیر ملکی استعمار سے نفرت پیدا کرنا چاہتے تھے تو اس نظریہ کے مفید اور مؤثر ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، چنانچہ انہوں نے اپنی بعض تحریروں میں مصریوں کے اندر حق خودارادیت کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے پر ابھارا ہے اور جنگ آزادی کے میدان میں فرانس، ترکی، انگلینڈ اور دوسرے ممالک پر انحصار نہ کر کے اپنی قوت بازو سے کام لینے کا درس دیا ہے۔ یہ نہ صرف مثبت پہلو ہے بلکہ قابل ستائش بھی ہے اور وقت کی پکار بھی۔ مگر تعجب ہے کہ فاضل مصنف اس سے آگے بڑھ کر اتحاد اسلامی کے نقیبوں پر یلغار کرتے ہیں، ان کے دلائل کا محاسبہ کرتے ہیں اور عقلی اور تاریخی اعتبار سے اس نظریہ کو پس ماندگی اور تاریک خیالی کا نظریہ قرار دیتے ہیں۔ یہاں فاضل مصنف عقل و تاریخ اور خود شریعت کی میزان پر کھرے اترتے نظر نہیں آتے۔

قرآن پاک نے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو کلمۂ جامعہ قرار دیا ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جو مختلف طبیعتوں،

مختلف مزاجوں، مختلف خیالات ور جحانات رکھنے والے افراد کو بنیان مرصوص" بناتا ہے۔ یہ کلمہ نسل، رنگ، زبان، جغرافیہ ہر چیز سے اوپر اٹھا کر دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ یہ کلمہ تمام انسانوں کو مسجد تک بھی لے جاتا ہے اور میدان جنگ میں محمود وایاز بنا کر بھی کھڑا کرتا ہے۔ قرآن نے ایمان و عقیدہ کے سوا کسی رشتہ اور تعلق کو اہمیت نہیں دی ہے، اس کے مطابق یہ کلمہ کاغذ کا کوئی ٹکڑا نہیں ہے کہ ہوا کا ایک جھونکا اس کو اڑا لے جائے، یہ پہاڑ کی طرح بھاری بھر کم قول ہے کہ پانی کا سیلاب اور آندھی وطوفان اسے اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتے :

"أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِيْ السَّمَاءِ ۰ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۰ وَ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَالَهَا مِنْ قَرَارٍ" ۰(۱)

(کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمہ طیبہ کو کس چیز سے مثال دی ہے ؟اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں، ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لئے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں۔)

اور کلمہ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اس کے لئے کوئی استحکام نہیں ہے۔)

قرآن کریم انسانوں کے درمیان کسی مادی، حسی اور جغرافیائی فرق کو تسلیم نہیں کرتا وہ دنیا کے سارے انسانوں کو ایک ہی اصل قرار دیتا ہے :

"خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْرًا وَّ نِسَاءً" ۰ (۲)

(جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دیئے)

"وَ هُوَ الَّذِيْ أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَ مُسْتَوْدَعٌ" (۳)

(اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے

اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ)۔

يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَ أُنْثٰى وَ جَعَلْنَاكُمْ شُعُوْبًا وَ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ ۰ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ" (٤)

(لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، در حقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔)

رسول اللہ ﷺ نے تمام عصبیتوں کے خلاف جہاد کیا اور اپنی ۲۳ سالہ نبوی زندگی میں کفر و شرک کے بعد جس چیز پر سب سے زیادہ تنقید کی وہ یہی جاہلی عصبیت تھی۔ احادیث کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ نے کس طرح خون اور خاک، رنگ اور زبان، پستی اور بلندی، ملک اور قوم کی تفریقوں کو مٹایا اور انسانوں کے درمیان غیر فطری امتیازات کی تمام سنگین دیواروں کو مسمار کیا۔ (۵) رسول اللہ ﷺ کی تعلیم اس سلسلہ میں بالکل واضح تھی۔

"ليس لأحد فضل على احد الا بدين و تقوى الناس كلهم بنو ادم و آدم من تراب " ۰(٦)

(پرہیزگاری اور دینداری کے سوا اور کسی چیز کی بنا پر ایک شخص کو دوسرے شخص پر فضیلت نہیں ہے۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں)

"اسمعوا و اطيعوا و لو استعمل عليكم عبد حبشي كان راسه زبيبة" ۰ (٧)

(سنو اور اطاعت کرو چاہے تمہارے اوپر کوئی حبشی غلام ہی امیر بنادیا جائے جس کا سر کشمش جیسا ہو)

"ايها الناس كلكم من آدم و آدم من تراب ۰ لا فخر للانساب ۰ لا فخر للعربي على العجمي ولا للعجمي على العربي ۰ ان اكرمكم عند الله اتقاكم"(٨)

(اے لوگو! تم سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے تھے۔ نسب کے لئے کوئی فخر نہیں ہے، عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں ہے۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔)

احمد لطفی السید کی تحریروں سے ان کی اسی غلط فہمی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جامعہ اسلامیہ (اتحاد اسلامی) کے تصور کو غالباً کسی ملک کی خود مختاری اور آزادی کے خلاف تصور کرتے تھے۔ ان کی اس غلط فہمی کے پس پردہ ممکن ہے کہ خلافت عثمانیہ کے خلاف مغربی اقوام کی پروپگنڈہ مہم اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ترک خلیفہ کو ظالم و جابر اور آمر و مستبد قرار دینے کی عالمی سازش اور خود عثمانی خلافت کی اندرونی کمزوریاں اور زوال پذیر ترک مسلم معاشرہ رہا ہو، ان تمام اسباب و عوامل کی کار فرمائی کے باوجود فاضل مصنف کی مغربی تصور قومیت کی ہم نوائی اور تبلیغ و تشہیر نا قابل فہم ہے۔

احمد لطفی السید نے حریت فکر پر جو بحثیں کی ہیں وہ جدید عربی ادب کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اُس وقت مصر میں قومی جنگ آزادی عروج پر تھی اور دستور سازی کا مسئلہ ملک کے مستقبل سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کے لئے حد درجہ اہمیت اختیار کر چکا تھا اور دانشوروں اور علماء اور صحافیوں کی ایک جماعت آزادیٔ فکر و نظر کی حمایت میں شمشیر برہنہ تھی مگر احمد لطفی السید نے جتنے مدلل انداز میں اور باوقار متین اور سنجیدہ اسلوب میں اس نازک مسئلہ کی گرہ کشائی کی ہے اس میں وہ منفرد ہیں۔ انہوں نے دراصل مغربی مفکرین جان لاک، مون ٹسکو وغیرہ کے افکار و نظریات سے براہ راست استفادہ کیا تھا اور مغرب میں قانون و حریت کی پاسبانی کرنے والے فلاسفہ اور معلمین کی تحریروں سے آشنا تھے اس لئے اس مسئلہ کے ایک ایک جزو پر آپ نے کھل کر بحث کی، اور مختلف حکومتی نظاموں میں آزادی کے موضوعات، سیاسی پارٹیاں اور اظہار رائے کی آزادی، حقوق عامہ اور قانون سازیہ، نظام تعلیم کی آزادی، عدلیہ کی آزادی، صحافت کی آزادی، تقریر و خطابت کی آزادی، معاشرت کی آزادی اور دنیائے عرب میں افراد و اقوام کے درمیان آزادی کے نفاذ کے عملی و انتظامی مسائل پر سلسلہ وار مقالات کے انبار لگا دیئے اور اس حقیقت کو پوری طرح ثابت کر دیا کہ آزادی ایک بنیادی قدر ہے جس کے بغیر کسی قوم کی زندگی کا تصور کرنا ناممکن ہے۔

آزادی کے مسئلہ پر فاضل مصنف کی تحریروں کا تجزیہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ غالباً انہوں نے قرآن و سنت اور اسلامی مآخذ کا اس پہلو سے مطالعہ نہیں کیا تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے آزادی پر سب سے زیادہ زور دیا اور قرآن دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جس نے زندگی کے تمام معاملات میں یہاں تک کہ قبول مذہب اور تبلیغ دین میں بھی آزادی کی کلیدی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آزادی اور حقوق انسانی کا تصور مغربی دنیا میں دو تین صدیوں سے پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا، دوسرے اگر آج ان حقوق کا ذکر کیا بھی جا رہا ہے تو ان کے پیچھے کوئی سند اور کوئی قوت نافذہ نہیں ہے بلکہ یہ صرف خوشنما خواہشات ہیں اس کے مقابلہ میں اسلام نے آزادی اور انسانی حقوق کا جو منشور قرآن میں دیا اور جس کا

خلاصہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر نشر فرمایا وہ اس سے قدیم تر بھی ہے اور ملت اسلام کے لئے اعتقاد، اخلاق اور مذہب کی حیثیت سے واجب الاتباع بھی۔ پھر ان حقوق کو عملاً قائم کرنے کی بے مثل نظیریں بھی حضور ﷺ اور خلفائے راشدین نے چھوڑی ہیں (۹) قرآن واضح لفظوں میں اعلان کرتا ہے کہ :

"لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ" ۰ (۱۰)

(دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے)

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا تھا :

"ان دماء کم و اموالکم و اعراضکم حرام کحرمة یومکم هذا" (۱۱)

(تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسی حج کے اس دن کی حرمت ہے۔)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کو جو علانیہ اسلامی ریاست کے مخالف تھے اور بزور شمشیر اس کو مٹانے پر تلے ہوئے تھے، یہ پیغام بھیجا تھا :

"کونوا حیث شئتم و بیننا و بینکم ان لا تسفکوا دما و لا تقطعوا سبیلاً و لا تظلموا احداً"۰ (۱۲)

(تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون ریزی اور رہزنی نہ اختیار کرو، اور ظلم سے باز رہو۔)

ایک دوسرے موقع پر حضرت علیؓ نے ان کو پیغام دیا کہ :

"لا نبدؤکم بقتال مالم تحدثوا فساداً"۰ (۱۳)

(جب تک تم فساد نہ کروگے ہم تمہارے خلاف لڑائی کی ابتداء نہ کریں گے۔)

پھر ایک حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ :

"السلطان ولی من لا ولی له" (۱٤)

(حکومت ہر اس شخص کی ولی (دست گیر و مددگار) ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔)

اور ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ :

"من ترك كلاًّ فإلينا" ۰ (۱۵)

(جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً قرض یا بے سہارا کنبہ) چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمے ہے۔)

اس معاملے میں اسلام نے ذمی شہریوں اور مسلم شہریوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ وہ مسلمان کی طرح ذمی کو بھی اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ اسٹیٹ اس کو بھوکا، ننگا اور بے ٹھکانا نہ رہنے دے گا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ایک ذمی کو بھیک مانگتے دیکھا تو آپ نے فوراً اس کا جزیہ معاف کر کے اس کا وظیفہ مقرر کیا اور اپنے افسر خزانہ کو لکھا:

"واللّٰہ ما انصفناہ ان اکلنا شبیبتہ ثم نخذلہ عند الھرم" ۔ (۱۶)

(خدا کی قسم ہم نے اس سے انصاف نہ کیا اگر جوانی میں اس سے فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔)

حضرت خالدؓ نے حیرہ کے غیر مسلموں کو جو وثیقہ لکھ کر دیا تھا اس میں یہ صراحت تھی کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا یا جو کسی آفت کا شکار ہو گا یا جو مفلس ہو جائے گا اس سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبہ کی کفالت کی جائے گی۔ (۱۷)

احمد لطفی السید نے اپنی تحریروں میں عقلیت کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے الجریدہ کے صفحات میں عقلیت پسندانہ رجحانات کا بھرپور دفاع کیا ہے۔ مصر میں اگر رفاعہ طہطاوی روشن فکری اور روشن خیالی کی تحریک کے حقیقی سورما قرار دیئے جاسکتے ہیں، احمد عرابی نے اگر دستور سازی کی تخم ریزی کی ہے، مصطفیٰ کامل اگر قومی تحریک آزادی کے ہراول دستہ کے سالار تصور کئے جاسکتے ہیں تو بلاشبہ مصری قومیت اور تحریک عقلیت کے اولین معمار احمد لطفی السید سمجھے جاسکتے ہیں، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ فاضل دانشور کی تحریروں پر یونانی اور مغربی فکر و فلسفہ کی چھاپ زیادہ نظر آتی ہے۔ انہوں نے خود ارسطو کا اپنے آپ کو خوشہ چین قرار دیا ہے اور دوسری طرف کانٹ، والٹیئر، روسو اور مل وغیرہ مفکرین سے تأثر پذیر اور مرعوبیت کا اعتراف کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور کے بہت سے ادیب، صحافی اور دانشور یونانی اور مغربی ورثہ سے مرعوب تھے، مغرب میں عقلیت کی تحریک زوروں پر تھی۔ فکر و فلسفہ کے میدان میں بھی تجربیت اور مشاہداتی مطالعہ پر زور دیا جارہا تھا یہاں تک کہ مذہب، روحانیت اور مابعد الطبیعی مسائل کو بھی عقل کی میزان پر پرکھنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ مغرب کی یہ فکر اور اس کا یہ فلسفہ عربی تراجم کے ذریعہ اور مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے واسطہ سے عرب ملکوں میں پہنچا اور اس نے زیادہ تر عقلیت کے منفی اثرات نئی

نسلوں پر قائم کئے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں انسان کا وجود تین اجزاء پر مشتمل ہے، جسم، عقل اور روح .....اور اسلام ان تینوں کے وجود کا معترف ہے اور ان کے مطالبات کی تکمیل، اور ان کی پکار پر کھلم کھلا لبیک کہنے کی اجازت دیتا ہے۔

جسم، جو گوشت اور خون کا مجموعہ ہے، اپنے اندر کچھ فطری میلانات رکھتا ہے اور اس میں کبھی نہ سرد پڑنے والی ایک ایسی زبردست انگیخت پنہاں ہے، جو ہمہ وقت، تحفظ ذات اور بقائے نوع، کا مطالبہ کرتی رہتی ہے۔ (تحفظ ذات کا وسیلہ کھانا پینا اور لباس ہے، اور بقائے نوع کا ذریعہ نسل کشی ہے)۔ جسم کا یہ میلان اس قدر شدید ہوتا ہے کہ بسا اوقات اس سے گریز محال ہو جاتا ہے، مثلاً بھوک و پیاس کی شدت۔ طبعی میلان کی اس تندی اور شدت میں یہ حکمت پنہاں ہے کہ کوئی شخص ان میلانات سے غفلت اور بے توجہی برت کر سرمایۂ حیات سے محروم نہ ہو جائے۔

جنسی شعور کے لئے فرائڈ کی طرح انتہاء پسند (Extremist) ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ میلان بھی بجائے خود بہت شدید ہے، اور اگر اس میں شدت نہ ہوتی تو بقائے نوع کا مسئلہ خطرے میں پڑ جاتا۔ پھر چونکہ نسل کشی کے سلسلے میں عورت کی ذمہ داریاں زیادہ بوجھل ہیں، اس لئے عورت کا جنسی میلان بھی شدید تر ہے تاکہ وہ حمل و رضاعت کی مصیبتوں سے گھبرا کر زندگی کے ایک اہم مقصد سے گریز نہ اختیار کر لے۔

پھر جس قدر ان جسمانی ہیجانات کی عدم تکمیل میں الم اور تکلیف ہے، اسی قدر ان کی تکمیل میں لامتناہی لذت بھی پنہاں ہے۔ گویا اس طرح اس امر کی پوری پوری ضمانت دے دی گئی ہے کہ فرد اپنے مقاصد زندگی کے حصول میں لگا رہے اور اسے یہ احساس تک نہ ہو کہ وہ ایک بھاری ذمے داری کو پورا کر رہا ہے۔

عقل انسانی میلانات کی تکمیل کے لئے خوب سے خوب تر طریقے دریافت کرتی رہتی ہے اور فکر و تدبر سے پیش پا افتادہ مسائل کا حل تلاش کرتی رہتی ہے۔

عقل انسانی میں حصول معرفت اور اخذ علم کا ایک دائمی جذبہ رکھ دیا گیا ہے، تاکہ یہ بات یقینی ہو جائے کہ عقل انسانی ہمیشہ زندگی کو بناتی اور سنوارتی رہے گی۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کے تحت زندگی اپنے مقاصد کی تکمیل کرتی ہوئی ترقی کرتی اور آگے بڑھتی رہتی ہے، گویا ارتقاء خود زندگی کا ایک ایسا بنیادی مقصد بن گیا جس کی جانب زندگی ذاتی اور جبلی طور پر پیش قدمی کرتی رہتی ہے اور اس ارتقاء کے لئے عقل انسانی کو مناسب وسائل بھی فراہم کر دیئے گئے ہیں۔

روح کے وجود کو اہل مغرب تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ فی ذاتہ ایک غیر محسوس شئ ہے اور اس کی کارکردگی کھلم کھلا آنکھوں کے سامنے نہیں آتی۔ ہم اس مقام پر اس غیر متناہی مابعد الطبعیاتی (Metaphysical) بحث میں

الجھنا نہیں چاہتے، البتہ یہ ضرور کہیں گے کہ انکار روح کی کوئی مضبوط عملی دلیل موجود نہیں ہے۔

یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب ہم نے بلا اختلاف یہ بات مان لی کہ زندگی کے اصل مقاصد میں یہ امر شامل ہے کہ وہ ہر لحظہ ترقی کرتی رہے اور مسلسل رفعت پذیر رہے تو یہ حقیقت بھی ماننی پڑے گی کہ انسان میں اس رفعت کے حصول کا ایک اہم ترین ذریعہ روح ہے، جو کائنات کی مخفی قوت سے رابطہ قائم کر کے اس سے وہ روشنی حاصل کرتی ہے جو احساسات کی گرفت سے آزاد، اور عقل کے ادراک سے ماوراء ہے۔ اسی آسمانی روشنی کی مدد سے روح رفعت حاصل کرتی ہے اور انسانی زندگی کے مقصد ارتقاء کی تکمیل کرتی ہے۔

غرض نفس انسانی مندرجہ بالا امور جسم، عقل اور روح پر مشتمل ہے اور اسلام انسان کی جسمانی، عقلی اور روحانی ضروریات کی تکمیل کرتا اور ان میں توازن اور اعتدال کو برقرار رکھتا ہے۔ (۱۸)

یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ احمد لطفی السید نے عقلیت پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن کریم کے حوالے نہیں دیئے جبکہ قرآن کریم میں غور و فکر، بحث و نظر، تدبّر و تفکّر، تفقّہ و تذکّر اور عبرت پذیری کی دعوت دینے والی سیکڑوں آیات موجود ہیں۔ قرآن ایک فطری ملکہ کی حیثیت سے عقل کو استعمال کرنے پر اور آثار کائنات کی تحقیق و تفتیش میں اس سے کام لینے پر بڑا زور دیتا ہے:

" إنّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰاتِ وَ الأَرْضِ وَ اخْتِلاَفِ اللَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِیْ الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْیَابِهِ الاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَابَّةٍ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیَاحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَاءِ وَ الاَرْضِ لَآیَاتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ " (۱۹)

(اس حقیقت کو پہچاننے کے لئے اگر کوئی علامت یا نشانی درکار ہے تو) جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لئے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے

ہیں، بے شمار نشانیاں ہیں۔)

" وَ فِیُ الاَرُضِ قِطَعٌ مُتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِنُ اَعُنَابٍ وَّ زَرُعٌ وَّ نَخِیُلٌ صِنُوَانٌ وَّ غَیُرُصِنُوَان یُّسُقٰی بِمَاءٍ وَّاحِدٍ وَ نُفَضِّلُ بَعُضَهَا عَلٰی بَعُضٍ فِی الاُکُلِ اِنَّ فِی ذَالِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوُمٍ یَّعُقِلُوُن " (۲۰)

(اور دیکھو، زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں۔ انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، کھجور کے درخت ہیں جن میں سے کچھ اکہرے ہیں اور کچھ دوہرے۔ سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے، مگر مزے میں ہم کسی کو بہتر بنا دیتے ہیں اور کسی کو کمتر۔ ان سب چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔)

" وَ سَخَّرَ لَکُمُ اللَّیُلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمُسَ وَ القَمَرَ وَ النُّجُوُمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمُرِهٖ اِنَّ فِیُ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوُمٍ یَّعُقِلُوُنَ "۰ (۲۱)

(اس نے تمہاری بھلائی کے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں، اور یہ جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں، ان میں بھی ضرور نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سبق حاصل کرنے والے ہیں۔)

قرآن کریم ۱۲۹ آیتوں میں بحث و نظر کا حکم دیتا ہے جیسے :

" اَوَ لَمُ یَنُظُرُوُا فِیُ مَلَکُوُتِ السَّمٰوٰاتِ وَ الاَرُضِ وَ مَاخَلَقَ اللّٰهُ مِنُ شَیُءٍ وَّ اَنُ عَسٰی اَنُ یَّکُوُنَ قَدُ اِقُتَرَبَ اَجَلُهُمُ فَبِاَیِّ حَدِیُثٍ بَعُدَهٗ یُؤُمِنُوُنَ " (۲۲)

(کیا ان لوگوں نے آسمان و زمین کے انتظام پر کبھی غور نہیں کیا اور کسی چیز کو بھی جو خدا نے پیدا کی ہے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا۔ اور کیا یہ بھی انہوں نے نہیں سوچا کہ شاید ان کی مہلت زندگی پوری ہونے کا وقت قریب آلگا ہو؟ پھر آخر پیغمبر کی اس تنبیہہ کے بعد اور کون سی بات ایسی ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں؟)

قرآن بصیرت سے کام لینے کو عقل انسانی کا ایک اہم وظیفہ قرار دیتا ہے۔ تبصّر کی دعوت

۱۴۸ آیتوں میں وارد ہوئی ہے :

"وَ فِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلاَ تُبْصِرُوْنَ"۔ (۲۳)

(اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں، کیا تم کو سوجھتا نہیں ؟)

" اَ وَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَاءَ اِلَی الْاَرْضِ الجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْکُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَ اَنْفُسُهُمْ اَفَلاَ یُبْصِرُوْنَ "۔ (۲٤)

(اور کیا ان لوگوں نے یہ منظر کبھی نہیں دیکھا کہ ہم بے آب و گیاہ زمین کی طرف پانی بہالاتے ہیں اور پھر اسی زمین سے وہ فصل اگاتے ہیں جس سے ان کے جانوروں کو بھی چارہ ملتا ہے اور یہ خود بھی کھاتے ہیں ؟ تو کیا انہیں کچھ نہیں سوجھتا ؟)

یہاں تک کہ خود قرآن پاک کی آیات پر غور و فکر کرنے پر وہ مسلمانوں کو ابھارتا ہے :

" کِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ " (۲۵)

(یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔)

" اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا "۔ (۲٦)

(کیا ان لوگوں نے قرآن پر غور نہیں کیا، یا دلوں پر ان کے قفل چڑھے ہوئے ہیں ؟)

اسی لئے مغربی مصنفین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ تعقل و تفکر پر جتنا زور قرآن کریم نے دیا ہے اتنا کسی الہامی کتاب نے نہیں دیا اور دور جدید کی سائنسی ایجادات و اختراعات قرآن کریم کے نزول کے بعد ہی ممکن ہو سکیں۔ (۲۷)

ادب کے میدان میں الجریدہ اور اس کے قلم کاروں نے جو تخلیقات پیش کی ہیں وہ شاہ کار تصور کی جاتی ہیں۔ فاضل مدیر احمد لطفی السید نے مظاہر فطرت کی رعنائیوں اور بوقلمونیوں پر جو مقالے تحریر کئے ہیں ان کی اہمیت منظر نگاری اور تصویر کشی کے اسلوب میں مسلم ہے، جیسے موسم بہار میں پھولوں کی رعنائی و دلفریبی کے موضوع پر "ربیع الحیاۃ" مقالہ میں کلیوں کی مثال اس نوخیز دوشیزہ سے دی ہے جس کی صحت قابل رشک اور اعضاء و جوارح جوانی کے نشہ سے سرشار ہوں۔ کلیوں کے غلاف تار تار تھے اور وہ بے حجابانہ اٹکھیلیاں کر رہے تھے، مگر یہ پھول بالکل بے حجاب نہ تھے کہ بدن پر ایک ہلکی سی تار بھی نہ ہو، نہ وہ آستین اور دامن کی بندشوں میں مقید تھے۔ اپنے مقالہ "زھر

الربیع" میں زندگی کی حقیقت کو مال وزر جمع کرنے اور عہدہ و منصب کے حصول کی دوڑ میں لگے رہنے سے بہت پرے قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان فطرت کی خوبصورتی اور رعنائی سے لطف اندوز ہو، وہ صاف ستھری تفریحات، قوت حسن وجمال کی نشوونما یہاں تک کہ شجرکاری اور نرسری لگانے کے بالکل نجی عمل میں زندگی اور مسرت کا راز تلاش کرتے ہیں اسی طرح ایک اور مقالہ "الریف المصری" میں مصر کے کسانوں کے مسائل اور دیہاتی زندگی کے معمولات و مشاہدات کو بڑے خوب صورت اور ادبی پیرایہ میں قلم بند کیا ہے۔ ادب، لغت، تنقید اور فن عروض پر فاضل مدیر نے جو بحثیں رقم کی ہیں ان کی اہمیت بھی کسی طرح سے کم نہیں ہے۔ ادب کو وہ تفریح طبع کا ذریعہ نہیں سمجھتے، نہ اسے وقت گزاری کا وسیلہ تصور کرتے ہیں، ان کے نزدیک ادب اور اس کی تاریخ کسی قوم کی تشکیل میں قوی ترین عنصر کا کام کرتی ہے۔ ادب ماضی کو حال سے جوڑتا اور قوم کا تشخص قائم کرتا ہے، وہ کسی قوم کے تاریخی تسلسل کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے، فاضل مدیر کے نزدیک ادب انسان کے رویوں اور اخلاقیات میں نرمی و لطافت پیدا کرتا اور افکار و جذبات کی خوبصورت ترجمانی کے قابل بناتا ہے۔

احمد لطفی السید کا نظریہ شعر بھی بڑا جاندار ہے۔ ان کے خیال میں شعر ایک ترقی پذیر بنیادی فن ہے جو زندگی سے پوری طرح ہم آہنگ اس کا بہترین مصور اور ترجمان ہے۔ بعض نقاد شعر کو مقفع عبارتوں سے تعبیر کرتے ہیں جبکہ دوسرا گروپ لفظ کی نغمہ ریز تصویر کشی کو شاعری قرار دیتا ہے۔ احمد لطفی السید شعر کی بڑی جامع تعریف کرتے ہیں:

> "یہ مسئلہ محض کلام مرسل تک محدود نہیں ہے بلکہ شاعری کا تعلق ماحولیاتی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی سے مربوط ہے، اور انسانوں کی پسند اور ان کی شعر فہمی اور دل چسپی سے کہیں زیادہ شاعری کا مسئلہ عوام کے اس احساس میں مضمر ہے کہ شاعری کا قالب پس ماندہ ہو گیا ہے، اور جذبات کی ترجمانی بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ قالب سے میری مراد طریقۂ شعر و نظم نہیں بلکہ شعر کی تکوین و تشکیل ہے"۔ (۲۸)

فنی تکوین و تشکیل کا مطلب شکلیات، مضمون اور عضوی وحدت اور تکامل کی تخلیق ہے۔ کوئی یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ ساخت اور مضمون کی وحدت کا مسئلہ ناقابل فہم ہے کیوں کہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ ساخت اور مضمون کا تکامل خود فطرت سے ماخوذ و مستفاد ہے۔ فاضل مدیر کے نزدیک شعر چونکہ فطرت کی ترجمانی ہے اس لئے ناگزیر ہے کہ اس کی تخلیق کا عمل ساخت، مضمون اور عضوی ترکیب پر یکساں طور پر حاوی ہو (۲۹)۔ وہ بعض شاعروں کے اس عمل سے بھی متفق نظر نہیں آتے کہ مفہوم کو منتقل کرنے کی راست صورت اور ساخت کی پابندی کی جائے اور نغمگی اور

موسیقیت کے تقاضوں کو فراموش کر دیا جائے کیوں کہ اس سے شاعری کا مقصد پورا نہیں ہوتا، وہ حسن فتح الباب کے نغمہ "وداع إلى همنجواى" کا بھرپور تجزیہ کرتے ہیں، اور قصیدہ کے پہلے حصہ پر گفتگو کرتے ہیں، شاعر کہتا ہے :

"كالنسر مقهورا هوى
لم ينتظر نهاية المطاف
الشيخ مل رحلة البحار
وغاب في مفازة التذكار
و في محطة المدينة
عينا صبية تشير
الى كتاب أزرق الغلاف
عليه أحرف حزينة
همنجواى ...."

فاضل ادیب قصیدہ کے اس حصہ کو حزن و غم کی بہترین تصویر کشی قرار دیتے ہیں جہاں ساختیات اور وجدانیات کا بہترین تکامل موجود ہے۔ فاضل ادیب اس قصیدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

"یہاں غم کی تصویر کشی شاعر نے بڑے پرکشش اسلوب میں کی ہے کیوں کہ "أحرف حزينة" کے الفاظ کسی مصوّر شاعر ہی کے الفاظ ہو سکتے ہیں۔ دیکھئے کتاب کے مضمون سے نکل کر غم کا یہ جذبہ کس طرح حروف میں سرایت کر گیا ہے۔ شاعر نے اس بے جان چیز میں زندگی کی روح دوڑا دی ہے"۔(۳۰)

تنقید نگاری کے میدان میں بھی احمد لطفی السید کا پایہ بہت بلند ہے۔ انہوں نے شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کے افکار و نظریات پر جو ٹھوس تنقیدیں کی ہیں وہ عربی تنقید نگاری کا قیمتی سرمایہ ہیں، مثال کے طور پر استاد فاروق شوشہ نے مجلّہ الآداب میں جدید عربی شاعری اور بعض ممتاز شعراء کے شائع شدہ کلام پر تبصرہ کیا تو احمد لطفی السید نے بڑے محکم استدلال کے ساتھ ان کی تحریروں کو ادبی تنقید کی میزان پر تولا۔ انہیں اس بات پر مسرت ہوئی کہ جدید شاعری پر ان کی تنقید کا آغاز نظریہ سے ہوا، اور نظریاتی طور پر جدید معیاری اشعار کو انہوں نے سراہا اور معیار سے فروتر شاعری پر تنقید کی مگر جب نظریہ سے آگے بڑھ کر وہ تنفیذ کے مرحلہ میں داخل ہوئے تو ارتقائے معکوس کا شکار

ہو گئے۔ اس الٹی تبدیلی کی کوئی وجہ احمد لطفی السید کی سمجھ میں نہ آسکی۔ استاد فاروق شوشہ نے جدید شاعری کے حوالہ سے یہ تنقید کی تھی کہ بنیادی مسئلہ شاعر کے فکری موقف کی فطرت اور اس کی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس موقف کو شعری جامہ پہنانا اور شعری ادراک کے مرحلہ سے اسے پار کرانا اصل کام ہے۔ احمد لطفی السید کے مطابق یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ فکری موقف کو شعر کا جامہ کس طرح پہنایا جائے یہ اصل سوال ہے، مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ وہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"موقف کی شعری ترجمانی کا مفہوم ہمارے خیال میں اس امر کا متقاضی ہے کہ ایک نفسیاتی اور متعین شعوری تجربہ سے اس کا آغاز ہو اور جب یہ تجربہ شعری قالب میں منتقل ہو تو ادراک و شعور سے ہم آہنگ اور اس پر پوری طرح سے حاوی ہو، یہ عمل ایک متعین تشکیل میں جاری ہو جس کی متعین ابعاد اور امتیازی رنگ اور آہنگ کی بازگشت ہو، اس میں باہم پیوست نغمگی ہو، جس سے لحن قریب ہو کر تشکیل کے ہر ہر جزئیہ کے ساتھ مل کر یک رنگ اور ہم آہنگ ہو جائے جب کہ خود اس جزئیہ کو شاعر مس کر رہا ہو، تا آں کہ یہ تمام جزئیات اور الحان مکمل شعری تشکیل میں اس طرح ڈھل جائیں کہ ایک صورت، ایک رنگ، ایک بُعد اور ایک نغمہ ابھر کر سامنے آئے۔ استفادہ کی یہ تمام نوعیتیں اس طرح مرتب ہوں کہ ان کے قریب ہی عقل کی نگہبانی موجود ہو تا کہ اس کی زمام عقل کے ہاتھ میں رہے اور فنی عمل، شعری توازن میں خلل انداز نہ ہو سکے"۔ (۳۱)

احمد لطفی السید کے نزدیک استاد فاروق شوشہ نے جدید شاعری پر جو نظریاتی گفتگو کی ہے وہ تو ٹھیک ہے مگر انہوں نے جب مشہور شاعر حسن فتح الباب کے قصیدہ "شعبان الصیاد" کا تجزیہ کیا تو ان کی تنقیدی میزان نے دیانت سے کام نہ لیا۔ انہوں نے شاعر کے قصیدہ میں نہ کوئی حرارت دیکھی اور نہ اندرونی جذبہ کی کوئی آنچ محسوس کی، جب کہ احمد لطفی السید کے نزدیک شاعر کے فطری موقف کی شعری نمائندگی اس قصیدہ میں بہترین طریقہ سے ہوئی ہے اسی لئے استاد فاروق شوشہ کی تنقید کو وہ درست قرار نہیں دیتے۔ (۳۲)

ادبی خدمات کے میدان میں اسلوب کلام پر اگر غور کیا جائے تو احمد لطفی السید کی تعبیرات بڑی واضح دل نشیں اور اظہار مدعا میں بہت صریح نظر آتی ہیں۔ وہ صحیح عوامی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں اور زندہ عصری اصطلاحات سے اپنی تحریروں کو مزین کرتے ہیں، چونکہ وہ تحریک آزادی کے قافلہ سالاروں میں سے تھے اس لئے عامیہ اور فصحی کی طول طویل بحثوں میں پڑنے کے بجائے انہوں نے زبان و ادب کے ارتقاء کو اور عوامی لب ولہجہ کو گلے لگایا، اور بھرپور خود

اعتمادی اور ادیبانہ جاہ و جلال کے ساتھ عوامی الفاظ و اصطلاحات کو قبول کیا، مگر زبان و ادب کے تقاضوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ عامیہ اور فصحی کی بحث میں ان کا موقف بالکل روشن ہے :

"ہم چاہتے ہیں کہ عوامی زبان کو کتابی استعمال کے مقام تک لے جائیں اور ناگزیر طور پر کتابی زبان سے اتر کر تخاطب اور تعامل کی زبان کی سطح پر آئیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم کتاب اس زبان میں لکھیں گے جو قابل فہم ہو اور ہم گفتگو زمانہ اور وقت کی صحت مند عربی زبان میں کریں گے۔"(۳۳)

احمد لطفی السید نے ہی ۱۹۴۲ء میں لجنة المعجم کے سامنے ایک تجویز پیش کی تھی کہ مجمع اللغة العربية ان فنی اصطلاحات کی جمع و ترتیب کا کام کرے جنہیں مزدور کارخانوں میں، تاجر اپنی دکانوں اور بازاروں میں اور کسان اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے ہیں، اور جب ان اصطلاحات کی ایک معتدبہ تعداد جمع ہو جائے تو انہیں عربی اوزان کے مطابق ڈھال کر معجم میں شامل کر لیا جائے۔(۳۴)

احمد لطفی السید کے نزدیک کوئی عوامی لفظ اگر قاموس میں موجود ہے تو وہ فصیح لفظ ہے اسے عجمی لفظ نہیں کہا، جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ان کا اصول یہ ہے کہ مصنف کوئی تحریر اس لئے لکھتا ہے کہ لوگ اسے سمجھیں یہ تحریر جتنی زیادہ واضح ہوگی اس کے قابل فہم ہونے کی وجہ سے پڑھنے والوں کی تعداد اتنی ہی زیادہ ہوگی اور یہی افضل طریقہ ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر وہ کہتے ہیں کہ :

"کتابی اسالیب میں اعلی درجہ کی عربی فصاحت ان تحریروں میں ہوتی ہے جنہیں ہم روزانہ اخبارات میں رقم کرتے ہیں۔"

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ یہاں تک کہہ جاتے ہیں کہ :

"عربی کے الفاظ محض اس قصور کی وجہ سے ترک کر دیئے جائیں کہ وہ روزانہ قوم کے اخبارات میں دوہرائے جا رہے ہیں۔ یہ قومی ادب بلکہ عام عرف میں ناقابل معافی گناہ ہے"۔

معاملہ اتنا سادہ اور آسان نہیں ہے یہ مسئلہ کچھ الفاظ کو ترک کرنے اور کچھ دوسرے الفاظ کو ترجیح دینے کا نہیں ہے کیوں کہ :

"اگر ہم ان الفاظ سے اہل علم کی نفرت اور وحشت پر قاعدہ سے تحقیق کریں جو عوامی ہونے کے ساتھ فصیح اور غیر سوقیانہ ہیں اور جو نفیس اسلوب شمار کئے جاتے ہیں تو ہمیں ان کی تہہ

میں نظر آئے گا کہ اس نفرت کی وجہ ایک طرح کی غیر شعوری ذخیرہ اندوزی ہے۔ کیوں کہ علم عام طور پر جہالت کو حقیر سمجھتا ہے اور جہالت عام طور پر علم سے خوف زدہ رہتی ہے۔ مگر ہمارے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اہل علم اگر اپنے اعلی اصولوں کی طرف رجوع کریں اور اس غیر شعوری ادراک پر دھیان دیں تو انہیں خود اپنے آپ سے خوف محسوس ہوگا اور انہیں پتہ چلے گا کہ جس قوم نے ان کی پرورش کی ہے اور جس سے یہ خود محبت کرتے ہیں اور اس کے مفاد کے لئے تگ و دو کرتے ہیں وہ قوم ان کے مکمل احترام کی زیادہ حق دار ہے، اور انہیں اس حقیقت کا بھی ادراک ہوگا کہ عربی زبان کو زندہ کرنا مدارس میں اس کی تعلیم پر موقوف ہے نہ ان قدیم کتابوں کو شائع کرنے پر منحصر ہے جن سے محض اثریاتی فائدہ حاصل ہوتا ہے بلکہ زبان زندہ ہوتی ہے عوامی زبان کو ترقی دینے سے اور تحریر و تصنیف میں صحت مند طریقہ سے اس حد تک اسے استعمال کرنے سے جس کی اجازت قرآن کی یہ زبان دے سکے"۔(۳۵)

اس سیاق میں احمد لطفی السید نے جو دلائل دیئے ہیں وہ بھی بڑے اہم ہیں :

"عوام زبان کا راز وراثت میں پاتے ہیں اور اس میں زندہ اور مانوس تبدیلی کرتے رہتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر اسالیب خوبصورت اور حسین ہوتے ہیں۔ عوامی زبان (نہ کہ علم، شعر اور تحریر کی زبان) اس کے باوجود دلوں میں زندہ رہنے والی زبان ہوتی ہے جب کہ خالص فصیح زبان انہی لوگوں میں مؤثر ہوتی ہے جو اس سے آشنا ہوتے ہیں۔ روزانہ فصیح زبان پڑھتے ہیں اور ہر روز اسے بیان کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، اور قوم کے اندر ایسے لوگوں کی تعداد نہایت قلیل ہوتی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے وہ علماء جو صحیح عربی سے واقف نہیں ہیں ان کے لئے ہماری زبان میں تحریر و تصنیف کے وسائل ناپید ہوگئے، اور غیر ملکی زبان سے مختلف علوم کو عربی میں منتقل کرنے کے اسباب انہیں میسر نہ آسکے"۔

اس سے آگے بڑھ کر وہ فن ترجمہ اور مترجم کی ذمہ داری پر گفتگو کرتے ہوئے بڑی تاکید کے ساتھ کہتے ہیں :

"مترجم اور مصنف کے لئے یہ جائز ہے کہ انتہائی ضرورت کے وقت انگریزی نام کو عربی زبان کے قالب میں ڈھال لے، مگر اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ ہر ایسے نئے نام کو بصر و چشم قبول کرلے جو عرف عام میں استعمال ہوتا ہو اور بغیر کسی تبدیلی کے وہ رائج ہو چکا ہو اور متروک ہونے

کے بجائے وہ مشہور ہو چکا ہو۔ اسے چاہئے کہ ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور فوٹوگراف کے لئے کوئی نیا عربی لفظ ایجاد نہ کرے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو بدرجۂ اولی اس پر واجب ہے کہ گلاب کے لئے لفظ "ورد" کا استعمال نہ کرے بلکہ اس کی جگہ "حوجم" کا لفظ استعمال کرے کیوں کہ اصل عربی زبان میں ورد کے لئے لفظ موجود ہے"۔

احمد لطفی السید استہزاء پر اتر آتے ہیں اور ادیبوں کے ایک گروہ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں :

"اللہ جانتا ہے اور عوام بھی اس سے واقف ہیں کہ ٹیلی گراف، ٹیلی فون، فوٹوگراف کے لئے بصرہ اور کوفہ میں کوئی لفظ مستعمل نہ تھا اس لئے ہم نے ان الفاظ کو متروک قرار دیا تاکہ کچھ عجمی الفاظ کو استعمال کر سکیں"۔(۳۶)

فاضل ادیب ان ماہرین لغت اور صحافیوں پر سخت تنقید کرتے ہیں جو ہر جدید لفظ کے لئے کلاسیکی ادبیات اور اسلاف کی تحریروں کو کھنگالتے ہیں اور کسی جدید عجمی لفظ کو یا اس کے جدید مشتق کو استعمال کرنے سے گریز کرتے ہیں مثال کے طور پر :

"عربی زبان میں شعر اور تلوار کے لئے دسیوں اور سینکڑوں الفاظ موجود ہیں جن کی ضرورت ہم مصریوں کو بالکل نہیں ہے سوائے ان الفاظ کے جن کا متقاضی جدید لب ولہجہ ہو۔ علمی بحث و تحقیق کے لئے موضوع کے اعتبار سے نفسیاتی اور وجدانی احساسات و جذبات کے الفاظ کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ ہماری ضرورت سے کہیں زیادہ کم عربی زبان میں ہیں۔ مشینوں کے نام، صنعتی اور تکنیکی مشاغل اور ان کے مختلف کل پرزے ڈکشنریوں میں اور سلف کی کتابوں میں مذکور نہیں ہیں، اس لئے مصنف یا مترجم کی ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھے اگر ان ناموں کے لئے روزمرہ کی زبان میں الفاظ داخل ہو چکے ہیں تو انہیں اختیار کرلے اور ممکن حد تک انہیں عربی وزن میں ڈھال لے، اور اگر ان کے لئے الفاظ موجود نہیں ہیں تو وہ لغات و معاجم میں تلاش کرے اور علمی و سائنسی کتابوں میں انہیں ڈھونڈے، اگر اسے ناکامی ہو تو ان کے لئے الفاظ وضع کرے جس طرح ہوائی جہاز کے کام کو دیکھ کر "الطیارۃ" کا لفظ انہوں نے وضع کیا ہے، اور اگر وہ لفظ کوئی علم ہو اور لاطینی یا یونانی زبانوں سے ماخوذ ہو اور فصیح عربی زبان میں اس کی تعبیر ممکن نہ ہو تو اس لفظ کو اسی طرح استعمال کرنا اور اسے عربیت کے قالب میں ممکن حد تک اس طرح ڈھالنا واجب ہے کہ قارئین اور سامعین

پر اس کی اصل ماہیئت مخفی نہ رہ سکے"۔

وہ آگے بڑھ کر بڑی وضاحت سے اہل علم وادب سے سوال کرتے ہیں :

"کیابات ہے کہ ہم اپنی زبان کو سائنس کی طرح نہ سمجھیں ؟بقدر ضرورت ہر نئی چیز کا اس میں اضافہ نہ کریں، جس طرح مختلف فنون، صنعت اور تجارت کے ساتھ ہم کرتے ہیں کہ دوسری قوموں سے ہمارے تعلقات میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے اسی قدر یہ بھی بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ آخر کیابات ہے کہ سائنس، علوم وفنون اور صنعت و تجارت میں جدید اختراعات کے الفاظ واصطلاحات کا اضافہ ہم عربی زبان میں نہ کریں۔"(۳۷)

وہ بڑے عزم وایقان کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ :

"اپنی زبان کی ترقی کے لئے ہم سب سے بڑی خدمت یہ کر سکتے ہیں کہ ہم مصر میں اسے علم اور سائنس کی زبان بنادیں اور تحریر اور گفتگو کی زبانوں میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔"(۳۸)

احمد لطفی السید ماہر قانون اور ڈرامہ نگار لطفی الخولی کے ڈرامہ "مسرحية القضية" پر جب تنقید کرتے ہیں تو ڈرامہ اور تمثیل کی صنف کے بارے میں ان کے خیالات اور فنی مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ لطفی الخولی نے اس کتاب میں ۱۹۵۲ء سے پہلے کے قاہرہ میں رہائش پذیر متوسط طبقہ کے بعض انسانوں کی زندگی کی کچھ جھلکیاں دکھائی ہیں اور ان کے درمیان قائم تعلقات اور زندگی کے سلسلہ میں ان میں سے ہر ایک کے نقطۂ نظر اور ان کی سوچ اور سرگرمیوں پر اس نقطۂ نظر کے اثرات کی تصویر کشی کی ہے۔ ڈرامہ نگار نے مالک مکان منجد آفندی، ایک ملازم ثابت آفندی اس کی بیوی اور بیٹی نبیلہ جو کامرس کالج میں طالبہ ہے۔ مسعود آفندی جو کسی کمپنی میں ملازم ہے اس کی بیوی، اس کا بیٹا عبدہ جو میڈیکل کالج میں آخری سال کا طالب علم ہے اور نبیلہ سے محبت کرتا ہے، ان تمام کرداروں کی انہوں نے عکاسی کی ہے۔

لطفی الخولی ایک ماہر قانون ادیب تھے جن سے احمد لطفی السید کو بجا طور پر یہ امید تھی کہ انسانی ضروریات اور تقاضوں سے قانون کی ہم آہنگی کے مسئلہ سے تعرض کرتے وقت زیادہ مہارت، دقت نظر اور ادبیانہ بصیرت کا مظاہرہ کریں گے اس ڈرامہ میں ان سے کسی قدر تساہل ہوا ہے۔ انہوں نے ہم آہنگی کی دریافت میں اعلیٰ تر معیار کو باقی نہیں رکھا ہے۔ ایک طرف خود ڈرامہ کی فنی نزاکتوں کو ٹھیس پہنچی ہے اور دوسری طرف قانون کے تئیں عام طور پر تشکیل کا

ماحول بنا ہے جس سے قانون کے نفاذ میں دشواری پیش آسکتی ہے۔(۳۹)

لطفی الخولی کی ادیبانہ مہارت کی وہ تعریف کرتے ہیں کیوں کہ تنقید نگاری میں وہ امانت و دیانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، بلا شبہ لطفی الخولی ڈرامہ نگاری کے میدان میں پیش رفت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ ڈرامہ شہنشاہوں کی قہوہ نوشی سے زیادہ لطف دیتا ہے، اس میں لہجہ کی صداقت اور جذبہ کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بہت سے مناظر بڑے دل کش ہیں مگر ڈرامہ کی ان ادبی اور فنی خصوصیات سے آگے فاضل ادیب کچھ اور بصیرت وبصارت کے متلاشی ہیں :

"ہم نشأۃ ثانیہ کے دور میں ہیں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم قوت و طاقت کے ساتھ اور تمام ہتھیاروں سے مسلح ہو کر میدان میں اتریں۔ ڈرامہ نگاری کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، میں لطفی الخولی کی جرأت اور جدوجہد کو سلام کرتا ہوں، مگر میں ان سے مزید کوہ کنی کا طالب ہوں۔"

احمد لطفی السید تعجب کا اظہار کرتے ہیں کہ ڈرامہ میں ہدایت کاری کا نظریہ کیسے پرانا ہو گیا اور کہاں سے یہ نیا نقطۂ نظر وجود میں آیا؟ ہو سکتا ہے کہ ڈرامہ کی بنیادوں اور ادب میں واقعیت اور حقیقت پسندی کے نظریہ کے درمیان فکری تعامل اور تکامل سے اس غلط فہمی کو راہ ملی ہو، مگر احمد لطفی السید کے نزدیک ڈرامہ کی عضوی تشکیل خود ایک وحدت ہے اور داخلی واقعات وحالات ہی خارج کو رنگ وروپ عطا کرتے ہیں، اور ڈرامہ میں خارجی ہیئت اس کے پورے وجود پر اثر انداز ہوتا ہے، اگر اس حقیقت کو پوری طرح ذہن نشین رکھا گیا ہوتا تو ڈرامہ کی تاثیر کا عالم ہی کچھ اور ہوتا۔(۴۱)

احمد لطفی السید مصر جدید کے ایک مایہ ناز صحافی، قابل افتخار ادیب، واجب التقلید نقاد ہی نہ تھے بلکہ مصر اور عالم اسلام کے ایک مفکر اور فلسفی بھی تھے جنہوں نے عالم عرب اور عالم اسلام کے معاصر مسائل میں بھرپور رہنمائی کی اور مصر کی قومی تحریک آزادی میں قائدانہ کردار بھی ادا کیا۔ آپ کے بعض افکار و نظریات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر جدید نسل پر ان کے گہرے اثرات کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا اسی لئے جدید علماء، ادباء اور قلم کاروں نے انہیں "نئی نسل کا مربی اور فلسفی" قرار دیا ہے۔

حواشی و تعلیقات

(۱) قرآن کریم ، ابراهیم : ٢٤ـ ٢٦

(۲)قرآن کریم ، النساء : ١

(۳)قرآن کریم ، الانعام : ٩٨

(۴)قرآن کریم ، الحجرات : ١٣

(۵)تفصیل کے لئے دیکھئے، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ، مسئلہ قومیت، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی

(٦)مسند احمد ابن حنبلؒ، ۴، ۱۴۵، ۱۵۸

(٧)الصحیح ، البخاری ، کتاب الاحکام ، ٤ ، کتاب الزکاة ، ٤ ، الترمذی ، کتاب الفتن ، ٣٠

(٨)سنن ابن ماجه ، کتاب الزهد ، ٣٧، مسند احمد ابن حنبل ، ١، ٥، ٢٨١، ٢٩٥، سنن الترمذی ، کتاب التفسیر ، ١٧، ١٨ ، کتاب المناقب ، ١

(٩)تفصیل کے لئے دیکھئے، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ، اسلامی ریاست، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء ، ص ۵۴۹ـ۵۷۱

(١٠)قرآن کریم ، البقرة : ٢٥٦

(١١)الصحیح ، البخاری ، کتاب الحدود ، ٩ ، کتاب العلم ٩ ، ٣٧ ، کتاب التوحید ٢٤

(١٢)الشوکانی ، محمد بن علی بن محمد : نیل الاوطار ، القاهرة ، مطبعة مصطفی البابی ، ج ٧ ، ص ١٣٩

(١٣)نفس مصدر، ج ۷، ص ۱۳۳

(١٤)الصحیح ، البخاری ، کتاب النکاح ، ٤٠ ، سنن ابی داؤد ، کتاب النکاح ١٩، الترمذی ، کتاب النکاح ١٤

(١٥)الصحیح ، البخاری ، کتاب النفقات ١٥، الصحیح ، المسلم ، کتاب الفرائض ١٥ـ ١٧ ، الترمذی ، کتاب الفرائض ١

(۱۶)ابو یوسف القاضی :کتاب الخراج ، القاهرة ، المطبعة السلفية ۱۳۵۲ھ ، ص ۷۲

(۱۷)نفس مصدر، ص ۸۵

(۱۸)تفصیل کے لئے دیکھئے، محمد قطب، اسلام اور جدید مادی افکار، اردو مترجم، سجاد احمد کاندھلوی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳۵۔۱۳۷

(۱۹)قرآن کریم ، البقرة : ١٦٤

(۲۰)قرآن کریم ، الرعد : ٤

(۲۱)قرآن کریم ، النحل : ١٢

(۲۲)قرآن کریم ، الاعراف : ١٨٥

(۲۳)قرآن کریم ، الذاریٰت: ٢١

(۲۴)قرآن کریم ، السجدة : ٢٧

(۲۵)قرآن کریم ، صٓ: ٢٩

(۲۶)قرآن کریم ، محمد : ٢٤ ۔

(۲۷)قرآن کریم کے عقلی استدلال کے مفصل مطالعہ کے لئے دیکھئے، فاطمہ اسماعیل محمد اسماعیل، القرآن و النظر العقلی ، دی انٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ، ہرنڈن، یو، ایس، اے، ۱۹۹۳ء

(۲۸)المجلة ، قاهرة ، عدد ٥٦، ستمبر ۱۹۶۱ء، احمد لطفی کا مضمون "حول قضية الشعر" ص ٣٦

(۲۹)نفس مصدر، ص ۳۸

(۳۰)نفس مصدر، ص ۴۰

(۳۱)مجلة الآداب، بیروت ، لبنان ، ۱۹۶۱ء، عدد ۷، ج ۹، ص ۶۲

(۳۲)تفصیل کے لئے دیکھئے، نفس مصدر، ص ۶۲۔۶۳

(۳۳)المنتخبات ، حوالہ بالا، ج ۲، ص ۱۳۴

(۳۴)دکتوره نعمات احمد فؤاد ، احمد لطفی السید و اللغة ، المجلة ، قاهرة ، ۱۹۶۲ء ، عدد ٦٣، ص ١٧ ـ ١٨

(۳۵)المنتخبات ، حوالہ بالا، ج ۲، ص ۱۴۰

(۳۶) نفس مصدر، ج ۲، ص ۱۳۱

(۳۷) نفس مصدر، ج ۲، ص ۱۳۰

(۳۸) نفس مصدر، ج ۲، ص ۱۳۳، تفصیل کے لئے دیکھئے دکتورہ نعمات احمد فؤاد، حوالہ بالا، ص ۱۷۔۲۱

(۳۹) احمد لطفی، القضية بين الدراما والقانون ، المجلة ، عدد ٦٦، ج ٦، ۱۹۶۲ء، ص ۱۲۲

(۴۰) نفس مصدر، ص ۱۲۳

(۴۱) تفصیل کے لئے دیکھئے، نفس مصدر، ص ۱۱۹۔۱۲۳

کتب

(۱)ابن حنبل، احمد بن محمد، المسند ، القاهرة ، ۱۹۴۹ء

(۲)ابن ماجہ، الحافظ ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی، کتاب السنن ، دار احیاء الکتب العربیة ، مصر ، ۱۹۵۳ء

(۳)ابو یوسف، القاضی، کتاب الخراج ، القاهرة ، المطبعة السلفیة ، ۱۳۵۲ھ

(۴)الانصاری، مہدی، محمد، الاتجاهات السیاسیة والاجتماعیة ، فی القصة المصریة الحدیثة ، علی کرہ ، مرکز دراسات آسیا الغربیة، مسلم یونیورسٹی

(۵)البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح ، مصر، ۱۳۴۵ھ

(۶)الترمذی، ابوعیسی محمد بن عیسی ، جامع الترمذی مع شرحه تحفة الاحوذی ، الدهلی ، جید برقی بریس، ۱۳۴۶ھ

(۷)الجندی، انور، المحافظة والتجدید فی النثر العربی المعاصر فی مأة عام ، مطبعة الرسالة ، القاهرة ۱۹۶۱ء

(۸).....، المعارك الادبیة فی مصر منذ ۱۹۱۴ء - ۱۹۳۹ء ، مطبعة الرسالة ، القاهرة

(۹).....، الکتّاب المعاصرون ، اضواء علی حیاتهم ، مطبعة الرسالة ، (صدر الکتاب عام ۱۹۵۵ء)

(۱۰).....، الفکر العربی المعاصر ، مطبعة الرسالة ، القاهرة

(۱۱)حافظ ابراہیم، محمد، دیوان حافظ ، الجزء الاول ، الطبعة الثانیة ، مطبعة دار الکتب ، ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء

(۱۲).....، الجزء الثانی ، الطبعة الاولی ، مطبعة دار الکتب ، ۱۹۳۷ء

(۱۳)حسین، محمد، الاتجاهات الوطنیة فی الادب المعاصر ، مکتبة الآداب ، القاهرة ، ۱۹۵۴ء

(۱۴)حمزہ، عبداللطیف، ادب المقالة الصحفیة فی مصر ، دار الفکر العربی ، الجزء السادس ، الطبعة الثانیة ، ۱۹۶۱ء

(۱۵).....، الصحافة المصریة فی مأة عام ، الادارة العامة للثقافة ، القاهرة

(۱۶).....، مستقبل الصحافة فی مصر ، دار الفکر العربی ، ۱۹۵۷ء

(۱۷).....، الصحافة والادب فی مصر (محاضرات)، معهد الدراسات العربیة العالیة جامعة الدول العربیة ، ۱۹۵۵ء

(۱۸)الخوری المقدسی ، انیس، الاتجاهات الادبیة فی العالم العربی الجدید ، ۱۹۵۲ء

(۱۹)الرافعی بک، عبدالرحمٰن، محمد فرید: رمز الاخلاص والتضحیة (تاریخ مصر القومی من سنة ۱۹۰۸ء الی سنة

۱۹۱۹ء) ، مکتبة النهضة المصرية ، القاهرة ،۱۹۴۸ء

(۲۰).....،تاريخ مصر القومی من سنة ۱۹۱٤ء الی سنة ۱۹۲۱ء، مکتبة النهضة المصرية ، القاهرة ۱۹۵۵ء

(۲۱).....،تاريخ الحركة القومية وتطور نظام الحكم فی مصر ، مطبعة النهضة المصرية ، القاهرة ، الطبعة الثانية ۱۹۵۵ء

(۲۲).....،تاريخ الحركة القومية ، مكتبة السعادة بمصر ، ۱۹۵۱ء

(۲۳).....،فی اعقاب الثورة المصرية ، مطبعة السعادة بمصر ،۱۹۱۵ء

(۲۴).....،عصر محمد اسماعيل ، مطبعة النهضة المصرية ،۱۹۳۲ء

(۲۵).....،مصر والسودان فی اوائل عهد الاحتلال ، مطبعة النهضة المصرية ، ۱۹۴۸ء

(۲۶).....،عصر محمد علی،مطبعة النهضة المصرية ، ۱۹۵۱ء

(۲۷)رزاقی،شاہد حسین،سید جمال الدین افغانی حیات وافکار،اسلامک بک فاؤنڈیشن،نئی دہلی،۱۹۸۹ء

(۲۸)رفعت بک محمد،تاريخ مصر السياسی فی الأزمنة الحديثة ، المطبعة الرحمانية بمصر ، ۱۹۳۷ء

(۲۹)زیدان،جرجی،(الدکتور)،تراجم مشاهير الشرق فی القرن التاسع عشر ، مطبعة الهلال بمصر ،۱۹۲۲ء

(۳۰).....،تاريخ آداب اللغة العربية ، مطبعة الهلال ،۱۹۳۷ء

(۳۱)سعید،امین محمد،تاريخ مصر السياسی ، القاهرة ، البابی ، ۱۹۵۹ء

(۳۲)سلاء،جرجس(الدکتور)،اثرالاحتلال البريطانی فی التعليم القومی فی مصر ، مكتبة الانجلو المصرية ، ۱۹۶۶ء

(۳۳)الشافعی،شہری عطیہ، تطور الحركة الوطنية المصرية ، الطبعة الاولی ،۱۹۵۷ء

(۳۴)شوقی،احمد،ديوان شوقی ،الجزء الاول ، مطبعة مصر ،۱۹۲۵ء

(۳۵).....،الجزء الثانی ، مطبعة مصر ،۱۹۳۰ء

(۳۶)الشوکانی،محمد بن علی بن محمد،نيل الاوطار ، مطبعة مصطفی البابی ، القاهرة

(۳۷)الشیال،جمال الدین،(الدکتور)، تاريخ الترجمة والحركة الثقافية فی عصر محمد علی ،مطبعة الاعتماد بمصر ،۱۹۵۱ء

(۳۸)صفوت مصطفیٰ،محمد(الدکتور)،الاحتلال الانجلیزی لمصر و موقف الدول الکبری ازاء ہ ، دار الفکر العربی مصر ،۱۹۵۲ء

(۳۹).....،مصر المعاصرة وقیام الجمهوریة المتحدة ، مکتبة النهضة المصریة ، القاهرة ، ۱۹۵۹ء

(۴۰)طوسون،امیرعمر،البعثات العلمیة فی عهد محمد علی و عباس و سعید ، الاسکندریة ،۱۹۳۴ء

(۴۱)طہٰ حسین(الدکتور)، مستقبل الثقافة فی مصر ، مطبعة المعارف بمصر ،۱۹۴۴ء

(۴۲)عبدالکریم،احمدعزت،تاریخ التعلیم فی عصر محمد علی ، مکتبة النهضة المصریة ، ۱۹۳۸ء

(۴۳)عبداللہ،امین مصطفیٰ عفیفی ،تاریخ مصر الاقتصادی والمالی ، مکتبة الانجلو المصریة ،۱۹۵۴ء

(۴۴)عبدالمطلب ،محمد،دیوان عبدالمطلب ، الطبعة الاولی ، مطبعة الاعتماد بمصر

(۴۵)الغایاتی،علی،دیوان الغایاتی (وطنیتی) ، مطبعة عطایا مصر ،۱۳۵۶ھ/ ۱۹۳۸ء

(۴۶)فاطمۃ اسماعیل محمد اسماعیل،القرآن والنظر العقلی ،دی انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ،ہرنڈن،یو.ایس. اے. ۱۹۹۳ء

(۴۷)قطب،محمد،اسلام اور جدید مادی افکار،اردو مترجم،سجاد احمد کاندھلوی،مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی،۱۹۹۰ء

(۴۸)الکاشف،احمد،دیوان الکاشف ، الجزء الاول ، الطبعة الثانیة ، مطبعة الترقی بمصر ،۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء

(۴۹).....،الجزء الثانی ، الطبعة الاولی ، مطبعة الجریدة بمصر ، ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء

(۵۰)کامل،محمود، تحریر وادی النیل ، دار المعارف بمصر ، ۱۹۵۱ء

(۵۱)الکواکبی،عبدالرحمٰن،طبائع الاستبداد و مصارع الاستعباد ، الطبعة الأولی ، مطبعة الدستور العثمانی ، ۱۹۵۷ء

(۵۲)لطفی السید،احمد،المنتخبات (ترتیب ، اسماعیل مظهر) ، مکتبة الانجلو المصریة

(۵۳).....،منتخبات المؤید ، مطبعة المؤید ،۱۸۹۰ء/۱۳۲۴ھ

(۵۴).....،صفحات مطویة من تاریخ الحرکة الاستقلالیة فی مصر ، مصر ،۱۹۴۶ء

(۵۵).....،مشکلة الحریات فی العالم العربی ، دار الروائع ، بیروت ، ۱۹۵۹ء

(۵۶)محرم،احمد،دیوان محرم ، الجزء الاول ، الطبعة الاولی ، مطبعة الجریدة بمصر ، ۱۹۰۸ء

(۵۷).....،الجزء الثانی ، الطبعة الاولی ، مطبعة الفتوح بدمنهور ، ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء

(۵۸)مسلم،ابو الحسین بن الحجاج القشیری ، النیشابوری ، الجامع الصحیح ،دہلی،۱۳۱۹ھ

(۵۹)مصطفیٰ کامل،المسئلة الشرقیة ، مطبعة الآداب بمصر ، الطبعة الاولی ،۱۸۹۸ء

(۶۰)مودودی،سید ابوالاعلیٰ (مولانا)، تفهیم القرآن (۶ حصے)،مکتبہ جماعت اسلامی ہند رامپور،۱۹۵۸۔۱۹۶۳ء

(۶۱).....،اسلامی ریاست،اسلامک پبلیکیشنز لاہور،۱۹۸۷ء

(۶۲).....،ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی،مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی،۱۹۸۲ء

(۶۳).....،مسئلہ قومیت،مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

(۶۴)موسیٰ،سلامہ،الصحافة حرفة ورسالة ، مطبعة التقدم ، القاهرة ،۱۹۶۳ء

(۶۵)ندوی،محسن عثمانی،مصر کی عربی صحافت،مکتبہ جامعہ دہلی،۱۹۸۹ء

(۶۶)الندیم،عبداللہ، سلافة الندیم ، الجزء الاول ، الطبعة الاولی ، المطبعة الجامعة بمصر ،۱۳۱۴ھ/۱۸۹۷ء

(۶۷).....،الجزء الثانی، الطبعة الاولی ، مطبعة هندیة ،۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء

(۶۸)نسیم احمد،دیوان نسیم ، الجزء الاول ، مطبعة الاصلاح ،۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء

(۶۹).....،الجزء الثانی ، مطبعة الهلال ،۱۹۱۰ء

(۷۰)ہیکل،محمد حسین،تراجم مصریة و غربیة ، القاهرة ، ۱۹۲۹ء

اخبارات ورسائل

(۱)الآداب (الدکتور سہیل ادریس)،احمد لطفی،ردعلی نقد (مناقشات)،بیروت،عدد ۷،ج ۹،۱۹۶۱ء

(۲)الجریدة:احمد لطفی السید،مصر،۱۴رمئی ۱۹۰۷ء

(۳).....،۱۵رستمبر ۱۹۰۷ء

(۴).....،یکم فروری ۱۹۰۸ء

(۵).....،۹رفروری ۱۹۰۸ء

(۶).....،۸راپریل ۱۹۰۸ء

(۷).....، ۱۴راپریل ۱۹۰۸ء

(۸).....۲۴؍اپریل ۱۹۰۸ء

(۹).....۲۵؍اپریل ۱۹۰۸ء

(۱۰).....عدد۳۶۲، ۱۷؍مئی ۱۹۰۸ء

(۱۱).....۱۱؍جون ۱۹۰۸ء

(۱۲).....۱۳؍جون ۱۹۰۸ء

(۱۳).....۳؍جولائی ۱۹۰۸ء

(۱۴).....۵؍جولائی ۱۹۰۸ء

(۱۵).....۹؍جولائی ۱۹۰۸ء

(۱۶).....۳۰؍اگست ۱۹۰۸ء

(۱۷).....عدد۴۵۴، ۲؍ستمبر ۱۹۰۸ء

(۱۸).....۳؍ستمبر ۱۹۰۸ء

(۱۹).....۳؍نومبر ۱۹۰۸ء

(۲۰).....۱۲؍نومبر ۱۹۰۸ء

(۲۱).....۲۳؍نومبر ۱۹۰۸ء

(۲۲).....۲۶؍نومبر ۱۹۰۸ء

(۲۳).....۱۸؍جنوری ۱۹۰۹ء

(۲۴).....۲۱؍جنوری ۱۹۰۹ء

(۲۵).....۲۳؍فروری ۱۹۰۹ء

(۲۶).....۳؍مارچ ۱۹۰۹ء

(۲۷).....۱۴؍مارچ ۱۹۰۹ء

(۲۸).....عدد۷۶، ۷؍ستمبر ۱۹۰۹ء

(۲۹).....یکم دسمبر ۱۹۰۹ء

(۳۰).....۲۵؍اکتوبر ۱۹۱۰ء

(۳۱).....،۸/فروری ۱۹۱۱ء

(۳۲).....،۳۰/دسمبر ۱۹۱۱ء

(۳۳).....،۱۴/اپریل ۱۹۱۲ء

(۳۴).....،۱۵/اپریل ۱۹۱۲ء

(۳۵).....عدد ۱۶۱۷،۷/ستمبر ۱۹۱۲ء

(۳۶).....عدد ۱۶۸۷،۲۸/ستمبر ۱۹۱۲ء

(۳۷).....،۹/جنوری ۱۹۱۳ء

(۳۸).....،۱۶/جنوری ۱۹۱۳ء

(۳۹).....،۳/اکتوبر ۱۹۱۳ء

(۴۰).....،۲۹/نومبر ۱۹۱۳ء

(۴۱).....،۲۴/دسمبر ۱۹۱۳ء

(۴۲).....،۱۱/جنوری ۱۹۱۴ء

(۴۳).....،۴/مارچ ۱۹۱۴ء

(۴۴).....،۱۱/اپریل ۱۹۱۴ء

(۴۵).....،۱۵/اپریل ۱۹۱۴ء

(۴۶).....، ۶/جولائی ۱۹۱۴ء

(۴۷).....،۳۰/جولائی ۱۹۱۴ء

(۴۸)روز الیوسف (احسان عبدالقدوس)، مصر، مفید فوزی، کیف تقضی شیخو ختك ، عدد ۱۵۳۳، ج ۲، ۱۹۵۷ء

(۴۹).....،الحقیبة الدبلوماسیة (تیارات)، عدد ۱۵۹۴، ج ۲، ۱۹۵۸ء

(۵۰).....،فتحی غانم، العبقری الذی عرف الحقیقة قبل الاوان ، عدد ۱۶۳۱، ج ۳۴، ۱۹۵۹ء

(۵۱).....،احمد حجازی، کیف اتجهت ثوراتنا ؟ عدد ۱۶۳۷، ج ۳۴، ۱۹۵۹ء

(۵۲).....،این یذهب الناس ؟ عدد ۱۶۴۳، ج ۳۵، ۱۹۵۹ء

(۵۳)المجلة ، سجل الثقافة الرفيعة (الدكتور على الراعى) ، احمد لطفى ، حول قضية الشعر ..... دراسة موجزة و تطبيق ، قاهرة ،عدد۵۶،ج۵،۱۹۶۱ء

(۵۴)المجلة .....(یحیی حقی)احمد لطفی ومحمد البخاری،الایقاع الشعری ،عدد۶۵،ج ۶،۱۹۶۲ء

(۵۵)المجلة .....،احمد لطفی،القضية بين الدراما والقانون ،عدد۶۶،ج۶،۱۹۶۲ء

(۵۶)المجلة .....،الدکتورۃ نعمات احمد فؤاد،احمد لطفى السيد و اللغة ،عدد۶۳،ج۶،۱۹۶۲ء

(۵۷)مجلة المجمع العلمى العربى ،دمشق،مصطفیٰ الشہابی،الاستاذ احمد لطفی السید(۱۸۷۲ـ۱۹۶۳ء)ج۳۸،۱۹۶۳ء

(۵۸)مجلّہ المصور،مصر،۳/جون، ۱۹۵۰ء

(۵۹).....،۲۲/ستمبر ۱۹۵۰ء

(۶۰).....،۲۹/ستمبر ۱۹۵۰ء

(۶۱).....،۱۷/نومبر ۱۹۵۰ء

(۶۲)المعرفة مجلة ثقافية شهرية ، فؤاد الشائب ، دمشق ، (قلم التحرير) احمد لطفی السید،ج۲،عدد ۱ـ۲،۱۹۶۳ء

معاجم

(۱)اردو دائرۂ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب،لاہور،ج ۷،طبع اول، ۱۹۷۱ء

(۲).....،ج۸،طبع اول، ۱۹۷۳ء

(۳).....،ج۱۱،طبع اول، ۱۹۷۵ء

(۴).....،ج۱۳،طبع اول، ۱۹۷۶ء

(۵).....،ج۲۱،طبع اول، ۱۹۷۷ء

(۶)الزرکلی،خیرالدین،الاعلام قاموس تراجم لأشهر الرجال والنساء من العرب والمستعربين والمستشرقين ، دار العلم للملايين ، بيروت ،(جلد ۱ـ۸) الطبعة التاسعة ۱۹۹۰ء

(۷)کحالہ،عمر رضا، معجم المؤلفين تراجم مصنفى الكتب العربية ، الجزء الثانى ، مطبعة الترقى بدمشق ، ۱۹۵۷ء

(۸).....،الجزء الرابع ،.....،۱۹۵۷ء

(۹).....،الجزء الثالث عشر.....،۱۹۶۱ء

(10) The New Encyclopaedia Britannica, Chicago U.S.A. 1994, Vol. 3, Article on Darwin, Charles (Robert)

(11) .....vol. 6, Articles on Immanuel Kant & Victor Hugo

(12) .....vol. 7, Articles on Gustave Le, Bon, John Locke and Machiavelli

(13) .....vol. 8, Articles on John Stuart Mill & Montesquieu.

(14) .....vol. 9, Article on Plato

(15) .....vol. 10, Article on Jean Jacques Rousseau

(16) .....vol. 11, Articles on Spencer, Herbert & Leo, Tolstoy